رجوع الی القرآن

اہمیت اور تقاضے

جلد دوم

مقالات سیمینار

ادارہ علوم القرآن شبلی باغ علی گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقيق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

رجوع الی القرآن - اہمیت اور تقاضے

مقالات سیمینار

(دوم)

زیر نگرانی

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

مرتب

اشہد رفیق ندوی

ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، پوسٹ بکس ۹۹، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲
alquran85@gmail.com, 0571- 2720311

سلسلہ مطبوعات ادارہ علوم القرآن-۱۴

نام کتاب	:	رجوع إلی القرآن-اہمیت اور تقاضے (دوم)
مرتب	:	اشہد رفیق ندوی
اشاعت	:	۲۰۱۴ء
صفحات	:	۳۶۸
تعداد	:	۶۰۰
قیمت	:	۲۷۵/-
ناشر	:	ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ
کمپوزنگ وڈیزائن	:	حارث احسن
طباعت	:	ایچ ایس آفسیٹ، دہلی

Ruju' Ila al Qur'an - Ahmiyyat aur Taqaze Part II
Compiled by Ashhad Rafeeq Nadwi
Idarah Ulum Al-Qur'an
P. O. No. 99, Shibli Bagh
Aligarh U.P. Pin: 202002
alquran85@gmail.com 0571-2720311
Price: 275/-

ISBN: 978-81-927666-2-1

ملنے کے پتے

۱- ادرہ علوم القرآن، پوسٹ بکس نمبر ۹۹، شبلی باغ علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲
۲- البلاغ پبلیکیشنز ۱/۱۰ اعظمی اپارٹمنٹس، N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی 25
۳- البدر بک سینٹر، مہاجنی ٹولہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، یو. پی

محتویات

شرکاء کا تعارف

پروفیسر سید مسعود احمد	سابق ڈین فیکلٹی آف لائف سائنس، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، و مدیر ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ
مولانا خورشید احمد اعظمی	استاد جامعہ عربیہ تعلیم الدین، مئو
مولانا نسیم ظہیر اصلاحی	سینیر استاذ حدیث، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ
ڈاکٹر محمد رفیع فاروقی	شعبۂ اسلامیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد
پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
مولانا نعیم الدین اصلاحی	سینئر استاذ قرآن، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ
مولانا عبد البر اثری فلاحی	ناظم اعلی فیروس ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، ممبئی
مولانا ضمیر الحسن فلاحی	رکن ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ
مولانا زبیر عالم اصلاحی	سابق رفیق ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ
پروفیسر عبد الرحیم قدوائی	پروفیسر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و ڈائریکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی	سینئر استاذ قرآن و حدیث، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ

مولانا کمال اختر قاسمی	رکن ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ
مولانا اشتیاق احمد قاسمی	استاذ قرآن دارالعلوم دیوبند
مولانا جرجیس کریمی	رکن ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ
ڈاکٹر حافظ سعید بن عبداللہ عمری	عمید الکلیہ، جامعہ دارالسلام عمرآباد، تمل ناڈو
ڈاکٹر محی الدین غازی	دار الشریعہ برائے مالیاتی اور قانونی رہنمائی، دبئی، ممبر مجمع فقہاء الشریعہ، امریکہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اشتیاق احمد ظلی

ادارہ علوم القرآن کے چھٹے سالانہ سیمینار میں پیش کئے جانے والے مقالات کا مجموعہ قرآنی علوم کے شائقین کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق نصیب ہو رہی جس کے لئے ہم بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر بجا لاتے ہیں۔ ادارہ علوم القرآن میں سالانہ سیمینار کے انعقاد کا مقصد قرآنی علوم میں دلچسپی کا فروغ، اس میدان میں بحث و تحقیق کے رجحان کی آبیاری اور قرآنی علوم کی توسیع واشاعت ہے۔ قرآن مجید علوم و معارف کا ایک بحر ناپیدا کنار ہے اور ان پر بحث و تحقیق کے زاویے اور موضوعات لامحدود ہیں۔ ان سیمیناروں کے انعقاد کے سلسلہ میں ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ خالص علمی موضوعات کے بجائے ان کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جائے جن کا براہ راست تعلق دور حاضر کے مسائل سے ہے تاکہ انسانیت کے لئے قرآنی رہنمائی کا پہلو ابھر کر سامنے آ سکے۔ یہ ہر دور کی ضرورت رہی ہے لیکن دور حاضر کے مخصوص حالات کے تناظر میں یہ ضرورت غیر معمولی شدت اختیار کر چکی ہے۔ قرآن انسانیت کے لئے خالق کائنات کا آخری پیغام اور قیامت تک کے لئے بنی نوع انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کا عنایت کردہ اور پسندیدہ دستور حیات ہے۔ چنانچہ دنیا اور آخرت دونوں میں انسانیت کی صلاح و فلاح کا مکمل طور پر انحصار اس نسخۂ کیمیا کی ہدایات پر عمل کرنے پر موقوف ہے۔ اسی کتاب عزیز کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر جزیرہ نماء عرب کے صحراء نشینوں نے اقوام عالم کی قیادت کا عظیم مرتبہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور جب کتاب عزیز سے امت مسلمہ کا رشتہ کمزور ہو گیا اور اللہ کی اس

رسی پر اس کی گرفت باقی نہیں رہی تو اس کی ذلت ونکبت کی بھی کوئی انتہا نہیں رہی۔ ذلت و نکبت اور زوال و کسمپرسی کی اس وادی تیہ میں امت کو بھٹکتے ہوئے کئی صدیاں بیت چکی ہیں اور حسرت و نامرادی کی اس شب تاریک میں سحر کے آثار ابھی ناپید ہیں۔ یہ ارشاد نبوی ''ولن یصلح آخر ھذہ الامة الابما صلح بہ اولھا'' کے عین مطابق ہے۔ اسی نکتہ کی وضاحت ایک دوسری حدیث شریف میں اس طرح کی گئی ہے ''ان اللہ یرفع بھذا القرآن اقواما و یضع بہ آخرین''۔ چنانچہ ہماری فوز وفلاح اور عزت و سربلندی نیز ذلت و نکبت کا براہ راست تعلق قرآن مجید سے ہمارے تعلق کی نوعیت اور کیفیت پر ہے۔ چنانچہ رجوع إلی القرآن ہماری بنیادی اور ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر نہ تو ہمیں دنیا میں عزت و سرفرازی نصیب ہو سکتی ہے اور نہ آخرت میں کامیابی۔ اسی احساس کے تحت دو سال پہلے ہم نے اپنے سالانہ سیمینار کا موضوع ''رجوع إلی القرآن - اہمیت اور تقاضے'' رکھا تھا۔ موضوع کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر یہ احساس برابر موجود رہا کہ ایک سیمینار سے موضوع کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ اسی احساس کے تحت اگلے سیمینار کا موضوع بھی یہی رکھا گیا۔ دوسرے سیمینار کے بعد بھی یہ احساس برقرار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے اہم اور وسیع الاطراف موضوع کا احاطہ متعدد سیمیناروں میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس سعی ناتمام سے کسی درجہ میں بھی رجوع إلی القرآن کی ناگزیر ضرورت اور اہمیت کا احساس بیدار ہو جائے تو یہ اس سیمینار کی بڑی کامیابی ہوگی اور اس سے تعلق رکھنے والوں کے لئے باعث سعادت۔ دعا ہے کہ کتاب عزیز کی نسبت سے کی جانے والی یہ حقیر کوشش بارگاہ رب العزت میں شرف قبول حاصل کرے۔ آمین۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم.

عرض مرتب

ادارہ علوم القرآن کے زیر اہتمام پہلا سیمینار جولائی ۲۰۰۵ء میں منعقد ہوا، دو سال کے وقفہ کے بعد جناب منیر احمد خاں صاحب کی تحریک پر اہم قرآنی موضوعات پر تسلسل کے ساتھ سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ الحمد اللہ اب تک ۷ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، ابتدائی ۳ سیمیناروں کے مقالات ادارہ کے ترجمان ششماہی مجلّہ علوم القرآن کی خصوصی اشاعت کے طور پر شائع ہوئے۔ پھر طے پایا کہ مجلّہ کی کیفیت و ماہیت برقرار رکھنا ضروری ہے، اس لئے مجلّہ معمول کے مطابق شائع ہوتا رہے اور مجموعۂ مقالات علیحدہ کتابی صورت میں شائع کئے جائیں، اس طرح مجلّہ اور مجموعہ دونوں الگ الگ طریقے سے شائقین قرآنیات کی خدمت کر سکیں گے۔ چنانچہ اس سلسلے کا یہ چوتھا مجموعہ مقالات ہے۔

یہ مجموعہ ۲۰۱۳ کے سیمینار کے مقالات پر مشتمل ہے، ۲۰۱۲ میں بھی اسی موضوع پر سیمینار منعقد ہوا تھا، شرکاء سیمینار کی خواہش پر اسی موضوع پر دوبارہ سیمینار منعقد ہوا، اس میں خصوصیت کے ساتھ ایسے عناوین پر مقالات مدعو کئے گئے جو سابقہ سیمینار میں تشنہ بحث رہ گئے تھے، اس طرح یہ مجموعہ سابقہ مجموعے کا تتمہ ہے۔ اس طرح دونوں جلدوں کو ملا کر موضوع پر کافی و قیع مواد جمع ہو گیا ہے۔ قرآن کے شیدائیوں کے لئے اس میں قرآن کی طرف بلانے اور قرآن کو دستور زندگی بنانے کے لئے کافی سامان موجود ہے۔

ادارہ علوم القرآن کے سیمیناروں کی روایت ہے کہ تاریخ انعقاد سے کافی پہلے مقالات حاصل کر لئے جاتے ہیں، کمیٹی ان کے مواد اور معیار کا جائزہ لیتی ہے اور حسب ضرورت مقالہ نگار کو نظر ثانی کی زحمت بھی دیتی ہے۔ سیمینار کے وقت مقالات کا مجموعہ شرکاء سیمینار کو دستیاب کرا دیا جاتا ہے تاکہ مقالات پر زیادہ بہتر اور مفید انداز میں بحث و گفتگو کا موقع مل سکے۔ سیمینار کے دوران ہر مقالہ پر بحث کا موقع دیا جاتا ہے اور مقالہ نگاروں سے دوبارہ خواہش کی جاتی ہے کہ بحث و گفتگو کی روشنی میں اپنے مقالات مزید بہتر

اور معیاری بنا کر ادارہ کو عنایت فرمائیں تاکہ انہیں افادہ عام کے لئے کتابیں صورت میں شائع کیا جاسکے۔

یہ کتاب انہی نظر ثانی شدہ مقالات کا مجموعہ ہے۔ جن حضرات نے از خود نظر ثانی کی ضرورت نہیں محسوس کی، ادارہ کے اراکین نے ان مقالات کے تشنہ پہلوؤں کی تکمیل کی سعی کی ہے۔ سیمینار کی تیاری اور انعقاد صبر آزما کام ہے۔ ادارہ کی پوری ٹیم سال بھر اس میں مصروف رہتی ہے۔ سکریٹری ادارہ پروفیسر عبدالعظیم اصلاحی دور رہنے کے باوجود تمام امور پر برابر نظر رکھتے ہیں، نائب صدر ادارہ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی جب بھی کسی مدد کی ضرورت ہوتی ہے ہر دم تیار رہتے ہیں۔ انتظامی امور کی انجام دہی میں جناب نسیم احمد خاں کا بے لوث تعاون سب کے جذبات کو مہمیز کرتا ہے، ادارہ کے اسکالرس چھوٹا بڑا ہر کام نہایت خوش دلی سے انجام دیتے ہیں۔ اس مجموعہ کی ترتیب و تیاری میں بھی سب کا سرگرم تعاون حاصل رہا۔ خصوصاً برادر عزیز ابوسعد اعظمی نے عبارتوں کی تصحیح، حوالہ جات کی تکمیل اور دیگر امور میں بہت معاونت کی ہے۔ اسی طرح عزیزان گرامی حارث احسن و محمد حاذق نے کتاب کی ترتیب و تزئین میں بہت دلچسپی اور انہماک سے کام کیا ہے، اللہ تعالی تمام محسنین و معاونین کو اجر عظیم سے نوازے، سیمینار کے تمام کام سرپرست اعلی و مربی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی نگرانی میں انجام پائے ہیں۔ میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ آنجناب کی نگرانی میں اس مجموعہ کی ترتیب کا شرف حاصل ہوا۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارہ علوم القرآن کی اس پیش کش کو بھی شرف قبولیت عطا فرمائے اور اس کے ذریعہ رجوع الی القرآن کی راہ آسان فرمائے۔ آمین۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

۶ ر ستمبر ۲۰۱۴ — اشہد رفیق ندوی

استقبالیہ کلمات

الحمد الله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله واصحابه اجمعين الى يوم الدين .

صدر عالی وقار، محترم مہمان خصوصی، مہمانان گرامی قدر، خواتین وحضرات!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔

قرآن مجید کی نسبت سے منعقد ہونے والی اس بامقصد و بابرکت محفل میں دل کی گہرائیوں سے آپ کا استقبال ہے، کارکنان ادارہ علوم القرآن اس خوش گوار ملاقات کے لئے سال بھر چشم براہ رہتے ہیں۔ آپ کے قدوم میمنت کے آنے سے علمی بہار آ جاتی ہے اور دو روز تک کلام الٰہی کے ذکر وفکر سے ایمان کو تقویت اور عمل کو مہمیز ملتی ہے۔

حضرات گرامی قدر! آج کے علمی مذاکرے کا موضوع "رجوع الی القرآن۔ اہمیت اور تقاضے" ہے۔ ایک برس پہلے ٹھیک اسی موضوع پر ہم لوگ جمع ہوئے تھے۔ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پڑھے گئے، بحث ومباحثہ ہوا، قرآن کی طرف پلٹنے کی کئی نئی تجاویز وتدابیر سامنے آئیں، مقالہ نگاران وحاضرین نے خوب ذوق وشوق سے حصہ لیا، پھر بھی تشنگی باقی رہی، بار بار احکام الٰہی کے تذکرے نے دل میں جو ہوک پیدا کی، وہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی۔ اختتام محفل پر یہ احساس رہا ہے۔

ہوا جو کچھ بہت اچھا ہوا لیکن یہ خواہش ہے
اگر ان سب سے بھی بڑھ کر اور کچھ ہوتا تو اچھا تھا

طے پایا کہ اگلا سیمینار بھی اسی موضوع پر ہو، مزید تیاری کے ساتھ ہو، چنانچہ اس موضوع کے تشنہ پہلوؤں کی تکمیل کے لئے ایک بار پھر دعوت دی گئی، اس بار خصوصیت کے ساتھ ان عناوین کا احاطہ کیا گیا، جن کا شرکاء سیمینار نے مطالبہ کیا تھا۔ یہ سیمینار گویا سابقہ سیمینار کا تتمہ ہے۔ اس لئے دونوں میں کافی مناسبت پائی جاتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ رب

العزت ہمارے جمع ہونے اور ہماری کاشوں کو قبول فرمائے۔ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ زندگی کے تمام معاملات میں قرآن مجید کی جانب رجوع کریں اوراس سے رہنمائی حاصل کریں۔

حضرات! یہ بات ہمارے لئے خوشی واطمینان کا باعث ہے کہ آج کی اس محفل میں ایسی متعدد اہم شخصیات موجود ہیں جو عالمی سطح پر قرآن مجید کی دعوت اور خدمت کے لئے جانی جاتی ہیں ،مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد عرفان خاں صاحب کو فنافی القرآن ہی کہنا چاہئے ،انہوں نے اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا کتاب اللہ کی خدمت کو بنا رکھا ہے،اس عظیم مشن میں جو تکلیف واذیت برداشت کرنی پڑے وہ اس میں لذت محسوس کرتے ہیں،ان کی کتاب الٰہی سے بے پایاں محبت کا ہی نتیجہ ہے کہ محض اس سیمینار میں شرکت کے لیے پیرانہ سالی اورکئی طرح کے اعذار کے باوجود شکاگو (امریکہ) جیسے دور دراز خطۂ ارضی سے تشریف لائے ہیں، بلاشبہ ان کا حق ہے کہ اس افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش فرمائیں۔مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی بلاشبہ قرآن مجید کے بڑے عالم وخادم ہیں،زندگی اس کی خدمت کے لئے وقف کررکھی ہے،اس کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لئے ہرطرح کی قربانی پیش کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور عزیمت کے کئی نمونے قائم کرچکے ہیں،ان کی تشریف آوری سے سیمینار کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔برادر عزیز ڈاکٹر محی الدین غازی دبئی سے تشریف لائے ہیں۔ان کی مصروفیات اجازت نہیں دے رہی تھیں،لیکن قرآن کی محبت نے انہیں ایک روز کی مہلت نکالنے پر مجبور کیا ،اتنی دور سے محض ایک روز کے لئے تشریف لائے ہیں،ان کی مرنجا مرنج شخصیت سیمینار کے مباحثے میں جان ڈال دیتی ہے۔دارلعلوم دیو بند ،ندوۃ العلماء لکھنؤ،مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج جیسے بڑے مدارس کی نمائندگی بھی ہورہی ہے،ان اداروں کے نہایت سینئر اساتذہ جو عرصہ سے تدریس قرآن کی خدمت پر مامور ہیں،اس سیمینار کی زینت ہیں۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جلو میں ہونے کی وجہ سے یہاں کے اساتذۂ کرام کی ایک بڑی تعداد کی سرپرستی اورسرگرم تعاون بھی ہمیں حاصل ہے۔اس محفل میں وہ خوش قسمت طلبہ بھی شریک ہیں جنھوں نے ادارہ کی جانب سے منعقد کل ہند سطح کے علمی مسابقہ میں حصہ لیا اورانعامات کے مستحق قرار پائے ،میں اپنی طرف سے اورتمام ارکان وخادمان ادارہ کی طرف سے تمام مہمانوں کو

خوش آمدید کہتا ہوں، ہماری پوری کوشش ہوگی کہ یہاں آپ کا قیام آرام دہ و پرسکون رہے، اپنی بساط بھر بہترین سہولیات مہیا کرانے کی کوشش کی گئی ہے، اگر کوئی کمی یا کوتاہی محسوس کریں تو اس کا اشارہ فرمادیں، ان شاء اللہ اس کی تلافی کے لئے کارکنان کو مستعد پائیں گے، اس کے باوجود امکان ہے کہ ضیافت کے انتظامات آپ کی شایان شان نہ ہوں، براہ کرم ہماری اس کم مائیگی کو ذوق مہمان نوازی کے فقدان پر محمول نہ فرمائیں۔ انسانی کاوشوں میں نقص کا باقی رہ جانا عین ممکن ہے، عفو ودرگزر سے کام لیں، ان شاء اللہ حقیقی انعام کی تقسیم کے وقت اس کا بھی اجر ملے گا۔

حاضرین کرام! رجوع الی القرآن یعنی قرآن مجید سے تعلق جوڑنے اور قائم رکھنے کی آواز کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ اللہ تعالی نے جب یہ اعلان فرمایا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ(یونس:۵۷) لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لئے رہنمائی اور رحمت ہے۔

اس پیغام کو جب جنوں کی ایک جماعت نے سنا تو اس کی قدر و قیمت اور نزول کا مقصد سمجھ لیا۔ بھاگی اپنی قوم میں پہونچی اور مخاطب کر کے فرمایا: يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ○ يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ○ وَمَن لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءُ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○ (الاحقاف: ۳۰-۳۲)

اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں سے درگذر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچادے گا۔ اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانیں وہ نہ زمین میں کوئی بل بوتہ رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کردے اور نہ اس کے کوئی حامی اور سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچالیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

صرف جنوں نے ہی قرآن مجید کی قدر و قیمت نہیں سمجھی، بلکہ تاریخ کے صفحات شہادت دیتے ہیں کہ انسانیت کی ایک پوری نسل نے قرآن مجید کا مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پرتپاک خیر مقدم کیا جو بطور فضل و رحمت مالک حقیقی کی طرف سے آیا ہے، تاکہ وہ زندگی کے سفر میں ان کے لیے مددگار ثابت ہو اور دنیا و آخرت کی سعادت سے انہیں ہم کنار کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نزول قرآن کا عظیم مقصد سمجھ لیا تھا اور اسی بنیاد پر اپنا تعلق قائم کیا تھا اور اس سے استفادے کی صحیح ترتیب قائم کی تھی، اپنی عقلوں، دلوں اور اوقات کو انہوں نے اس کے حوالہ کر دیا، پھر قرآن مجید نے ان کی بہترین ضیافت کی۔ اپنے فیض و کرم سے انہیں سرفراز کیا اور انہیں نئے سرے سے ڈھالا، چنانچہ زمین ان کے آگے سرنگوں ہوگئی اور صدیوں تک وہ قیادت کرتے رہے، گزرتے زمانے کے ساتھ مسلمان بتدریج قرآن مجید سے دور ہونے لگے، جو ان کا قائد، ہدایت دینے والا اور تشکیل نو کرنے والا کارخانہ تھا، اسے چھوڑ کر دوسری چیزوں میں منہمک ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی نسل نے جو عظمت و اقتدار حاصل کیا تھا، وہ کمزور اور منتشر ہو گیا اور ہم قوموں کے درمیان بے وزن اور بے وقعت ہو کر رہ گئے۔ ہمارے وجود کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی اور ہماری حالت کمینوں کے دستر خوان پر یتیموں سے بدتر ہوگئی۔ اب ایک بار پھر قرآن مجید کی جانب حقیقی واپسی کی ضرورت ہے۔ کتاب اللہ کی رہنمائی میں زندگیوں کو بنانے اور سنوارنے کی ضرورت ہے۔ ان عناصر پر قابو پانے کی ضرورت ہے جو اللہ کی بنائی ہوئی صراط مستقیم کو چھوڑ کر شیطانی پگڈنڈیوں پر لے جا رہے ہیں کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے واضح لفظوں میں اپنی یہ سنت بیان کر دی ہے کہ: لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللّهِ إِنَّ اللّهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَإِذَا أَرَادَ اللّهُ بِقَوْمٍ سُوءاً فَلاَ مَرَدَّ لَهُ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَالٍ (رعد: ۱۱)

ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔ جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی

ومددگار ہوسکتا ہے۔

حضرات گرامی! ان تصریحات کی روشنی میں ہمیں اپنے احوال، اپنی عادات، اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کو ٹھیک کرنے کے لیے اللہ کی پاک کتاب کی روشنی میں خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس باوقار سیمینار میں ان شاء اللہ اسی مصدر اول کی طرف پلٹنے کی ترغیب ہوگی، ماہرین تدابیر بیان کریں گے کہ کیسے عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کیا جائے، ان اسباب وعوامل پر بھی غور وفکر ہوگا جو رجوع الی القرآن کے لیے رکاوٹ بن رہے ہیں۔

معزز مہمانان گرامی! ابھی عید الاضحیٰ کی مشغولیات باقی ہی تھیں کہ انہیں چھوڑ کر آپ کو یہاں تشریف لانے کی زحمت برداشت کرنی پڑی جو بلا شبہ اللہ کی کتاب سے محبت اور ادارہ سے تعلق خاطر کا مظہر ہے۔ آپ کی تشریف آوری پر ایک بار پھر صمیم قلب سے آپ کا استقبال کرتے ہیں اور جس عظیم مقصد کے لیے آپ تشریف لائے ہیں، اس کے شایان شان انتظام کرنا بشری کمزوریوں کے ساتھ ممکن نہیں، اس کا شایان شان اجر تو کتاب نازل کرنے والا ہی دے سکتا ہے۔ تاہم بساط بھر آپ کے آرام وسکون کے لیے پوری کوشش کی گئی ہے، دعا ہے کہ آپ کی آمد اور آپ کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔ آپ کی محنت وکاوش کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ رجوع الی القرآن کی راہیں ہموار کردے اور دنیا ایک بار پھر اپنے رب کی مرضی ہو جائے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم.

۲۰/اکتوبر۲۰۱۳

اشہد رفیق ندوی
کنوینر سیمینار

بسم الله الرحمن الرحيم

قرآنی تعلیمات کے چالیس امتیازی نکات

سید مسعود احمد

دنیا کی ہر کتاب قاری کے ذہن پر کچھ اثرات مرتب کرتی ہے۔ بیشتر کتابیں صرف وقتی طور پر فرحت وانبساط فراہم کرتی ہیں کیوں کہ ان کو پڑھنے والا وقت گزاری کے لیے ہی پڑھتا ہے۔ جب کہ بعض کتابیں نصابی، موضوعاتی اور تکنیکی نوعیت کی ہوتی ہیں اور وہ قاری کی دلچسپی کے بقدر ذہن وحافظہ میں محفوظ ہوتی ہیں۔ البتہ بعض کتابیں انسانی ذہن ودماغ پر پائدار نقش قائم کر دیتی ہیں جس کا تعلق قاری کی دلچسپی کے ساتھ، کتاب کی حسن پیشکش اور اس کی دل لگتی تعلیمات سے بھی ہوتا ہے۔ قرآن کریم ایسی ہی کتاب ہے بلکہ اس معاملہ میں واحد و یکتا کتاب ہے جس کی تعلیمات انسانی قلب وذہن کے دریچے کھول کر ان پر ایک نہ مٹنے والا نقش مرتسم کر دیتی ہیں جب کہ قرآن کریم کا معجزانہ اسلوب، اس کی زبان اور اس کی سادگی اور طرز تعلیم اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

ہمارے پیش نظر اس مضمون میں صرف قرآنی تعلیمات کے اہم نکات پیش کرنا ہے اور اس میں بھی صرف چالیس پر بس کر دینا ہے۔ ان تعلیمات میں بذات خود جو حسن و جمال اور سادگی ہے جو عملیت ویگانگت ہے اور جو کمال واثر انگیزی ہے وہ کہیں نہیں مل سکتی کیوں کہ یہ تعلیمات انسانی ہدایت ہی کے لیے ہیں بلکہ عین اجزائے ہدایت ہیں اور اُس ہادی برحق کی طرف سے ہیں جس نے قرآن حکیم کو اسی مقصد کے لیے بھیجا ہے اور اسی لیے ان تعلیمات میں کشش، سادگی اور عملیت رکھی ہے تاکہ اللہ کے بندے دوسری سحر انگیز کتابوں سے کٹ کر قرآن مجید کی طرف رجوع کریں۔ قرآنی تعلیمات کے یہ چالیس نکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱- سابقہ کتب الٰہی کی توثیق

۲- عقائد ثلاثہ اور معروف ومنکر کی یاد دہانی فطرت کی آواز

۳- کتاب الٰہی اور کتاب فطرت ایک ہی سکہ کے دو رُخ

۴- مطلوبہ ہدایت کے لیے رب العالمین کی تصدیق ناگزیر

۵- بنی نوع انسان کو کلمۂ طیبہ سے وابستگی کا مطالبہ

۶- بندگانِ خدا پر ایمان بالغیب کی شرط

۷- بنی آدم کی فلاح کے لیے عقائد خمسہ پر کامل یقین ناگزیر

۸- اللہ تعالیٰ سے مخلصانہ تعلق انسان کی روحانی معراج کا پروانہ

۹- عبودیت ذکرالٰہی کا جامع عنوان اور ذکرالٰہی عبادت کی جان

۱۰- دوسروں پر تبلیغ سے پہلے خود عمل کی تعلیم

۱۱- انسانی اخوت ومساوات کی علمبردار

۱۲- ایمان والا مستضعفین کا مسیحا

۱۳- انسان بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض

۱۴- عقیدۂ رسالت انسانی احتیاج کی ربانی تکمیل

۱۵- عقیدۂ آخرت کے ذریعہ نظامِ زندگی کو سمت وتحریک

۱۶- گنجلک مسائل حیات کا آسان اور پائیدار حل

۱۷- دنیوی زندگی دارالامتحان

۱۸- اعتدال ومیانہ روی طرۂ امتیاز

۱۹- ہر ایک کا درجہ بدرجہ حق

۲۰- فوز وفلاح کی کنجی قرآن وسنت

۲۱- عام فہم اور آسان مگر مربوط

۲۲- سنگین جرائم کے سد باب کے ہمہ جہتی ذرائع

۲۳- پائدار امن اور بے لاگ انصاف

۲۴- حرمتِ جان ومال اور آبرو اور توقیر محنت وفن

۲۵- دنیا اور آخرت کی زندگی میں بہترین توازن

۲۶- لِلّٰہ فی اللہ کا فلسفۂ نیت وعمل

مندرجہ بالا نکات کا ایک مختصر جائزہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قرآنی تعلیمات کے چالیس نکات

دنیا کی ہر کتاب قاری کے ذہن پر کچھ اثرات مرتب کرتی ہے۔ بیشتر کتابیں صرف وقتی طور پر فرحت و انبساط فراہم کرتی ہیں کیوں کہ ان کو پڑھنے والے اکثر وقت گزاری کے لیے ہی ایسی کتابیں پڑھتے ہیں۔ جب کہ بعض کتابیں نصابی، موضوعاتی اور تکنیکی نوعیت کی ہوتی ہیں اور وہ قاری کی دلچسپی کے بقدر ذہن و حافظہ میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ البتہ بعض کتابیں انسانی ذہن و دماغ پر پائدار نقش قائم کر دیتی ہیں جس کا تعلق قاری کی دلچسپی کے ساتھ، کتاب کی حسن پیشکش اور اس کی دل لگتی تعلیمات سے بھی ہوتا ہے۔ قرآن کریم ایسی ہی کتاب ہے بلکہ اس معاملہ میں واحد و یکتا کتاب ہے جس کی تعلیمات انسانی قلب و ذہن کے دریچے کھول کر ان پر ایک نہ مٹنے والا نقش مرتسم کر دیتی ہیں جب کہ

قرآن مجید کا معجزانہ اسلوب، اس کی زبان اور اس کی سادگی نیز طرز تعلیم اور نفس تعلیم خود اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

ہمارے پیش نظر اس مضمون میں صرف قرآنی تعلیمات کے اہم نکات کی مختصر تشریح پیش کرنا ہے اور اس میں بھی صرف چالیس نکات پر بس کر دینا ہے۔ ان تعلیمات میں بذات خود جو حسن و جمال اور سادگی ہے، جو عملیت و یگانگت ہے اور جو کمال و اثر انگیزی ہے وہ کہیں نہیں مل سکتی کیوں کہ یہ تعلیمات انسانی ہدایت ہی کے لیے ہیں بلکہ بنیادی اجزائے ہدایت ہیں اور اس ہادی برحق کی طرف سے ہیں جس نے قرآن حکیم کو اسی مقصد کے لیے بھیجا ہے اور اسی لیے ان تعلیمات میں کشش، سادگی اور عملیت رکھی ہے تا کہ اللہ کے بندے دوسری سحر انگیز کتابوں سے کٹ کر قرآن مجید کی طرف رجوع کریں۔

قرآنی تعلیمات کے چالیس نکات مع مختصر تشریح مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سابقہ کتب الٰہی کی توثیق:

قرآن حکیم کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ کتب سابقہ کی تصدیق و تکمیل کرتا ہے اور محرف تعلیمات کی تنسیخ و ترمیم کر کے آفاقی احکام پیش کرتا ہے تا کہ احکام الٰہی کی بدلتے زمان و مکان میں تنفیذ ہو سکے۔ وہ کتب سابقہ کا محافظ و مہیمن ہے۔ دنیا میں آج جو خیر اور معروف پایا جاتا ہے وہ انبیائی تعلیمات ہی کی باقیات میں سے ہے۔ قرآنی تعلیمات ہی نے ان سابقہ الہامی تعلیمات کی توثیق کر کے ان کو حقانیت کی سند فراہم کی ہے(۱)۔ لہٰذا جہاں کہیں قرآن کریم توریت، انجیل، زبور کے ماننے والوں کے پیش کردہ دعووں کو چیلنج کرتا ہے تو پھر ان کے لیے حقانیت کی کوئی دلیل نہیں رہ جاتی کیوں کہ ان مصاحف میں ترمیم کے خود اہل کتاب قائل ہیں اور کسی کتاب میں بھی خالص اللہ کا کلام موجود نہیں۔ قرآن کریم ہی کی تعلیمات کے فیض سے آج موسیٰ، عیسیٰ اور داؤد علیہم السلام کا وہ عزت واحترام باقی ہے جو ان کے شایان شان ہے ورنہ ان کے ماننے والوں نے جو افراط و تفریط سے کام لیا کہ یا تو ان کو خدا بنا لیا ورنہ ان کی تحقیر و توہین میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس کے برخلاف قرآن مجید کے حامل اول محمد رسول اللہ ﷺ کی بلندی سیرت اور ان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کا

قرآن نہ صرف متعدد بار تذکرہ کرتا ہے بلکہ قرآن پاک کی حقانیت کی کسوٹی آپ کی قبل بعثت بے داغ سیرت و کردار سے فراہم کی جاتی ہے۔(یونس:۱۶) دوسری طرف ان کو اللہ کا بندہ بتایا جاتا ہے۔

۲- عقائد ثلاثہ اور معروف ومنکر کی یاد دہانی فطرت کی آواز پر مبنی ہے:

قرآنی تعلیمات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسانی فطرت کی سچی ترجمان ہیں۔انسانی فطرت، اس کے ضمیر، لاشعور اور وجدان میں جو حق کی چنگاری دبی ہے قرآن مجید اور اس کی تعلیمات اُسی دبی چنگاری میں پھونک مار کر اس کو شعلہ جوالہ بنانا چاہتی ہیں۔ قرآن حکیم اسی معنیٰ میں ذکر و تذکرہ اور ذکریٰ و تذکیر ہے (۲)۔اس کی تعلیمات یہ بتاتی ہیں کہ بنی آدم نے یوم الست میں اپنے رب سے عہد وفا باندھا تھا (الاعراف: ۷:۱۷۲) جس سے انسان مختلف وجوہ سے غافل ہو گیا اب قرآن کریم اس کو وہ عہد الست یاد دلاتا ہے۔قرآنی تعلیمات صاف ستھرے معاشرہ میں پائے جانے والے جملہ معروف کا حکم دیتی اور ایسے معاشرہ میں ناپسندیدہ منکر سے روکتی ہے۔معروف ومنکر کا یہ تصور انسانی فطرت کی سلامت روی اور اس کے احسن تقویم (التین - ۹۵:۴) پر ہونے کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ قرآنی تعلیمات اسی لیے سلیم القلب لوگوں کے دل کو لگتی اور ان کے دل کی آواز ہیں کیوں کہ انھوں نے اپنی فطرت سلیم کو خواہشاتِ نفس اور شیطان کی اکساہٹوں کی آماجگاہ نہیں بنایا ہے۔انسان ظلم، جھوٹ، قتل و غارت گری، بے حیائی، بدعنوانی وغیرہ کو ناپسند کرتا ہے اور انصاف، سچائی، حسنِ اخلاق، وفائے عہد وغیرہ کا مداح ہے اور یہی قرآنی منکرات ومعروفات ہیں۔انسان ظلم کا استیصال اور انصاف کا قیام چاہتا ہے، یہی قرآنی تعلیمات ہیں۔انسانی تحت الشعور میں کتنی ہی طبعی خواہشیں دبی پڑی ہیں۔قرآنی تعلیمات انہیں کو معروف بتا کر کرنے کا حکم دیتا ہے، یہی اس کی تذکیر ہے۔اسی طرح اس کی طبیعت بہت سے گھناؤنے اعمال سے اِبا کرتی ہے قرآنی آیات وتعلیمات انہیں کو فحشاء ومنکر بتا کر روکنے کی تاکید کرتا ہے۔یہ فطری خواہشات ہی کی ترجمانی اور یاددہانی ہے اور یہی ذکر ہے۔اللہ تعالیٰ نے فطرت کی اسی خواہش کو الفاظ کا جامہ پہنا کر قرآن مجید کی شکل میں بھیجا جو خود ذکر ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عالم کون ومکان اس طرح بنایا اور سنوارا ہے کہ انسان آفاق وانفس، آثار کائنات، تاریخ انسانی، عقل ووجدان، پیغمبروں کی سیرت اور ان کے مشن کے ذریعہ اُن عقائد ثلاثہ کو مؤکد کراتا ہے جن کو توحیدِ، رسالت اور آخرت کہا جاتا ہے۔ عقائد ثلاثہ کا اس کائنات اور انسان کی فطرت سے ثبوت فراہم کرنا ہی قرآن کی یاد دہانی ہے۔ یہی ذکر، تذکیر اور تذکرہ دعوتِ قرآن بلکہ عین قرآن ہے۔

۳- کتابِ فطرت اور کتابِ الٰہی ایک ہی سکہ کے دورخ ہیں:

قرآن حکیم کتاب کائنات کو چشم بصیرت سے پڑھنے کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ اس سے قرآن حکیم کی حقانیت دل میں جاگزیں ہو اور کتاب الٰہی میں تدبر کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ کائنات عالم اور خود اس کے نفس وجود کے رازہائے سربستہ کی معرفت حاصل ہو۔ قرآن حکیم بنیادی طور پر تین عقائد یعنی توحید، رسالت اور معاد (آخرت) کی تعلیم دیتا ہے (۳)۔ اور ان عقائد ثلاثہ سے انسان کو مزید دو عقائد سے جوڑتا ہے جن کو خلافت اور عبادت کہا جاتا ہے گویا دنیا میں انسان کی دو امتیازی حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب وخلیفہ ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ دوسری حیثیت یعنی بندۂ خدا ہونا اس کے لیے ہی خاص نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں جنوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی کے لیے پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ یہ عقائد خمسہ جس میں تین کا تعلق خالق و مالک سے اور دو کا تعلق بندۂ خدا بنی آدم سے ہے کتاب الٰہی اور کتاب فطرت دونوں سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ عقائد خمسہ اس کائنات میں نعمتوں کی کثرت، اس کا نظم وتناسب، اشیاء کی آپسی ہم آہنگی، کثرت میں وحدت، تضادات میں توافق اور تکمیل بطریق زوجیت کے ذریعہ مؤکد و ثابت (affirm) ہوتے ہیں۔ اس طرح آیات الٰہی آیات کائنات سے اور آیاتِ کائنات آیاتِ الٰہی سے مؤکد ہوتی ہیں اور ان آفاق وانفس کی نشانیوں سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ مزید برآں ان عقائد کو ماننے سے فلاح دارین کے راستے کھلتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کی تحریک وتفصیل ملتی ہے اور یہی قرآن مجید کا مقصدِ نزول ہے۔

۴- مطلوبہ ہدایت کے لیے رب العالمین کی تصدیق ضروری ہے:

اس دنیا میں تمام ہی مذاہب کے بانی یہ کہتے ہیں کہ انہیں معرفت حق کا نور (Divine enlightenment) حاصل ہوگیا ہے۔ مگر قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق دراصل جامع ہدایت ربانی (Divine guidance) ہی انسانی فوز وفلاح (Salvation) کی ضمانت دیتی ہے جو براہ راست تو انبیاء کرام کو حاصل ہوتی ہے اور ان کے ذریعہ دیگر بندگان خدا تک پہنچتی ہے۔ اور اس کے لیے رب العالمین کی تصدیق بھی ضروری ہے کیوں کہ راستے تو بہت سے ہیں مگر صراط مستقیم ایک ہی ہوسکتی ہے جو رضائے الٰہی کے ذریعہ جنت تک لے جاتی ہو (النحل-۹:۱۶)۔

۵- قرآنی تعلیمات بنی نوع انسان کو کلمۂ طیبہ سے جوڑتی ہیں:

قرآنی تعلیمات 'لا الہ الا اللہ (۴) محمد رسول اللہ (۵) کے زبان، قلب اور عمل سے اقرار کے ذریعہ فلاح دارین کی ضمانت دیتی ہیں۔ اس میں کلمۂ توحید: کلمۂ وحدت، مساوات واخوت اور کلمۂ حریت فکر وعقیدہ اور عمل ہے جو انسان کو اللہ کے سوا سے بے نیاز کردیتا ہے۔ اور کلمۂ رسالت: ہدایت ربانی کے تسلسل، انسان پر رب کریم کے خصوصی فیضان اور شاہراہ مستقیم کی تفصیلات کو رسول وقت سے لینے کی یاد دلاتا ہے اور محمد رسول اللہ کی امتیازی پوزیشن کو بھی یاد دلاتا ہے کہ آپ پر دین کی تکمیل اور اتمام نعمت ہوئی (۶)۔ یعنی آپ نبی آخر الزماں ہیں۔ اب بنی نوع انسان کی اخروی نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ اتباع محمدیؐ ہی میں ہے۔ اس طرح کلمۂ طیبہ پر سچا ایمان اور اس کے مطابق زندگی سنوارنے پر ہی جہنم سے خلاصی اور جنت کا دخول ممکن ہے۔

۶- بندگان خدا پر ایمان بالغیب کی شرط:

قرآنی تعلیمات تقویٰ وہدایت اور حصول جنت کے لیے ایمان بالغیب کو لازم قرار دیتی ہیں (۷)۔ کیوں کہ جنت خود بھی غیب کے پردوں میں مستور ہے جب جنت کے انعام اور اس میں دائمی قیام کی تمنا ہے تو ایمان بالآخرہ کے مطابق اعمالِ خیر کے ذریعہ اپنی

آخرت کو سنوارنے کی فکر کرنی چاہیے۔قرآن کریم کے مطابق حقیقت کی لامتناہی دنیا غیب میں ہے۔ یہ بات تو اب سائنس کا تھوڑا سا علم رکھنے والا بچہ بھی جانتا ہے کہ جتنا کچھ ہم اپنی آنکھوں اور آلات سے دیکھ سکتے ہیں وہ اس مادی کائنات (Physical world) کا بھی لاکھواں حصہ نہیں۔ اب اگر ہم اس مادی اور حسی دنیا سے آگے بڑھیں تو سب کچھ غیب ہی میں ہے۔ ہمارا پروردگار حقیقی غیب کے پردوں میں رہتا ہے۔ جنت وجہنم بنادی گئی ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آتیں، شیطان موجود ہے مگر ہماری نظروں سے اوجھل کردیا گیا ہے جب کہ ہماری عقل، ہمارا وجدان، ہمارا ضمیر، فطرت سلیم، انبیائی تعلیم اور حکیم داناؤں کا یقین یہاں تک کہ موجودہ سائنس تک نظر نہ آنے والی دنیا کو پورے زوروشور سے مانتے ہیں اور یہ سبھی ایمان بالغیب کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد ایمان بالغیب پر فلاح دارین کے مدار کو تسلیم کرتی ہے۔

۷- بنی آدم کی فلاح کے لیے عقائد خمسہ پر کامل یقین:

قرآنی تعلیمات کا لب لباب اور محور ومرکز توحید، رسالت، آخرت، خلافت اور عبادت پر سچا اور کامل یقین پیدا (Develop) کرنا ہے۔قرآن کریم کی تعلیمات انہیں حقائق کو بنیاد بنا کر اسلامی زندگی کی تشکیل کرتی ہیں۔ مثلاً عقیدۂ توحید اس کائنات کو باخدا ہی نہیں بلکہ تمام تر کامل ومکمل اور بہترین صفات سے مزین خدائی تخلیق اور اس خدا کو یکتا، تمام عیوب سے پاک اور لیس کمثلہ شیء (الشوریٰ-۴۲:۱۱) تسلیم کراتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ اس کی قدرت، رحمت، حکمت، ربوبیت اور علم کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا اور اس کی یہ صفات خاص اس کائنات پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی ذات میں بھی یکتا ہے صفات میں بھی، اس کو ہمیں سارے ہی حقوق خدائی دینے ہیں اور وہ ہی تمام اختیارات کا مالک ہے ان تمام معاملات میں نہ تو کوئی اس کا ہم سر ہوسکتا ہے اور نہ اس نے کسی کو شریک کیا ہے۔ یہی قرآنی تعلیم ہے مزید برآں وہی مالکِ کل ہے، اس کی مرضی کے بغیر ایک ذرہ اور پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ اسی طرح قرآن میں رسالت اور آخرت کی واضح تفصیلات ہیں۔ البتہ انسان کی اس کائنات میں دو حیثیتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے اولاً یہ کہ وہ اللہ کا بندہ

وغلام ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی بندگی وعبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے(۸)۔اور دوسرے یہ کہ وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب وخلیفہ ہے(البقرہ۲:۳۰) یعنی یہ کہ اسے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات کونافذ کرنا ہے ان دونوں امتیازی حیثیتوں کا تقاضہ ہے کہ اس کی ساری زندگی عبادت خداوندی سے عبارت ہو جس میں اس کا امتیازی مقام خلافت جھلکتا رہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کوتصرفات کائنات کی صحیح معرفت حاصل کر کے معرفت خداوندی حاصل کرنی چاہیے تاکہ وہ نہ صرف مادی بلکہ روحانی معراج سے بھی ہمکنار ہو سکے۔

۸- اللہ تعالیٰ سے مخلصانہ تعلق انسان کوروحانی معراج کا پروانہ عطا کرتا ہے:

قرآنی تعلیمات کا اہم سبق یہ بھی ہے کہ وہ اللہ سے مطلوبہ تعلق کے ذریعہ فانی، محدود اور نامکمل انسان کوعروج کی اس منزل تک پہنچانے کی بشارت دیتی ہیں جس کا تصور تک انسان حاصل کرتا ہے جس کی تمنا اس کی فطرت میں ڈالی گئی ہے، اور اقبال کے الفاظ میں 'وہ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ' والی تصویر بن جاتا ہے۔مزید برآں وہ نماز کے ذریعہ معراج روحانی ومعنوی حاصل کرتا ہے اور وہ اللہ کی خاطر محبت کرنے والا ،نفرت کرنے والا ، دینے والا اور روکنے والا بن جاتا ہے(۹)۔

۹- عبودیہ ذکرالٰہی کا جامع عنوان اور ذکرالٰہی عبادت کی جان:

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کوعبادت کے واسطے پیدا کیا اور قرآن کریم کو ذکر و یاد دہانی بنایا۔عبادت وذکر دراصل بندہ کو اپنے رب سے مطلوبہ تعلق قائم کراتے ہیں جس کو سورہ العنکبوت میں أَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّـهِ أَكْبَرُ (۲۹:۴۵) سے مؤکد کیا گیا ہے۔بندوں کا خدا سے تعلق دراصل عبد وعبودیہ کا رب وربوبیہ سے ہے۔انسان اللہ کی تسبیح کے ذریعہ کائنات اور اس کی اشیاء سے وابستہ ہو جاتا ہے اور گویا کائنات کی سُر میں حمد ومناجات کا ترانہ گاتا ہے جس کی حقیقی شکل قرآن کریم ،حضرت داؤد علیہ السلام کی مناجات میں چرند وپرند اور پہاڑوں کو شامل کر کے پیش کرتا ہے۔کائنات کی ہر شے زبان حال سے یا اپنی تکوینی ہیئت سے اللہ کی حمد وتسبیح اور قیام

رکوع اور سجود کر رہی ہے اور ان کی یہی عبادت ہے۔ انسان سے شعوری طور پر اور زبانِ حال وقال سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح وعبادت کا مطالبہ ہے(۱۰)۔ قرآنی تعلیمات کی رو سے اللہ تعالیٰ کی یاد قلبِ مومن میں رچ بس جانا چاہیے۔ عبدیت وعبودیت دونوں کا یہی مطالبہ ہے کہ بندہ قلباً، لساناً اور عملاً ذکرِ الٰہی اور عبادت میں مشغول رہے۔

۱۰- تبلیغ سے پہلے خود اس پر عمل کی دعوت:

قرآن مجید کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو کہنے سے قبل خود عمل کا مطالبہ کرتا ہے(۱۱)۔ دراصل دنیا میں معروفات کی تبلیغ کرنے والے ہر جگہ اور ہر زمانہ میں پائے جاتے رہے ہیں۔ یہ بھی بہر حال بھلائیوں کو پھیلانے کا ایک ذریعہ ہے مگر قرآن یہ چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے حق کی اشاعت میں خود بھی مخلص وسنجیدہ ہوں تا کہ کسی کو اعتراض کا موقع نہ رہے اور حق پر عمل کرنے والا زبانی تبلیغ نہ بھی کرے تو بھی خاموش تبلیغ کا ثواب حاصل کرتا رہتا ہے۔

۱۱- قرآنی تعلیمات انسانی اخوت ومساوات کی علمبردار:

قرآنی تعلیمات کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ تمام انسانوں کو ایک جوڑے آدم وحوا کی اولاد بتاتی ہیں(۱۲)۔ اور سب کا ایک رب اور ایک جدامجد کا حوالہ دے کر انسانی اخوت کے دوہرے رشتہ سے انسانوں کو آپس میں برابری اور بھائی چارگی کے بندھن میں باندھتی ہیں۔ اور جہاں تک دستکاری اور صنعت وحرفت کی بنیاد پر انسانی خاندانوں وقبیلوں کی پہچان وتعارف کا معاملہ ہے اس میں کوئی حرج تسلیم نہیں کرتیں(۱۳) کیوں کہ انسانی تہذیب وثقافت میں صنعت وحرفت کی اہمیت سے انکار محال ہے کہ ان کے ذریعہ سے انسانی ضروریات کے سامان مہیا ہوتے ہیں اور معیشت پروان چڑھتی ہے مزید برآں لوگوں کے درمیان صنعت وحرفت کی توقیر بڑھتی ہے۔ ہاں بے شک اس بنیاد پر انسانوں کو ارذل واشرف طبقات میں تقسیم کر دینا انسانیت پر بھی صریح ظلم ہے اور صنعت وحرفت کے ساتھ بھی صریح ناانصافی۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزوشرف میں وہی اعلیٰ واکرم ہے جو اس سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔

انسانوں کا تیسرا مضبوط رشتہ صرف کلمہ لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر قایم ہوتا ہے اس بنیاد پر بھی ہر کلمہ گو آپس میں اخوت کے رشتہ میں پروئے ہوئے ہیں جس کا خصوصی تقاضہ ہے کہ آپس میں اصلاح اور عزت نفس کی پاسداری کرتے رہیں (۱۴)۔ یاد رہے کہ اسلام غرباء و مساکین اور ظلم و انصاف کے تعلق سے کوئی مذہبی امتیاز روا نہیں رکھتا۔

۱۲- مظلوم طبقات، غرباء اور مستضعفین کا مسیحا:

جیسا کہ گزشتہ نکتہ میں اشارہ کیا گیا کہ قرآنی تعلیمات میں مظلوم طبقات، غرباء، محروم (۱۵) اور مستضعفین (۱۶) خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ اور یہ استحقاق کسی مذہب و ملت یا عقیدہ سے مشروط نہیں ہے۔ ان کی مالی مدد امت مسلمہ کے افراد اور حکومت دونوں کے ذمہ ہے۔ مظلوموں کو انصاف دلانا بھی بالکلیہ غیر مشروط اور قابل ترجیح ہے۔ قرآن نے غلاموں کو پنجۂ غلامی سے آزاد کرنے کو مستحسن عمل قرار دیا (۱۷) اور مسلمانوں کے بڑے گناہوں کے کفارہ میں غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا (۱۸) ان کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی یہاں تک کہ امت مسلمہ نے ان کو کھانے پینے میں برابر کا درجہ دیا۔ قرآن کریم نے اسی زور دار انداز میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی (۱۹)۔ صنفِ نازک کے ساتھ ظلم و تعدی اور نابرابری کی تاریخ بھی زمانۂ قدیم سے آج کی مہذب دنیا تک پھیلی ہوئی ہے مگر اسلام و قرآن نے اس کو جو عزت و احترام اور حق دیے اس کی مثال معلوم تاریخ میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید کے حاملِ حقیقی اور حاملِ اول آنحضرت محمد ﷺ نے اپنی آخری وصیت میں غلاموں اور عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کو ہی یاد دلایا (۲۰)۔ غرضیکہ قرآنی تعلیمات ہر کمزور، مظلوم اور مستضعف کی مدد کرنا اور ان کو حق دلوانا اسلامی فریضہ قرار دیتی ہیں۔

۱۳- انسان بحیثیت عبد اللہ و خلیفۃ اللہ فی الارض:

قرآنی تعلیمات کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ انسان کو ایک طرف اللہ تعالیٰ کا بندہ اور دوسری طرف اس کا نائب و خلیفہ بتاتی ہیں۔ یعنی ایک طرف اس کو اللہ تعالیٰ کا ایک حقیر بندہ کہہ کر اس میں خاکساری اور تذلل کا جذبہ ابھارا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کا خلیفہ کہہ کر اس کا اکرام کیا جاتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عظیم ترین

بندوں انبیاء ورسل پر اپنی خصوصی نوازشوں کا تذکرہ کرتا ہے تو ان کو اپنا بندہ کہہ کر ذکر کرتا ہے مثلاً قرآن کی اعجازی تنزیل میں حضور نبی اکرم کو "عبدنا" (البقرہ: ۲۰-۲۳)، معراج کے سفر میں آپ کو "عبده" (اسریٰ-۱:۱۷)، فرقان کی تنزیل پر آپ کو "عبده" (الفرقان-۱:۲۵) اور آپ کو نبی بنا کر وحی کا ذکر کرنے میں آپ کو "عبدہ" کہا گیا (النجم-۱۰:۵۳) نیز مومنوں کو سورہ الفرقان میں عباد الرحمٰن (آیت ۶۳) کے القاب سے نوازا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ہدایت، کتابِ ہدایت اور فرقان اس کی عبدیت کے حوالہ سے ملی جب کہ علم اشیاء خلافت کے حوالہ سے۔ علم اشیاء کا حامل آدم شیطان کے بہکانے میں آ گیا اور خدا کے عتاب کا مستحق ہوا مگر اس کی خاکساری و آدمیت نے اس کو اپنے رب کے عذاب سے بچا لیا۔ توبہ کے بعد اس کے ساتھ ہدایت ربانی کا فیضان بھی تھا۔ یہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہو کر اس مادی کائنات کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے اور اس حسی کائنات (Physical World) کے اسرار ورموز سے ہی آشنا ہو سکتا ہے جب کہ مقام عبدیت کے اعلیٰ ترین مقام کے حامل امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ عرش اعظم پر سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں سے بھی اوپر جاتے ہیں اور اس عالم عالم ناسوت و لاہوت کے اسرار سے واقف ہوتے ہیں، یہ وہ مقام ہے جہاں سے آگے سید الملک حضرت جبرئیل کے پَر جلتے ہیں اور قرآن جس کے لیے علاماتی اور اشاراتی زبان استعمال کرتا ہے (النجم-۱۶:۵۳ تا ۱۸)۔ بہر حال انسان کی عبدیت میں روحانی عروج کی بشارت اور اس کی خلافت میں اس کے مادی عروج کے اشارے کیے گئے ہیں ورنہ نیابت خداوندی کا مقام بذات خود اعلیٰ ترین اعزاز ہے جب کہ انبیاء ورسل حقیقتاً اس مقامِ خلافت وعبدیت تک عملاً پہنچتے ہیں جس کا انسان بالقوہ حامل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خلافت وعبدیت کا بالقوہ حامل انسان مادی وروحانی دونوں عروج کو حاصل کرنے کا اہل ہے۔ ضرورت ہے اس کے نیک ارادہ، عزم مصمم اور عمل پیہم کی جن کے بقدر توفیق الٰہی ملتی ہے۔

۱۴- عقیدۂ رسالت انسانی احتیاج و پیاس کی ربانی تکمیل:

قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے اس کے کرم کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ہر وہ چیز پہلے سے مہیا کر دی جس کی اس کی

اپنی زندگی کے کسی بھی گوشہ اور کسی بھی لمحہ میں ضرورت پیش آسکتی تھی۔انسانی زندگی کی مادی ضرورتوں سے زیادہ اہم اس کی روحانی احتیاج ہے کیوں کہ اس کی روح کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے یعنی نفخت فیہ من روحی (الحجر-۱۵:۲۹؛ص-۳۸:۷۲)اور اس روح کا حامل انسان اسی وحی ربانی کا حامل قرار پایا جس کو قرآن اکثر ''روح'' (النحل-۱۶:۲، الشوریٰ-۴۲:۵۲) قرار دیتا ہے۔اس طرح سلسلۂ نبوت انسانوں ہی میں قایم کیا اور انسانوں کو سب سے بڑی نعمت،نعمت ہدیٰ سے نوازا اور اس کے لیے اپنے منتخب بندوں میں ایک اعلیٰ ترین ملکہ،ملکۂ نبوت عنایت فرمایا۔اللہ تعالیٰ کے خزانہ کی آخری اور بے پایاں نعمت جس پر اتمام نعمت اور تکمیل دین وہدایت کی مہر لگی وہ قرآن تھا(۲۱)۔آج دنیائے انسانیت کو اسی قرآنی ہدایت کے ابر کرم سے تشنگی بجھانے کے سارے سامان موجود ہیں۔ہمیں اس عظیم ترین نعمت کے نزول اور اس کے پانے پر خوشیاں منانا چاہئیں (یونس-۱۰:۵۸)اور اس کو دوڑ کر لینا اور سرآنکھوں پر لگانا چاہیے۔یہ اللہ تعالیٰ کا مزید کرم ہے کہ ہمیں اپنی نجات کے لیے قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور نبی اور کتاب پر ایمان لانے کا بوجھ نہیں ڈالا گیا جس طرح نبی آخرالزماں کی بعثت سے پہلے تمام امتوں پر ڈالا گیا تھا۔آپ ﷺ کا عملی نمونہ ایک کامل ومکمل اور بہترین نمونہ ہے(۲۲)۔اور آپ کی رسالت پر ایمان نیز آپ کی اطاعت واتباع ہی میں دنیائے انسانیت کی فلاح ونجات مقدر ہے(۲۳)۔

۱۵- عقیدۂ آخرت کے ذریعہ اسلامی زندگی کو سمت وتحریک:

قرآن کریم کے عقائد ثلاثہ میں عقیدۂ آخرت یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد اللہ کے حضور جوابدہ ہے۔اس کی پیشی کا دن یوم حشر کہلاتا ہے یہ دن انسانی موت ہی کے بعد نہیں بلکہ پوری کائنات کی ہلاکت کے بعد آئے گا۔اُس دن جو کامیاب ہوگا اس کے لیے ابدی عیش کی جنتیں ہیں اور جو اس یوم الحساب میں ناکام قرار دیا جائے گا اس کے لیے ہمیشہ ہمیش کا عذاب نار مقدر ہے(۲۴)۔اور اُس دن کی کامیابی کا انحصار اِس دنیا میں ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ زندگی گزارنے میں ہے۔انسانی زندگی کے رویوں اور اعمال کو عقیدۂ آخرت جتنا متاثر کرتا ہے اتنا کوئی دوسرا عقیدہ نہیں کرتا۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ عقیدۂ

آخرت کے تعلق سے انسانوں میں بہت سے غلط تصورات اور شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں مثلاً کہیں مرنے کے بعد زندہ اٹھائے جانے کا کوئی تصور نہیں، کہیں آواگون اور پُنر جنم کا عقیدہ ہے تو کہیں شفاعت کے خودساختہ تصورات۔ جب کہ بدقسمتی سے مسلمانوں میں اللہ کی رحمت کا یا حضورﷺ کی شفاعت کا غیر قرآنی تصور پایا جاتا ہے جو ایک شیطانی خیال ہے۔ دوسری طرف عقیدۂ آخرت کا صحیح علم اور دعویٔ ایمان کے باوجود نیت کی کھوٹ اور اعمال صالحہ میں کوتاہی کی وجہ سے انسانی زندگی کا روحانی حُسن ملیامیٹ ہوجاتا ہے۔ جب کہ مطلوبہ ایمان بالآخرہ جنت کی طلب اور جہنم سے بچنے کا قوی محرک فراہم کرتا ہے اور عقیدۂ توحید ورسالت اس کو مہمیز کرتے ہیں جس سے رضائے الٰہی کا عملی حصول آسان ہوجاتا ہے اور یہی مومنانہ زندگی کا نصب العین ہے۔

۱۶- گنجلک مسائل حیات کا عام فہم اور آسان حل:

اکثر انسانی مسائل حیات بڑے پیچیدہ ہیں جن کا حل انسان بذات خود نہیں نکال سکتا، اس کے لیے اس کو اپنے رب ہی سے ہدایات حاصل کرنی ہیں۔ قرآن مجید میں جملہ انسانی مسائل کے حل موجود ہیں البتہ ان کے لیے اس کو قرآن بار بار پڑھنا اور خوب سمجھ کر پڑھنا ہوگا۔ کاغذ، پینسل کے ساتھ پڑھنا ہوگا اور سیاق وسباق کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ اس موقع پر کہا جاسکتا ہے کہ ہم علماء وفقہا سے اپنے مسئلہ کا حل دریافت کرلیں گے۔ ٹھیک ہے بہت سے مسائل کا حل عصر حاضر کے مفتیان کرام بتادیں گے پھر بھی انسانی زندگی کے مسائل فقہی ہی تو نہیں نفسیاتی، روحانی، پرائیویٹ اور پرسنل بھی ہوتے ہیں مزید برآں کیا ہم اپنے رب کو چھوڑ کر اس کے بندوں سے ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کم ازکم ہمارا یہ خیال ہے کہ قرآن مجید نعوذ باللہ خود اس قابل نہیں کہ ہمارے سوال کا حل فراہم کردے یا ہم تدبر قرآن کی اہمیت تسلیم نہیں کرتے یا کم ازکم اس حکم سے پہلوتہی کے جرم کے مرتکب ہیں۔ خدارا اپنے رب اور اس کے کلام سے حسن ظن رکھیے تو ایمان سلامت رہے گا۔ کیا ہمیں قرآن پاک جو کتاب ہدایت اور کلام اللہ ہے اس سے تو گمراہی کا خطرہ ہے اور جو انسانوں کی تصنیفات، اقوال اور آراء ہیں ان سے گمراہی کا اندیشہ نہیں۔ اگر ہمارا ایمان اتنا

ہی کمزور ہے تو پہلے اپنے ایمان کی خیر منائیں اور اپنے رب سے دعا کریں کیوں کہ وہی ہمارے ایمان میں استقامت عطا کرسکتا ہے جب کہ اس کے بندوں کے بارے میں ایسا خیال کرنا بھی شرک ہے۔ یہ کون عالم کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم کو بامعنی پڑھنے سے، سمجھ کر پڑھنے سے اور تدبر کرنے سے گمراہی کا خطرہ ہے۔ جو ایسا کہتا ہے وہ خود ہی عالم نہیں ہوسکتا۔ یہاں فقہ اور فقہا کی اہمیت وضرورت اور ان کی طرف رجوع کرنے سے ہرگز انکار مقصود نہیں البتہ یہ بتانا ہے کہ قرآن مجید کی جگہ فقہ بلکہ اس سے آگے فقہ کو رکھنا ہرگز اسلامی تعلیم نہیں بلکہ شیطانی تعلیم ہے۔ کیا قیامت کے روز بھی ہم اپنے علماء کا حوالہ دے کر بچ سکتے ہیں۔ یعنی سورہ العنکبوت آیت ۱۲ کے مطابق "اتبعوا سبيلنا ولنحمل خطاياكم" "تم ہماری راہ اختیار کرلو ہم تمہاری خطاؤں کو (حشر کے روز) اٹھالیں گے"۔ والی کافروں کی گستاخی اپنے علماء کی طرف منسوب کرسکتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ آج جس تدبر قرآن سے یہ کہہ کر روکا جاتا ہے کہ عوام اور جاہل لوگ قرآن کریم کے غلط معنی پہنا سکتے ہیں، اس لیے گمراہی کا خطرہ ہے وہی لوگ جب اللہ رب کریم اور کلام اللہ کو چھوڑ کر گزشتہ اہل کتاب کے احبار ورہبان کی طرح علماء کرام پر تکیہ کر بیٹھتے ہیں تو نہ شرک ہے، نہ گستاخی رب، نہ انکار رسول ہے اور نہ گمراہی۔ یہ بھی تو غور کریں کہ تدبر قرآن والی آیت (النساء-۴: ۸۲) کا خطاب تو خاص طور سے منکرین قرآن ہی سے ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک تو وہ تدبر کے ذریعہ ہدایت حاصل کرسکتے ہیں مگر ہمارے نادان بھائی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے مسلم عوام تدبر قرآن کے ذریعہ گمراہ ہوجائیں گے گویا وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں (معاذ اللہ) اور یا ہماری ہدایت کی فکر ان کو اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ ہے نعوذ باللہ۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ بقول علامہ اقبال معاملہ یہ ہے کہ

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

۱۷- دنیوی زندگی دارالامتحان

قرآنی تعلیمات کے مطابق ہر انسان یہاں ہر لمحہ زیر امتحان ہے اور وہ کوئی نہ کوئی

پرچہ حل کررہا ہے جو جتنا بہتر پرچہ حل کرے گا اسی کے بقدر آخرت میں اجر پائے گا(۲۵)۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاموشی سے کوئی نہ کوئی سوال ہر گھڑی اٹھتا رہتا ہے جس پر ہر انسان کوئی نہ کوئی فیصلہ اور ردِّعمل کرتا رہتا ہے۔انسانی امتحان کے پرچوں میں ہر ایک کو اپنے یکتا پرچے مل رہے ہیں جو ہر کوئی اپنے اپنے ایمان، عقیدہ، صلاحیت اور حالات کے مطابق حل کررہا ہوتا ہے کیوں کہ اس سے مفر نہیں۔ایک پرچہ کے بعد دوسرا پرچہ گزشتہ جواب کی نیت و وزن کو مزید آنکنے کے لیے دے دیا جاتا ہے یہاں تک کہ بندۂ خدا کے حالات بدل جائیں اور اس میں اس کا نیا امتحان مقصود ہو۔اسی طرح انسانی زندگی کا آخری لمحہ آجاتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس وقت کا پرچہ اور جواب سب سے اہم ہوتا ہے کیوں کہ انسانی کامیابی وخسران کا مدار ایک طرف مجموعی طور پر اس کے ایمان اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے پر ہوتا ہے تو دوسری طرف اس پر ہوتا ہے کہ آخری وقت میں اس کی نیت وارادہ اور ایمان وعمل کا کیا حال ہے۔

۱۸- اعتدال ومیانہ روی طرۂ امتیاز:

قرآنی تعلیمات کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مؤمنین کو اعتدال ومیانہ روی کی تعلیم دیتی ہیں حتی کہ امت مسلمہ کو امت وسط بتایا گیا ہے (۲۶)۔جس میں میانہ روی، عدل واعتدال، بیچ کی راس ہونا سبھی کچھ شامل ہے یعنی ہر طرح سے افراط وتفریط سے پاک ہونا۔ دوسری طرف عباد الرحمٰن کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ خرچ کرنے میں نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی بلکہ ان کے درمیان میانہ رو ہوتے ہیں (۲۷)۔سورہ بنی اسرائیل میں یہ حکم ہے کہ نہ تو اپنے ہاتھوں کو گردن تک کھینچ لے اور نہ اتنا کھول دے کہ ملامت زدہ اور پریشان ہو جائے (۲۸:۱۷)۔قرآن حکیم کی عدل وقسط، میانہ روی واعتدال کی تعلیمات نیز افراط وتفریط سے پاک اور آسان وعملی تعلیمات اس کا طرۂ امتیاز ہیں۔

۱۹- انسان پر ہر ایک کا درجہ بدرجہ حق ہے:

اس کائنات کی جملہ موجودات وحیوانات مع انسان بلکہ مع ان کے خالق کے سبھی حقوق وفرائض کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ہمارے اوپر دوسروں کے تئیں بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں جن کے بقدر ان پر ہمارے حقوق بنتے ہیں۔اس طرح انسان

اور اس کے خالق کے درمیان حقوق وفرائض دونوں کا رشتہ ہے تو انسان اور حیوانات اور انسان اور دیگر موجودات کے درمیان بھی حقوق وفرائض کا رشتہ قایم ہے کہ خصوصاً انسان تمام مخلوقات خداوندی نیز بین الانسانی حقوق کی پاسداری کرے اور اپنے خالق کا حق ادا کرے نیز اپنے نفس کے حقوق کو بھی نہ بھولے۔ ہمارے رب کا ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کی ذات، صفات حقوق واختیارات میں اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں۔ ہمارے نفس کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اس کے جائز مطالبات وحاجات میں عدل واعتدال سے کام لیں اور اس کا بے چون وچرا حق ادا کریں۔ اسی طرح بندگان خدا کے حقوق کا بھی معاملہ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ نہ صرف ہر ایک حقوق وفرائض کے بندھن میں بندھا ہوا ہے بلکہ ان حقوق وفرائض میں درجہ بندی پائی جاتی ہے۔ سب سے بڑا حق ہمارے مالک اور معبود حقیقی کا ہے کہ ہم اس کے وفادار بندے بن کر رہیں۔ انسانوں میں سب سے بڑا حق ہمارے والدین کا ہے، ان میں بھی ماں کا حق والد سے زیادہ ہے۔ پھر درجہ بدرجہ دیگر اعزہ واقربا کا، پھر پڑوسی کا، پہلو کے ساتھی اور مسافر وغیرہ کا (۲۸)۔ اسی طرح اعمال میں بھی درجہ بندی ہے جیسے فرض، واجب، سنت، مستحب، مباح، مکروہ تنزیہی، مکروہ تحریمی اور حرام۔ اس کے علاوہ اعمال کی درجہ بندی حالات کے لحاظ سے بھی بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً عام حالات میں جہاد سب سے اہم فریضہ ہے مگر کبھی ماں کی خدمت اس پر سبقت لے جاتی ہے۔ عام حالات میں اللہ تعالیٰ کا حق عبادت سب سے زیادہ ہے مگر بیماروں کی تیمارداری اور غریبوں کی فریادرسی اس پر سبقت لے جاتی ہیں بالخصوص اگر اُن کو چھوڑنے سے ان کی پریشانی میں بڑا اضافہ ہوتا ہو۔ اسلام میں قرآن پر مبنی یہ تعلیمات کسی کو اعتراض کا موقع نہیں دیتیں کیوں کہ اس سے بہتر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

۲۰- فوز وفلاح کی کنجی قرآن وسنت پر عمل میں:

جہاں قرآنی تعلیمات پر ایمان لائے اور عمل کیے بغیر فوز وفلاح ممکن نہیں، اسی کے ساتھ قرآن ہی کی رو سے یہ بھی شرط ہے کہ قرآنی تعلیمات پر بہترین عمل سنت رسول ہی سے ممکن ہے اور اتباع رسول بھی قرآنی حکم ہی ہے (۲۹)۔ سنت رسول نہ صرف قرآنی

تعلیمات کی بہترین شکل کا نام ہے بلکہ بعض اوقات عملی شکل صرف سنت رسول ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ مثلاً نماز کی ساری تفصیلات بلکہ زکوٰۃ، حج اور رمضان وغیرہ عبادات کی تفصیلات ۔اسی طرح انسان کے جملہ مسائل میں عملی ہدایت کا بہترین ماڈل ونمونہ سنت رسول ہی فراہم کرتی ہے (۳۰) بالخصوص جہاں قرآن خاموش ہے وہاں اعمال کی حقانیت وعدم حقانیت کی سند سنت رسول ہی فراہم کرتی ہے لہٰذا محمد رسول اللہ نہ صرف شارح قرآن ہیں بلکہ ایسے معاملات میں وہی شارع بھی ہیں۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق رسول کی اطاعت خدا ہی کی اطاعت ہے۔شریعت صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں ہے بلکہ رسول اللہ (آنحضرت ﷺ) اس پر کچھ اضافہ بھی کرتے ہیں، اس میں بعض شرائط جوڑ کر سمت بھی فراہم کرتے ہیں۔اس کی تشریح بھی کرتے ہیں اس کی بہترین عملی شکل بھی بتاتے ہیں اور یہ سب چیزیں مل کر شریعت کہلاتی ہے۔

۲۱- قرآن کریم کی تعلیمات میں سنگین جرائم کے سد باب کا جامع حل:

قرآنی تعلیمات کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ انسانیت کے چبھتے، سلگتے اور سنگین جرائم کے مکمل سد باب کے لیے جامع اور ہمہ جہتی ہدایات دیتی ہیں۔قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے مسائل میں منفی اور مثبت پہلوؤں اور عوامل کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک جامع لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔مثال کے طور پر زنا، عصمت دری اور عورتوں کے ساتھ بدسلوکی وغیرہ متعلقہ جرائم کا وجود انسانیت کا ایک ایسا ناسور ہے جو ہر زمانہ میں رستا رہا ہے۔ وحشی اور تہذیب انسانی سے عاری سوسائٹیوں کا تو کہنا ہی کیا، مہذب کہلانے والی قوموں میں بھی ایسے فحش اور سنگین جرائم کی بڑھتی شرح انسانیت کو شرمندہ کرنے کے لیے کافی ہے۔قرآنی تعلیمات اس سلسلہ میں جو احکام ربانی پیش کرتی ہیں وہ اس طرح ہیں:

۱- زانی مرد اور زانی عورت کو برسر عام سو کوڑے لگائے جائیں (۳۱) (اور اگر ان میں کوئی شادی شدہ ہو پھر بھی فساد آمیز آبروریزی کا مرتکب ہو تو اسے سنگسار کیا جائے)۔

۲- اگر کسی پاکباز وعفت مآب خاتون پر کوئی زنا کی تہمت لگائے مگر چار گواہ نہ لا سکے تو اس کو اسّی (۸۰) کوڑوں کی سزا (۳۲)۔

۳- فحش لٹریچر، گانے بجانے، جنسی طور پر برانگیختہ کرنے والی فلمیں، تھیٹر، اخلاق باختہ مناظر، بیہودہ اور عریانیت پر مبنی جشن و پروگرام وغیرہ تمام چیزیں جن سے فحاشی کی اشاعت ہوتی ہو (۳۳) سبھی ناجائز ہیں۔

۴- نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کا جلد از جلد انتظام کیا جائے اور ایسا ماحول بنایا جائے کہ شادی آسان اور زنا مشکل ہو جائے۔(النساء -۴: ۱۲۷؛ النور-۲۴:۳۲، ۳۳، ۶۰)

۵- غضِ بصر اور حجاب کی پابندی ہو (۳۴)۔

۶- مرد و عورت کے اختلاط پر پابندی ہو بلکہ ہر دو نوجوانوں کی خلوتوں پر پابندی ہو۔

۷- ایک دوسرے کے گھر جانے، بازار جانے اور سفر میں قرآنی احکام، اخلاق اور عفت و پاکدامنی کا پورا خیال رکھا جائے۔

۸- ایمان باللہ اور ایمان بالآخرہ پر مبنی معاشرہ کے قیام کی مخلصانہ کوششیں ہوں۔

۹- نوجوانوں کو تعمیری کاموں میں لگایا جائے اور ان کو جفاکشی کا عادی بنایا جائے۔

۱۰- خدمتِ خلق، عفت و پاکدامنی، ایثار و قربانی، تقویٰ و تزکیہ جیسی اعلیٰ اقدار کی تربیت گود سے گور تک ہر شخص کے لیے لازمی ہو وغیرہ۔ یہ قرآن حکیم کے اس جامع لائحہ عمل (Holistic approach) کی ایک مثال ہے۔ ان قرآنی تعلیمات کے جزوی عمل سے ہی جو خوش آئند نتائج آج بھی دنیا میں برآمد ہو رہے ہیں وہ ہمارے نکتہ کی حقانیت کی ادنیٰ دلیل ہیں۔

۲۲- پائیدار امن و امان اور بے لاگ انصاف:

قرآنی تعلیمات کا پائیدار امن کے تعلق سے جو رویہ (Stand) ہے وہ اس امر سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ قرآن جس دین کا علمبردار ہے اس کا نام اسلام اور اس کے ماننے والے مومنین کہلاتے ہیں۔ اسلام (س، ل، م) سَـلَـمَ سے ہے جس کے تمام استعمالات میں سلامتی، جھکنا، امن وغیرہ مفاہیم لازمی ہیں اور ایمان میں امن کا پہلو نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں ایک اسم ''السلام'' اور دوسرا ''المومن'' ہے (۳۵)۔

اور اسلام کا شعار آپس میں سلام کرنا (۳۶) یعنی سلامتی کی دعا کرنا ہے اس کی جنت کا ایک صفاتی نام ''دارالسلام'' (۳۷) یعنی سلامتی کا گھر بھی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید جس بے لاگ انصاف کا علمبردار ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ وہ سیکڑوں بار انصاف کو یاد دلاتا ہے اور دشمنوں کے معاملہ میں خصوصاً اور اپنے عزیز و اقارب اور اپنے نفس تک کے لیے انصاف پر عمل پیرا ہونے کی بات کرتا ہے۔

۲۳- دنیا اور آخرت کی زندگی میں بہترین توازن کا حامی:

قرآن مجید حالاں کہ ایک مذہبی کتاب ہے جہاں دنیا کی زندگی ایک دھوکہ کی ٹٹی مانی جاتی ہے۔ اس کے باوجود قرآنی تعلیمات میں ترک دنیا کو پسند نہیں کیا جاتا اور نہ دنیا کے حصہ کو بھلا دینے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نہ حکمرانی و بادشاہت دنیاداری ہے کیوں کہ ایک نہیں تین تین انبیاء حکمراں و بادشاہ ہوئے ہیں اور ہمارے آقا اور نبی آخرالزماں محمد رسول اللہ ﷺ بھی مدینہ کی ہجرت کے بعد حکمرانی کے منصب پر فائز تھے اور اللہ تعالی نے آپ کو سُلطَانًانَّصِیرًا (بنی اسرائیل-۱۷:۸۰) کی دعا کروائی تھی۔ مخالفین انبیاء کا ایک بڑا اعتراض یہ رہا ہے کہ وہ کھاتے، پیتے، بیوی و اولاد رکھتے اور بازاروں میں جاتے ہیں (الفرقان-۲۵:۷)۔ ان تمام حقائق کو مانتے ہوئے ہمیں یہ بتانا ہے کہ مؤمن کا نصب العین دنیا نہیں بلکہ آخرت کی کامیابی قرار پاتا ہے (آل عمران-۳:۱۸۵) اور اس طرح اسلام بہترین توازن کا علمبردار ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم مومنوں کی یہ صفت قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے رب سے دنیا اور آخرت دونوں کی حسنات اور بھلائیوں کے حصول کی دعا کرتے ہیں۔

۲۴- حرمت جان، مال و آبرو اور توقیر محنت و فن:

قرآن کریم سے بڑھ کر انسانی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی علمبردار اور محنت و فن کی توقیر کرنے والی کوئی مذہبی کتاب نہیں۔ وہ انسانی جان کو کتنا محترم قرار دیتا ہے اس کے لیے دو چیزوں پر غور کیجئے اولاً یہ کہ وہ کہتا ہے کہ جس نے کسی ایک جان کو ناحق مارا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو مار دیا اور جس نے ایک شخص کو زندگی بخش دی تو گویا اس نے دنیائے انسانیت کو حیات بخش دی (۳۸)۔ دوسرے یہ کہ وہ کہتا ہے کہ آدم کے رب

نے اس میں اپنی روح پھونکی ہے(۳۹)۔اور جان اللہ کی امانت ہے نہ صرف ہمیں دوسروں پر ہاتھ اٹھانے کا حق نہیں بلکہ اپنی جان تک کو لینے کا ہمیں حق نہیں دیا گیا ہے۔ایک بچہ جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہے جس دن سے اسے جاندار تسلیم کیا جاتا ہے اسی دن سے وہ محترم ہے اور اس کے اسقاط کی اجازت نہیں دی جاسکتی الا یہ کہ اس کی ماں کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائے کہ اب ماں کی جان کو ترجیح دی جائے گی۔اسی طرح مال اور آبرو کا معاملہ ہے کسی بھی شخص کے مال پر ناجائز قبضہ کر لینا گناہ کبیرہ میں سے ہے اور اپنے مال کی حفاظت فرض ہے یہاں تک کہ اگر کوئی مومن اس کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے تو وہ شہید ہے۔کسی صنعت وحرفت کو سیکھنا باعث ثواب اور محنت ومزدوری کرنا باعث رضائے الٰہی ہے۔حلال روزی کی تلاش کو اللہ کے فضل کی تلاش کہا گیا (الجمعہ-۶۲:۱۰)۔قرآن مجید کی رو سے کوئی جائز پیشہ چھوٹا یا بڑا نہیں اور ان کا اتنا احترام ولحاظ رکھا گیا کہ ان کی بنیاد پر تعارف و پہچان کو صحیح و جائز تسلیم کیا گیا۔

۲۵- للہ فی اللہ کا فلسفۂ نیت وعمل:

ہندو مذہب میں کرما (karma) کے فلسفہ کی بڑی دھوم ہے،اس کے مقابلہ میں قرآن پر مبنی للہ فی اللہ اور لوجہ اللہ کا فلسفہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی عمل کرو اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرو، دنیا میں اجر کی ذرہ برابر تمنا نہ کرو۔اسی وجہ سے مسلمان آج بھی ساری دنیا میں سب سے زیادہ مطمئن لوگ ہیں۔اسی طرح قرآن کریم اللہ تعالیٰ پر توکل کا حکم دیتا ہے مگر قرآن کریم کا یہ فلسفہ بھی ہے کہ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔''لیس للانسان الا ماسعی ''(النجم-۵۳:۳۹)لہٰذا انسان کو کوشش ومحنت کرتے رہنا چاہیے کیوں کہ اس کو اس کی سعی کے بقدر ہی ملے گا۔

۲۶- خدا اور انسان پر مبنی دومحوری (Bi-centric) تعلیمات:

قرآنی تعلیمات ایک طرف مذہبی پہلو سے خدا کے گرد اور ہدایت کے پہلو سے انسان کے گرد گھومتی ہیں۔یہ دومحوری تعلیمات اُن اعتدال وتوازن کی ضامن ہیں جن سے عام مذاہب اور دنیوی فلسفے دونوں ہی تہی دامن ہیں۔انسان اپنے رب سے تعلق قائم

کر کے روحانی عروج حاصل کرتا ہے اور قرآن انسان کی فلاح وکامیابی ہی کو بنیاد بنا کر سب کچھ کہتا ہے تو انسان اس میں اپنا ذکر پا کر اور اپنی اہمیت کو دیکھ کر آسانی سے اس کی طرف متوجہ اور متأثر ہو سکتا ہے۔

۲۷- عام فہم اور جامع:

قرآن کریم کی تعلیمات کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی تمام تعلیمات عام فہم اور سادہ زبان میں پیش کی گئی ہیں جب کہ یہ بہت گہری اور با معنی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کے بڑے مسائل، کائنات کے حقائق اور فلاح وخسران کا فلسفہ بلکہ سارے احکام وتعلیمات بہت ہی جامع انداز میں چند جملوں میں سمیٹ دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم انسانی فلاح وخسران کے فلسفہ کو قرآن میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس میں متعدد جگہ زیر بحث رہا ہے اور ہر جگہ قرآن مجید کا اسلوب اور استدلال قاری کے ذہن پر ایک اچھا نقش قائم کرتا ہے۔ ہم یہاں قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورتوں میں سے ایک یعنی تین آیات پر مشتمل سورہ العصر (سورہ:۱۰۳) کی تعلیمات کو پیش کریں گے۔ فرمایا گیا ''عصر کی قسم (یعنی روبہ غروب تہذیب انسانی گواہ ہے کہ) انسان گھاٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے اور (اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ) حق کی وصیت اور صبر کی تلقین (بھی) کرتے رہے۔

۲۸- فرد و معاشرہ دونوں کی اہمیت:

قرآن حکیم فرد و معاشرہ دونوں کی اصلاح پر یکساں توجہ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم پھر اسی چھوٹی سورہ العصر کو لیتے ہیں۔ جس میں پہلی دو آیات تو تاریخ انسانی کی گواہی پیش کرتی ہیں کہ بیشتر انسان اس دنیا میں خسارہ میں رہے سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے انفرادی سطح پر بھی ایمان وعمل صالح کو اختیار کیا اور اجتماعی سطح پر بھی حق کی تلقین اور صبر کی وصیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں پر توجہ دلانا مقصود ہے کہ جن لوگوں نے انفرادی طور پر تو ساری شرائط پوری کر دیں مگر اجتماعی سطح پر تواصی حق وصبر کے طریقہ پر کاربند نہ رہے وہ بھی پائدار فلاح وکامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکے اور جنھوں نے اجتماعی سطح پر ہر طرح کی نیک

تگ ودو کی مگر خود کو نہ سنوارا یا ایمان وعمل صالح کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھا وہ لوگ تو بہر حال ناکام ہوں گے ہی اور ماضی میں بھی ایسے لوگ ناکام ہی رہے ہیں۔

۲۹- امتِ مسلمہ کا پیغمبرانہ مشن:

قرآن مجید کی متعدد آیات اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ یہ کتاب حضور نبی اکرم محمد ﷺ پر نازل کردہ آفاقی، آخری اور مکمل ہدایت نامہ ہے لہٰذا منطقی طور پر اب کوئی رسول ہدایت ربانی لے کر اس دنیا میں نہیں آئے گا اور یہ بات بھی منطقی طور پر سمجھ میں آتی ہے اور رب کریم کی رحمت کا تقاضہ ہے کہ ترسیل ہدایت کا کام قیامت تک ہوتا رہے۔ اب یہ کام کون کرے اس کا جواب قرآن حکیم یہ دیتا ہے کہ اب تم اے امت محمدؐ یہ وہ بہترین امت ہو جس کو عوام الناس کی رہنمائی کے لیے تیار کیا گیا اور نکالا گیا ہے اور تم دنیائے انسانیت کے سامنے بھلائی کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے پر مامور کیے گئے ہو (۴۰)۔ یہ پیغمبرانہ مشن ہے جو امت مسلمہ کو سونپا گیا ہے اسی لیے امت محمدؐ یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو امت وسط (۴۱) بھی کہا گیا ہے یعنی شہادت حق کا جو فریضہ نبی آخر الزماں ﷺ نے ادا کیا تھا اب یہ امت اس کو ادا کرے اور یوم حساب اس کی گواہی قابل قبول ہو۔

۳۰- قرآن حکیم کی متنی ترتیب میں آفاقیت پوشیدہ:

امت مسلمہ کا ہر پڑھا لکھا بچہ جانتا ہے کہ حضور نبی اکرم محمد ﷺ کو کلمۂ اقرأ (۴۲) سے خلعتِ نبوت عطا کیا گیا اور اس کے بعد ''یا ایھا المدثر قم فانذر'' سے آپ کا انبیائی اور قرآنی مشن عملی طور پر شروع ہوا جو زمان ومکان کے تقاضوں کے تحت وحی ربانی کی روشنی میں آگے بڑھتا گیا اور تیئس سال کی قلیل مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس انبیائی مشن کی کڑیاں قرآن مجید کی نزولی ترتیب سے براہ راست جڑتی ہیں کیوں کہ حضور نبی اکرم وحی الٰہی کی روشنی میں ہی دعوت کے فریضہ کو انجام دے رہے تھے اور آپ کو ہر گھڑی نئی قرآنی کمک کی ضرورت ہوتی تھی۔ البتہ یہ حقیقت بھی سب ہی کے سامنے عیاں ہے کہ قرآن مجید کی مصحفی ترتیب جو لاریب اللہ اور اس کے رسول ہی کی بتائی ہوئی ہے اُس نزولی ترتیب سے مختلف ہے یعنی سب سے پہلے سورہ الفاتحہ پھر سورہ البقرہ پھر سورہ آل عمران، النساء اور

المائدہ اسی ترتیب میں قرآن مجید میں ہم پاتے ہیں۔سورہ الفاتحہ کے بعد کی چاروں سورتیں متفقہ طور پر مدینہ منورہ کی نبوی زندگی میں حضور نبی اکرم پر نازل ہوئیں۔اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نازل تو ہونا شروع ہوا اقرا باسم ربك الذی خلق (العلق-۹۶:۱-۵) سے اور پھر حضور کو رسالت کے فریضہ کے لیے کھڑا کیا گیا یا ایھا المدثر قم فانذر (المدثر-۷۴:۱-۲) سے۔لیکن سب سے پہلی وحی مصحف کے آخری پارے میں اور دوسری تیسری وحی انتیسویں پارے میں جگہ پائیں۔اس کی عظیم حکمت پر تو کوئی دورائے نہیں ہاں البتہ توجیہ کے بارے میں دورائے کا امکان ہے اس مصحفی ترتیب کے بارے میں جو سب سے قوی رائے ہے وہ یہ کہ نزولی ترتیب سے حضور نبی اکرم کے زمان ومکان (Given time space) میں یعنی آپ کے انبیائی مشن میں رہنمائی فراہم ہوئی لیکن آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں اس وجہ سے آپ کے بعد سے قیامت تک بھی خدائی رہنمائی کی ضرورت تھی لہٰذا قرآن کریم کی مصحفی ترتیب میں وہ خوبی رکھی کہ وہ قیامت تک کتاب ہدایت رہے اور اس میں لوگوں کے مسائل کا بہترین حل ہو۔بالفاظ دیگر قرآن کریم کی متنی ترتیب میں ہی اس کی آفاقیت (Universality) پوشیدہ ہے یعنی قرآن مجید مصحفی ترتیب کے ذریعہ حصول ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے زمان ومکان سے مبرا کر دیا ہے اور قرآنی ہدایت ہمہ گیر اور آفاقی ہو جاتی ہے۔

۳۱- آخرت میں اعمال اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوں گے:

قرآن مجید نہ صرف اخروی زندگی کو دنیا کی زندگی کا تسلسل اور تتمہ کہتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ انسانی زندگی کے اعمال کی حقیقت اُس لامحدود اور اس ناقص دنیا کے بالمقابل کامل دنیا میں کُھلے گی کیوں کہ انسان چاہتا ہے کہ اس کو مکمل انصاف ملے۔ذرا سوچیے کہ اگر کسی ظالم نے کسی خاندان کے پانچ افراد قتل کر دیے اور کسی دوسرے ظالم نے کسی ایک فرد کو قتل کیا تو اس دنیا کی عدالت دونوں ظالموں کو زیادہ سے زیادہ پھانسی کی سزا دے گی مگر انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ پانچ افراد کے قاتل کو اس سے پانچ گنا زیادہ سزا ملتی مگر اس دنیا میں یہ ممکن نہیں لہٰذا ایک ایسی دنیا کی ضرورت ہے جہاں انصاف کے

تمام تقاضے بلا کم و کاست پورے ہوسکیں۔اسی طرح یہاں اعمال کی حقیقت کو پردوں میں رکھا گیا ہے اس لیے بھی کہ ہمارا امتحان مقصود ہے اور اس وجہ سے بھی کہ یہ دنیا اس قابل نہیں ہے کہ اپنے تمام راز و حقائق سے پردہ کشائی کر سکے لہٰذا ان تمام محدودیتوں اور نقائص سے پاک ایک دنیا انسانی فطرت کی آواز ہے جس کو پورا کرنا اس منصف حقیقی اللہ تعالی کا کام ہے۔.یہی بات قرآنی تعلیمات سے نکلتی ہے کہ وہاں نہ صرف مکمل انصاف ملے گا بلکہ ہر شخص کو اس معاملہ میں کوئی شک بھی نہ رہے گا۔یہ بات بظاہر بہت سادہ لگتی ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے ضرورت ہے کہ یوم الحساب میں پہلے ہر انسان کو اس کے اعمال کی اصل و شکل دکھادی جائے اور اس کے اعمال کے تسلسل سے بھی روشناس کر دیا جائے اور پھر اس کو بتایا جائے کہ تمہارے ساتھ ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا (الزلزال-۹۹:۶-۸)۔مثال کے طور پر ہم ابولہب کی بیوی کی اخروی سزا کو لیتے ہیں ۔وہ اس دنیا میں اپنے شوہر کے ابلیسی مشن کو ایندھن فراہم کر رہی تھی اور حضور نبی اکرم کے انبیائی مشن کے خلاف آگ بھڑکا رہی تھی تا کہ اللہ تعالیٰ کا غیظ و غضب اس کے خلاف بھڑکے۔اخروی زندگی میں بھی وہ جہنم کے لیے ایندھن فراہم کر رہی ہوگی (۴۳) تا کہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی مظہر جہنم اس ایندھن سے مزید بھڑکے۔اس دنیا میں اس نے ایندھن اور آگ کے سامان کیے آخرت میں وہی ایندھن اور آگ حقیقی شکل اختیار کر کے اس کے لیے انصاف کے تقاضے پورے کریں گے۔اسی طرح نیک اعمال منور ہوکر جنت کی طرف رہنمائی کریں گے جب کہ منافق اندھیروں میں بھٹک رہے ہوں گے (الحدید-۵۷:۱۲-۱۳)۔

۳۲- قرآنی فلسفہ مشیت وشریعت:

قرآنی تعلیمات ہمیں سکھاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو بالکلیہ اپنے دستِ قدرت میں رکھا ہے تا کہ یہاں نظم و توازن قایم رہے جب کہ انسان اس نظام کو بگاڑنے پر تلا ہوا ہے، اسی طرح نظام ہدایت و ضلالت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے جس پر وہ پورے عدل وانصاف کے ساتھ عمل پیرا ہے۔یہ دونوں امور اس کے نظامِ مشیت کے اجزا ہیں۔اس نظام کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور کتب الٰہی کو بھیج کر اپنے نظام رضا

کو اپنے بندوں کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ اس کے نظام رضا و شریعت کو اختیار کر کے اپنی فوز و فلاح کے سامان کریں ان دونوں نظاموں کے درمیان انسانی ارادہ و اختیار کی محدود آزادی دی گئی ہے جس میں امتحان ہو رہا ہے کہ وہ کس حد تک اللہ تعالیٰ کے نظام رضا و شریعت پر مخلصانہ عمل کرنا چاہتا ہے۔ یہ امتحان اس کے عقل و علم کا ہے۔ اس کی نیت کا ہے، اس کے ضمیر کا ہے۔ اب اگر ایک شخص اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف، ظلم و تعدی، زنا و چوری، جھوٹ و فریب، عبادات میں پہلوتہی وغیرہ کرنا چاہتا ہے اور اس کا رب اس کی نیت و ارادہ کی رعایت رکھتے ہوئے اپنے نظام مشیت کے بندھنوں کو ڈھیلا چھوڑ دے تو وہ یہ کام کر گزرے گا ورنہ نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جس کے لیے جس وقت جتنا چاہتا ہے اور جب تک چاہتا ہے ڈھیل چھوڑ دیتا ہے تاکہ انسانی امتحان کے تقاضے پورے ہوں اور وہ آسانی سے خدائی جال اور گھات میں آ جائے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کو غالب کر کے اپنے بندوں کو جہنم سے بچانا بھی چاہتا ہے اور دنیا میں فساد کو روکنا بھی چاہتا ہے مزید یہ کہ ہر طرح سے ان کے لیے ہدایت کے راستے کھولتا بھی ہے تاکہ ان کو کسی عذر کا موقع نہ رہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اگر کوئی مومن اپنے رب کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کسی کام کا عزم مصمم و مخلصانہ ارادہ کر لیتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں نیک اجر لکھ دیا جاتا ہے چاہے اللہ تعالیٰ اپنی کسی عظیم مصلحت اور مشیت کے تحت عمل کا موقع نہ فراہم کرے۔

۳۳- احترام نفس اور آداب تخلیہ و مجالس:

قرآن کریم انسانی نفس کی نشو و نما اور اس کے تزکیہ و طہارت کا علمبردار ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی کی عزت نفس کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔ کوئی اس کا مذاق نہ اڑائے، تحقیر نہ کرے، عیب چینی، غیبت، بدگمانی اور تجسس بے جا نہ کرے (الحجرات-۴۹: ۱۰-۱۳)۔ اسی طرح قرآن تخلیہ و مجلس کے احکام قایم کرتا ہے۔ وہ فرد کے قلب کو مطہر و منور اور معاشرہ کو پر امن اور نورانی بنانا چاہتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کا تو معاملہ یہ ہے کہ وہ نفس انسانی کے آرام و آرائش مثلاً نیند، زینت، مرغوبات وغیرہ کی جائز حدود میں ادائیگی کو اس کا حق قرار دیتا ہے مزید برآں قرآنی تعلیمات میں چھوٹوں کے ساتھ محبت و شفقت اور بڑوں کے ساتھ ادب

واحترام اور ہر ایک کے ساتھ بلند اخلاق کے مظاہرہ کا حکم ملتا ہے۔ اس کی تعلیمات میں طہارت و پاکیزگی کا ایسا جامع مفہوم ہے کہ دنیا کی کسی بھی تہذیب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح تزکیہ نفس میں جن مثبت اوصاف کی آبیاری کا تصور ہے اس سے مہذب قومیں آج بھی تہی دامن ہیں۔ جب کہ قرآن کریم کے نصاب تربیت میں تزکیہ وطہارت دونوں کو یکساں مقام دے کر فرد معاشرہ اور منفی ومثبت عوامل دونوں کا شایان شان لحاظ رکھا گیا ہے۔

۳۴- مکمل انقلاب کا نقیب:

قرآنی تعلیمات کی ایک امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے مکمل انقلاب کی نقیب وعلمبردار ہیں اور اس کا عملی خاکہ بھی پیش کرتی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید جسم وروح کی احتیاجات کا ذکر کر کے ان کو بہترین طور پر پورا کرنے کا اور فرد ومعاشرہ دونوں کی مستقل حیثیت تسلیم کر کے ان کے بارے میں انقلابی اقدام کا داعی ہے۔ مزید برآں وہ قانون واخلاق دونوں محرکات عمل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے یہاں عقیدہ وعمل دونوں کا مقام ہے۔ ان کے علاوہ فطرتِ انسانی کے سلبی وایجابی دونوں پہلوؤں کی رعایت سے بات کرتا ہے لہٰذا خوف ولالچ کے داعیات کو برمحل استعمال کرتا ہے مثلاً جنت کے لالچ اور جہنم کے خوف کو انقلاب حیات اور فلاح آخرت کے حصول میں حسب ضرورت وزن دیتا ہے۔ وہ اعمال کے سنوارنے میں ایمانی واخلاقی مہمیز لگاتا ہے اور مطلوبہ کردار پیدا کرنے میں روزانہ احتساب کا داعی ہے (۴۴)۔ اور مؤمن سے سبقت فی الخیرات اور ارتقاء فی الایمان والعمل کی اپیل کرتا ہے۔

۳۵- عملی ترجیحات طے کرنے کی ترغیب:

قرآنی تعلیمات کا ایک اور وصف یہ ہے کہ وہ بندگان خدا کو نہ صرف اچھا انسان اور سچا مسلم بنانا چاہتی ہیں بلکہ بہت اچھا اور صالح مسلم بنانا چاہتی ہیں۔ اسی لیے وہ ایمان والوں سے ہر ہر گھڑی میں عموماً اور زندگی کے ہر اہم موڑ پر خصوصاً ٹھہر کر یہ سوچنے کی دعوت دیتی ہیں کہ کون سا عمل ان کے لیے بہتر ہے اور چاہتی ہیں کہ وہ اس خاص حالت میں بہترین عمل کا انتخاب کریں۔ اسی لیے قرآن کریم اعمال کی درجہ بندی کا قائل ہے (۴۵)۔

اور خود بھی ایک بنیادی درجہ بندی کرتا ہے۔ انہیں تعلیمات کی روشنی میں علماء وفقہاء اسلام نے فقہ کی تشکیل کر کے عام حالات میں اعمال کی درجہ بندی کی اصطلاحیں وضع کیں مثلاً فرض، واجب، سنت، مستحب، مباح، مکروہ تنزیہی، مکروہ تحریمی اور حرام۔ چوں کہ ہر گھڑی مسلمانوں کو مختلف اعمال (Options) میں سے کسی ایک عمل کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ اس کو معلوم ہو کہ اعمال کی بنیادی درجہ بندی میں ہر عمل کا کیا مقام ہے دوسرے یہ کہ اس کے اپنے مخصوص حالات میں اس موقع پر بہترین عمل اس کے لیے کیا ہوسکتا ہے۔ مثلاً جہاد اور نماز کی بنیادی اہمیت اور فرضیت سے کون انکار کرسکتا ہے اب جہاد کسی ایسے شخص کے لیے جو اپنی ماں کا اکیلا خدمت گار ہے یا نماز با جماعت سے کسی مریض کی تکلیف بڑھنے کا اندیشہ ہے تو نماز و جہاد کو مؤخر کیا جاسکتا ہے یہ بھی قرآن وسنت کی روشنی میں جائز ہے۔ البتہ ہر فرد کا کسی جگہ اور خاص حالت میں اللہ ورسول کی دی گئی تعلیمات وترجیحات کی روشنی میں اپنے لیے کسی عمل کا انتخاب کرنا اور معروضیت (Objectivity) کو حتی المقدور قایم رکھنا ہی اہم ہے اور اسی فیصلہ میں ہر شخص کا بڑا امتحان ہے۔ اس فیصلہ کے بعد ہی عمل کا مرحلہ ہے تو جو جس حد تک اپنے فیصلہ میں معروضیت اور دین کے معاملہ میں عزیمت کو پسند کرے گا اور اپنی سعی وجہد کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہ میں ڈال دے گا اتنا ہی زیادہ حقیقی فوز وفلاح کا مستحق قرار پائے گا۔

۳۶- جہاد کیا اور کیوں:

آج کل دنیا میں ایک اسلامی اصطلاح جہاد خصوصاً موضوع بحث بنی ہوئی ہے اور جہاد اسلامی کو دہشت گردی سے جوڑا جارہا ہے جب کہ اسلامی جہاد کا دہشت گردی سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ قرآنی تعلیمات میں جہاد اس پاکیزہ جدوجہد کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے نیز شریعت کے اصولوں کے مطابق کی جاتی ہے۔ یہ جدوجہد تین بڑے دشمنوں کے خلاف کیا جانا ہی جہاد کے زمرہ میں آتا ہے۔ اس کا پہلا دشمن خود اس کا سرکش نفس ہے جو اُسے برائیوں پر اُکساتا ہے اس کے خلاف اپنی توانائیاں خرچ کرنا جہاد ہی نہیں بلکہ جہاد اکبر ہے۔ دوسرا دشمن دنیا کا طاغوتی نظام،

اسلام دشمن طاقتیں، حکومتیں اور منظّم گروہ ہیں جن کے مقابلہ میں منظّم جدوجہد کرنا اسلامی جہاد سے عبارت ہے۔ تیسرا دشمن خود ابلیس لعین ہے جو انسانوں کی شکل میں بھی آتا ہے اور انسانی جسم میں خون کے ساتھ تیرتا ہے۔ ان تینوں دشمنوں کو خود پر غالب نہ ہونے دینے کی سعی وجہد اور اپنی پوری قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قلب ولسان اور ہاتھ واسلحہ نیز قرآن کے ذریعہ (۴۶) حتی المقدور کوشش کرنا جہاد کہلاتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبہ کی خواہش وجذبہ اور اس کی رضا کا حصول ہی اصل ہے۔

۳۷- مکمل وفاداری اور غیر مشروط بندگی رب:

قرآن مجید کی ایک واضح آیت کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور جن در اصل عبادت رب کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں (۴۷)۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ہر وقت حالت نماز، حالت روزہ اور حج کے طواف اور اعتکاف کی حالت میں رہے اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کلی طور پر اللہ کے حضور سر تسلیم خم کردے اور اس سے سچا عہد وفا باندھ کر اس کا شعوری طور پر غلام بن جائے۔ اور زندگی کے ہر لمحہ میں گویا "لبیک اللھم لبیک" حاضر ہوں میرے رب میں حاضر ہوں، والی حالت پیدا ہو جائے۔ اس کا بہترین نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی تھی کہ حکم بھی نہیں ملا بلکہ خواب ہی دیکھا مگر اپنے اکلوتے بیٹے اور لخت جگر کو قربان کرنے کے لیے حلقوم پر چھری رکھنے تک ہر عمل کو پوری دلجمعی سے کر گزرے (۴۸)۔ یہ ہے غیر مشروط بندگی رب اور مکمل وفاداری کا ایک عملی نمونہ۔ اسی لیے قرآن مجید میں "ابراھیم الذی وفی" (النجم-۵۳:۳۷) کہا گیا اس بندگی رب کی تفصیل یہ ہے کہ عبادات کے وقت پورے آداب واہتمام اور جملہ شرائط کی ادائیگی کے ساتھ عمل عبادت بجالانا اور اس میں سرتاپا عجز وانکسار بنے رہنا۔ اور ہر وقت دعا، تسبیحات اور استغفار کے ذریعہ اپنے قلب ولسان کو ذکر الٰہی سے تروتازہ رکھنا اور اللہ کی مرضیات کی ادائیگی میں سبقت کا جذبہ بیدار ہو جانا بلکہ پوری زندگی میں اللہ کے رنگ (۴۹) میں رنگ جانا ہی مطلوب ہے۔

۳۸- تعلیم و تعلم کا علمبردار:

قرآنی تعلیمات میں علم کا حصول کیا مقام رکھتا ہے وہ حضور نبی اکرم پر پہلی وحی میں رب اکرم کے تعارف کے ساتھ اس کا ذکر کرنے اور پڑھو پڑھو کی تکرار سے ثابت ہوتا ہے(العلق-۹۶:۱-۵)۔اسی طرح قرآنی آیات شاہد ہیں کہ وہ ظن وقیاس اور توہمات سے نفرت کرتا ہے اور اس کے نزدیک علم والے اور علم نہ رکھنے والے برابر نہیں ہو سکتے (الزمر-۳۹:۹) وہ سات سو چھپن قرآنی آیات کے ذریعہ کائنات کے اسرار ورموز اور معرفت اشیاء ومعرفت خداوندی کے حصول کی دعوت دیتا ہے۔اس کے نزدیک ہر علم محمود ہے بشرطیکہ وہ کائنات کے حقائق کی معرفت سے آشنا کرادے اور وہ انسانیت کے لیے نافع ہو اور ہر علم مذموم ہے اگر رب کائنات کی معرفت وبندگی کے حصول میں آڑ بن جائے یا علم نافع نہ ہو۔

۳۹- اہل ایمان میں احساس امانت وذمہ داری کا مطالبہ:

قرآن مجید دنیا میں ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ برپا کرنا چاہتا ہے جس کا ہر فرد احساس ذمہ داری سے سرشار ہو اور ان میں ایسا اتحاد واتفاق پایا جاتا ہو کہ گویا وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں۔ان کے درمیان شیطان کوئی ایسا حربہ نہ پھینک سکتا ہو کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے اوپر انگلی اٹھا سکیں۔مثال کے طور پر قرآنی معاشرہ افواہوں کے پھیلانے میں مدد وتعاون نہیں کر سکتا اور نہ کسی انجانے غیر ثقہ شخص کی اہم خبر کو بلا تحقیق مان سکتا ہے(۵۰)۔ اگر جنگی حالات ہوں تو تناؤ کی کیفیت فطری ہے۔ایسے حالات میں خصوصا افواہوں کو کسی طرح پھیلنے نہ دیں اور ذمہ دار لوگوں تک پہنچا کر خاموش ہو جائیں (۵۱)۔اسی طرح کسی راز کی بات کا افشا نہ کریں کہ راز بھی ایک امانت ہوتا ہے۔

۴۰- اس قرآن میں تمہارا (اور تمہارے عز وشرف کا) ہی ذکر ہے:

قرآن مجید کی بہت ہی اہم اور دل لگتی حقیقت یہ ہے کہ وہ بتاتا ہے کہ اے بندگان خدا اس کتاب الٰہی میں تمہارا ہی ذکر (۵۲) اور تمہارے عز وشرف کا ہی تذکرہ ہے۔ تمہارے ہی درمیان اور تم میں سے ہی انسانیت کے گل سرسبد اور عباد الرحمٰن اسی کتاب پر

ایمان لا کر وجود میں آرہے ہیں۔تم سے پہلے اس دنیا میں سیکڑوں انبیاء کرام آئے جن میں سے بعض کی نورانی زندگی کے واقعات اس کتاب میں ہیں۔ دراصل اس کتاب میں تمہارے ہی عروج وزوال کی داستان ہے۔تمہاری ہی کامیابی وناکامی، فلاح وخسران، بھلائی وبرائی کے تذکرے ہیں۔ یہ تمہاری ہی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ ہی خصوصی بھلائی وکرم کا معاملہ کیا کہ تمہیں صراط مستقیم اور جنت کا راستہ دکھایا لہٰذا تم اس عظیم نعمت کی قدر کرو۔

خلاصہ کلام:

قرآن کریم کی امتیازی تعلیمات کے یہ چالیس نکات ہر قاری کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب سے زندہ تعلق اور سچی وابستگی اختیار کرے یعنی خود اس پر سچا ایمان لائے۔ اس کتاب کی تلاوت کرے، یا اس کے معانی کو سمجھے،تعلیمات قرآنی اوران کی حکمتوں کو سمجھ کر اپنے قلب کو منور کرے اوران پر عمل کرے نیز اس کی اشاعت کرکے اپنے لیے جہنم سے نجات اور جنت کے دخول کی ضمانت حاصل کرے۔

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ اس ذکر الٰہی کو سُن اور پڑھ کر اللہ کے بندوں کے دل نرم ہوں اوران کے رونگٹے کھڑے ہوں (۵۳)۔کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ اس عظیم نعمت الٰہی پر وہ سچی خوشی منائیں (۵۴) اور فرط عقیدت ومحبت میں اپنے پلکوں پر آنسو سجائیں۔کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہم اپنے رب سے تجدید عہد کریں اوراس سے پھر عہد وفا باندھیں۔کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہم اپنے رب کی پکار پر لبیک کہیں۔

ہمارے رب نے ہمارے لیے فلاح دارین کا بہترین نسخہ طریقہ اور جملہ امراض انسانی کا نسخۂ شفا بھیج دیا ہے(۵۵)۔ہمیں آگے بڑھ کر اس کو لے لینا ہے اواس کے مطابق اپنی زندگی کو سنوارنا ہے۔ جب تک ہم قرآن کریم کی طرف اپنے ہر معاملہ میں رجوع نہیں کریں گے تب تک ہمیں اپنے مسائل کا پائدار وحقیقی حل بھی نہ مل سکے گا اور آخرت میں ہماری کامیابی کی امید بھی حق بجانب نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق سمجھنے اوراس پر عمل کرنے کی اور باطل کو برا سمجھنے اوراس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

حواشی

۱- المائدہ-۵:۴۸
۲- الحجر-۱۵:۹؛ یوسف-۱۲:۱۰۴؛ المؤمن-۴۰:۵۴؛ الدہر-۷۶:۲۹
۳- آل عمران-۳:۱۹۰-۱۹۴
۴- الصّٰفّٰت-۳۷:۳۵؛ محمد-۴۷:۱۹
۵- الفتح-۴۸:۲۹
۶- المائدہ-۵:۳
۷- البقرہ-۲:۳
۸- الذاریات-۵۱:۵۶
۹- الحدیث
۱۰- الحجر-۱۵:۹۸
۱۱- الصّف-۶۱:۲
۱۲- النساء-۴:۱
۱۳- الحجرات-۴۹:۱۳
۱۴- الحجرات-۴۹:۱۰
۱۵- المعارج-۷۰:۲۴-۲۵؛ الدھر-۷۶:۸-۹؛ البلد-۹۰:۱۳
۱۶- النساء-۴:۸۵، ۹۸، ۱۲۸
۱۷- البلد-۹۰:۱۳؛ البقرہ-۲:۱۷۷؛ التوبہ-۹:۶۰
۱۸- النساء-۴:۹۲؛ المائدہ-۵:۸۹؛ المجادلہ-۵۸:۳
۱۹- النساء-۴:۲، ۳، ۶، ۱۰، ۳۶؛ بنی اسرائیل-۱۷:۳۴؛ البلد-۹۰:۱۵؛ الضحیٰ-۹۳:۹؛ الماعون-۱۰۷:۲

۲۰- الحدیث

۲۱- المائدہ-۵:۳

۲۲- الاحزاب-۳۳:۲۱

۲۳- آل عمران۳:۸۵؛النساء-۴:۱۷۰؛المائدہ-۵:۱۵-۱۶

۲۴- التغابن-۶۴:۹-۱۰

۲۵- الانعام-۶:۱۶۵؛الملک ۶۷:۲؛الدھر-۷۶:۲

۲۶- البقرہ-۲:۱۴۳

۲۷- الفرقان-۲۵:۶۷

۲۸- النساء-۴:۳۶

۲۹- النساء۴:۶۴، ۶۶، ۸۰

۳۰- الاحزاب-۳۳:۲۱

۳۱- النور-۲۴:۲

۳۲- النور-۲۴:۴

۳۳- النور-۲۴:۱۹

۳۴- النور-۲۴:۳۰-۳۱؛الاحزاب-۳۳:۵۹

۳۵- الحشر-۵۹:۲۳

۳۶- النور-۲۴:۶۱؛النساء-۴:۹۴

۳۷- الانعام-۶:۱۲۷، یونس-۱۰:۲۵

۳۸- المائدہ-۵:۳۲

۳۹- الحجر-۱۵:۲۹؛ص-۳۸:۷۲

۴۰- آل عمران-۳:۱۰۴، ۱۱۰

۴۱- البقرہ-۲:۱۴۳

۴۲- العلق-۹۶:۱-۵

۴۳- اللھب-۱۱۳:۴

۴۴- الحشر-۵۹:۱۷

۴۵- التوبہ-۹:۱۹،۱۲۲

۴۶- الفرقان-۲۵:۵۲

۴۷- الذاریات-۵۱:۵۶

۴۸- الصافات-۳۷:۱۰۳-۱۰۵

۴۹- البقرہ-۲:۱۳۸

۵۰- الحجرات-۴۹:۶

۵۱- النساء-۴:۸۳

۵۲- الانبیاء-۲۱:۱۰؛المؤمنون-۲۳:۷۱

۵۳- الحدید-۵۷:۱۶

۵۴- یونس-۱۰:۵۸

۵۵- یونس-۱۰:۵۷

مالی معاملات میں قرآن کے مطالبات

ظفر الاسلام اصلاحی

قرآن کریم کی رہنمائی انسانی زندگی کے جملہ شعبوں کو محیط ہے۔ روزمرہ زندگی سے متعلق اس کی ہدایات وتعلیمات کو جاننا، سمجھنا اور ان پر عمل کرنا دراصل اس کے نزول کے مقصد کو پورا کرنا ہے۔ ہر صاحب ایمان کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ شب وروز بسر کرتے ہوئے قرآن اس سے کیا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں (مذہبی واخلاقی، سماجی معاشی اور سیاسی وانتظامی) سے ہے۔ اس سوال کے جواب سے پورا قرآن بھرا پڑا ہے۔ اس مقالہ میں خاص طور سے مالی معاملات سے متعلق قرآنی مطالبات کی وضاحت مقصود ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں معاشی پہلو یا مالی معاملات کی کافی اہمیت ہے بلکہ یہ دوسرے شعبوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ ان سے متعلق قرآنی ہدایات وتعلیمات کی اہمیت ومعنویت اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہے کہ موجودہ دور میں ان سے بے توجہی وغفلت زیادہ نظر آتی ہے بلکہ یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ ہماری عملی زندگی میں قرآنی احکام کی خلاف ورزی کی زیادہ مثالیں مالی معاملات کے بارے میں ملتی ہیں۔ کسبِ مال میں جائز وناجائز کی رعایت، انفاق فی سبیل اللہ میں مسابقت، مال خرچ کرنے اور وسائل واسباب کے استعمال میں فضول خرچی ونمائش سے اجتناب، خرید وفروخت اور دوسرے معاملات میں دیانت داری، لین دین میں قول وقرار کی پابندی، مال میں مستحقین کے حقوق کی ادائیگی کے باب میں معاشرہ کی جو عام حالت ہے وہ بالکل واضح ہے۔ اس صورت حال میں اس ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ معاشی زندگی ومالی معاملات سے متعلق قرآنی تعلیمات کو بار بار یاد کیا جائے اور دوسروں کو یاد دلایا جائے۔

مال کمانا یا حصول معاش کے لیے کوشش کرنا قرآن کی نظر میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق جان کی حفاظت یا زندگی کے بقا سے ہے جو دین اسلام میں عین مطلوب ہے۔ قرآن کی نگاہ میں معاش کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ

اسے اللہ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور بعض آیات میں مال کو ''خیر'' کہا گیا ہے (البقرہ: ۲۷۲،۲۱۵) قرآن کریم میں جہاں کہیں کسبِ مال یا حصولِ معاش کی ترغیب دی گئی ہے وہاں اس انداز میں خطاب ملتا ہے کہ اللہ کا فضل تلاش کرو۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمِن رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ (القصص:۷۳)

اور اس نے اپنی رحمت ہی سے تمہارے لیے رات و دن کو بنایا ہے کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور تا کہ تم اس کے فضل کے طالب بنو۔

وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِتَبْتَغُوا فَضْلاً مِّن رَّبِّكُمْ (بنی اسرائیل:۱۲)

(اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن بنایا تا کہ تم اپنے رب کے فضل کے لیے کوشش کرو)

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (الجمعہ:۱۰)

(اور جب (جمعہ کی) نماز ختم ہو جائے تو زمین میں بکھر جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ)۔

معاش کو فضل اللہ یا فضل رب کہہ کر قرآن نے انسان کو یہ حقیقت بھی یاد دلائی کہ یہ محض اللہ رب العزت کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اسے بے شمار ذرائع معاش عطا کیے۔ آسمان، زمین و سمندر کو قدرتی وسائل سے مالا مال کیا اور انسان کو ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت بھی بخشی۔ بر و بحر میں سفر کی سہولیات مہیا کیں، ان سب کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی زندگی کی تگ و دو میں اللہ کو یاد کیا جائے۔ مال و اسباب کے حصول پر اس کا شکر ادا کیا جائے اور اسی کی مرضی کے مطابق ان چیزوں کو استعمال کیا جائے۔ بعض آیات میں واضح طور پر ''فضل الٰہی'' نصیب ہونے پر شکر گزاری کی تعلیم دی گئی ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَن يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (الروم:۴۶)

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو (اپنے ابر رحمت کی) خوش خبری دینے والی بنا کر اور تا کہ وہ تم کو اپنی رحمت سے نوازے اور تا کہ کشتیاں اسی کے حکم

سے چلیں اور تا کہ تم اس کے فضل کو تلاش کرو اور شکر ادا کرو)

بلا شبہ مال بھی ایک نعمت ہے، اس کے میسر ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے تو اس میں اور اضافہ ہوگا اور منعم حقیقی سے تعلق مزید مضبوط ہوگا۔ فرمان الٰہی ملاحظہ ہو:

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (ابراہیم:۷)

(اور جب تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں اضافہ کروں گا)

قرآن نے کسبِ مال یا معاش کے لیے جدوجہد کی ترغیب ضرور دی ہے لیکن اس میدان میں انسان کو آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کے کچھ اصول وضوابط مقرر کیے ہیں اور ان کی پابندی کی ہدایت دی ہے۔ حصول معاش کے ضمن میں قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ مال یا سامان حاصل کیا جائے وہ جائز ذریعہ سے ہو اور جو چیز حاصل کی جائے وہ خود پاک ہو نجس نہ ہو۔ یعنی قرآن کی نظر میں یہ مطلوب ہے کہ مال کے حصول کا طریقہ صحیح ہو اور اس کے ذریعہ جو چیز حاصل کی جائے وہ پاک بھی ہو۔ ذیل کی آیات سے یہی سبق ملتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُواْ مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلاَلاً طَيِّباً وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (البقرہ:۱۶۸)

(اے لوگو زمین میں جو حلال و پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے راستہ پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔)

وَكُلُواْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّهُ حَلاَلاً طَيِّباً وَاتَّقُواْ اللّهَ الَّذِيَ أَنتُم بِهِ مُؤْمِنُونَ (المائدہ:۸۸)

(اور جو کچھ اللہ نے تمہیں حلال و پاک روزی دی ہے اسے کھاؤ اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان لانے والے ہو)

فَكُلُواْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّهُ حَلاَلاً طَيِّباً وَاشْكُرُواْ نِعْمَتَ اللّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (النحل:۱۱۴)

(اللہ نے جو چیزیں تمہیں حلال و پاکیزہ دے رکھی ہیں انہیں میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم صحیح معنوں میں اس کی عبادت کرنے والے ہو)

ان آیات میں بار بار حلال روزی کے استعمال کی ہدایت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے

حلال وہی چیز ہوگی جو جائز طریقے سے حاصل کی گئی ہوگی۔قرآن کی اس ہدایت سے مقصود ہے کہ نہ تو ناحق کسی کا مال لیا جائے اور نہ اس کے حصول کے لیے جھوٹ،فریب وخیانت کا راستہ اختیار کیا جائے۔درحقیقت قرآن نے یہ کہہ کر تمام ناجائز ذرائع معاش پر پابندی لگا دی کہ لوگو آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ۔ارشاد ربانی ہے:

وَلا تَـأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقاً مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ:۱۸۸)

(اور نہ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناروا طریقہ سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے انہیں اس غرض سے پیش کرو کہ تمہیں دوسرے کے مال کا کوئی حصہ جان بوجھ کر ناجائز طریقہ سے کھانے کا موقع مل جائے)

یہاں یہ واضح رہے کہ باطل طریقہ سے مال کھانے کی ممانعت میں وہ تمام طریقے آ گئے جس میں ناجائز طریقہ سے دوسروں کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے یا کسی کے مال سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ان میں خیانت،چوری،غارت گری،جوا،سود،رشوت،جھوٹ، جھوٹی گواہی،فریب ودغابازی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔قرآن کریم نے ان کو علیحدہ بھی ذکر کر کے ان کے برے انجام سے متنبہ کیا ہے اور ان سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے۔اوپر کی آیت میں یہ خاص ہدایت بھی دی گئی ہے کہ کسی کے مال یا جائداد پر اپنی ملکیت کا حق قائم کرنے کے لیے کسی حاکم کے سامنے جھوٹا مقدمہ نہ قایم کیا جائے اور نہ حاکم کو رشوت دے کر ناجائز مالی فائدہ اٹھانے یا کسی کا مال ہڑپنے کی کوشش کی جائے۔گویا مال وجائداد کے حصول کے لیے ان ناجائز ذرائع (جن کا چلن عام ہے) کے استعمال کی ممانعت کی گئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ کسبِ مال یا حصولِ زر کے ناجائز ذرائع بہت سے ہیں لیکن ان سب پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بیشتر کی جڑ بے ایمانی یا خیانت ہے۔قرآن نے اپنی ہدایات وتعلیمات کے ذریعہ سے اس پر ضرب کاری لگائی ہے اور اس سے کلّی اجتناب کا حکم دیا ہے اور اسے ان کاموں میں شامل کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيـنَ آمَـنُـوا لاَ تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ٥ (الانفال:۲۷)

(اے ایمان والو! جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کے مرتکب ہو)

ظاہر ہے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کا مطلب ہے ان کے حکم سے سرتابی کرنا اور ان کی مرضی کے خلاف کام کرنا۔ اس آیت میں امانت میں خیانت کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ مفسرین نے عام طور پر اس آیت میں امانت سے بہت وسیع معنی مراد لیا ہے اور اس میں عہد و پیمان، قول و قرار، عہدہ و منصب اور فطری و علمی صلاحیت سب کچھ شامل کیا ہے۔ لیکن اس کا جو ظاہری اصل مفہوم (مالی امانت) ہے اس کو ترجیح دینا زیادہ مناسب ہوگا اور پھر مالی امانت میں بہت سی چیزیں شامل ہیں جیسا کہ آنے والی تفصیلات سے واضح ہوگا۔ یہ بات بخوبی معرف ہے کہ امانت کا ضد خیانت ہے۔ عام طور پر کسی کے پاس بطور امانت رکھے ہوئے مال یا سامان میں خرد برد کرنے یا اسے پوری طرح ہڑپ کر لینے کو خیانت سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ملازمت یا اجرت پر کام کرتے ہوئے اس کے جو مقررہ اوقات ہیں ان کی پابندی نہ کرنا یا ڈیوٹی کے اوقات میں اپنا کوئی کام کرنا یا مفوضہ ذمہ داری کی انجام دہی میں غفلت و لاپرواہی برتنا، یہ سب خیانت میں شامل ہے۔ اسی طرح ایک مزدور یا ملازم کی جو تنخواہ مقرر ہے اس سے کم ادا کرنا بھی خیانت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام حرکتیں ذریعہ معاش کو ناجائز اور آمدنی کو حرام بنا دیتی ہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ قرآن کریم کی دو آیتوں (النساء: ۱۰۷، الحج: ۳۸) میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو خیانت میں ملوث ہوتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّاناً أَثِيماً (النساء: ۱۰۷)

(اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو خیانت کرنے والے ہیں اور گنہ گار ہیں)

مزید برآں قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ خیانت کرنے والے اس لائق نہیں ہیں کہ ان کی حمایت کی جائے یا ان کی طرف سے دفاع کیا جائے، اس لیے کہ وہ بددیانت ہیں اور اللہ رب العزت کی نگاہ میں انتہائی ناپسندیدہ ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کی ہدایت یہ ہے:

وَلاَ تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيماً (النساء: ۱۰۵)

(اور تم خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو)

ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خیانت یا بددیانتی کے ذریعہ جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ ناجائز ہے بلکہ اس کے بہت سے برے اثرات بھی مترتب ہوتے ہیں۔

خرید وفروخت کرتے وقت ناپ تول میں کمی کرنا کھلی ہوئی خیانت وبددیانتی ہے۔قرآن نے اس بری حرکت کی سخت ممانعت کی ہے اور ٹھیک ٹھیک ناپنے وتولنے کی ہدایت دی ہے اس لیے کہ تجارتی دیانت کا تقاضا یہی ہے اور حق وانصاف کا بھی یہی مطالبہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً (بنی اسرائیل:۳۵)

(اور پورا پورا ناپو جب تم ناپو اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو یہی بہتر اور انجام کے اعتبار سے خوب تر ہے)

فاوفوا الكيل والميزان ولا تبخسوا الناس اشياء هم (الاعراف:۸۵)

(اور ٹھیک ٹھیک ناپو اور تولو اور لوگوں کی چیزیں کم نہ کرو)

ان کے علاوہ متعدد دیگر آیتوں (الانعام:۱۵۲، ہود، ۸۵، الشعراء:۱۸۲،۱۸۱، الرحمٰن: ۸-۹) میں تقریباً یہی ہدایت دی گئی ہے۔مزید برآں ایک آیت (المطففین:۱-۳) میں ناپ تول میں کمی کو انجام کے اعتبار سے تباہی وبربادی کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

درحقیقت ناپ تول میں کمی کرنا لین دین میں خیانت کی ایک بدترین صورت ہے۔اس کے بارے میں نہایت واضح ممانعتی حکم کے ذریعہ قرآن نے تجارت، بزنس یا لین دین کے ان تمام طریقوں کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کردیا جن میں دھوکہ دھڑی، فریب، حقیقت پوشی اور عہد شکنی پائی جاتی ہے۔اسی طرح قرآن نے سود، جوا، رشوت وغصب جیسے ان تمام ذرائع آمدنی کو ناجائز قرار دیا جن میں ضرورت مندوں کا استحصال، طاقت ومنصب کا ناجائز استعمال پایا جاتا ہے یا جو معاشرتی واخلاقی خرابیوں کو جنم دیتے ہیں اور معاش کے جائز ومفید ذرائع کو متاثر کرتے ہیں۔یہ بخوبی معروف ہے کہ سود میں محتاجوں وضرورت مندوں کا استحصال ہے، قرآن کے حکمِ انفاق کی خلاف ورزی ہے، انسانی ہمدردی وبھلائی کے جذبہ کی نفی ہے۔یہ دولت کے سمٹاؤ کا ذریعہ ہے اور اس سے

روایتی معاشی اداروں کی سرگرمیوں پر بھی بہت برا اثر پڑتا ہے۔قرآن کی نظر میں یہ سوچنا یا سمجھنا شیطانی وسوسہ یا حربہ ہے کہ سود تو ایک بزنس ہے یا خرید وفروخت کی ایک صورت ہے، اس میں کیا حرج ہے۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو شیطان کے اثر سے اپنے ہوش وحواس کھو چکا ہے اور اس میں غلط وصحیح کی تمیز باقی نہیں رہی۔ جب کہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع یا خرید وفروخت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کی حرمت کا قطعی طور پر اعلان کیا ہے(البقرہ:۲۷۵) جوا کے بارے میں بھی یہ ارشاد ہوا کہ یہ شیطانی اعمال میں سے ہے۔لہٰذا ان سے دور رہو۔قرآن کے حوالے سے یہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔اس لیے اس کے اشارہ پر چلنے میں بہر صورت انسان کی تباہی وناکامی ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ (المائدہ:۹۰)

(اے مومنو! شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے بچے رہو کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو)

مذکورہ آیت کے آخری حصہ نے یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ ان برائیوں (جن میں جوا بھی شامل ہے) سے احتراز میں ہی انسان کے لیے خیر وفلاح ہے۔

آخر میں اس بات کی طرف اشارہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تجارت، خرید وفروخت، لین دین اور دوسرے مالی معاملات میں بددیانتی یا بدعنوانی کا ایک بہت بڑا ذریعہ جھوٹ ہوتا ہے۔جھوٹ بول کر خریدار یا دوسرے اصحابِ معاملات کو فریب کا شکار بنایا جاتا ہے اور ان سے ناجائز طور پر مالی فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔قرآن نے اس سے اجتناب کی سخت ہدایت دی ہے۔ارشادِ الٰہی ہے:

وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (الحج:۳۰) (اور بچے رہو جھوٹی بات سے)

اس آیت میں ''زور'' سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔زور کے مفہوم میں جھوٹ بولنا، خلافِ واقعہ کوئی بات کہنا اور جھوٹی گواہی دینا سب کچھ شامل ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ قرآن میں نیک بندوں کے اوصاف میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے (الفرقان:۷۲)

ان تمام تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جائز ذرائع آمدنی اختیار کرنے یعنی حلال کمائی پر خاص زور دیا ہے اور کسبِ مال کے ناجائز ذرائع اور حرام اموال کی نشاندہی کر کے مختلف پیرایہ میں ان سے بچنے کی تاکید کی ہے اور ان کے دنیوی واخروی دونوں نقصانات سے بھی باخبر کیا ہے۔ حرام مال کے استعمال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آمدنی یا مال سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ اس سے جسمانی وذہنی صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور اس مال سے اولاد کی پرورش پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک بہت بڑی محرومی یہ ہاتھ آتی ہے کہ حرام مال استعمال کرنے والے کی دعا نہیں قبول ہوتی جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لوگو اللہ پاک ہے اور پاک چیز ہی قبول کرتا ہے اور اللہ نے جس کام کا حکم پیغمبروں کو دیا تھا اسی کا حکم مومنوں کو دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے فرمایا ''تم سب پاک چیز کھاؤ اور تم جو کچھ کرو گے میں اس سے واقف ہوں''۔ اور مومنوں سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''مومنو! ہم نے جو چیزیں تم کو عطا کی ہیں ان میں سے پاک چیزیں کھاؤ''۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اس شخص کا ذکر کیا جس نے لمبا سفر اختیار کیا اور جس کے بال پریشاں وگرد آلود ہو رہے ہیں اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا ہے: اے پروردگار، اے پروردگار (یعنی دعا مانگ رہا ہے)، لیکن حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا بھی حرام، پینا بھی حرام ہے، لباس بھی حرام ہے اور غذا بھی حرام۔ پھر کیوں اس کی دعا قبول ہوسکتی ہے''۔ (صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب ان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف)۔

قرآن کریم میں مال کمانے کے ساتھ ساتھ مال خرچ کرنے کے اصول وآداب بھی واضح کیے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ مال بلاضرورت نہ خرچ کیا جائے یعنی فضول خرچی نہ کی جائے۔ اس سے احتراز کی ہدایت اس تنبیہ کے ساتھ دی گئی کہ ایسا کرنے والوں کو اللہ ناپسند کرتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ مال اللہ کی نعمت ہے، اس کا بیجا استعمال اس نعمت کی ناشکری ہے اور انسانی حق تلفی بھی۔ اگر کوئی صاحب مال بلاضرورت اپنا مال خرچ کرتا ہے یا نمود ونمائش کی خاطر اپنی دولت لٹاتا ہے تو وہ اپنا نقصان

کرتا ہے اور دوسروں کا بھی حق مارتا ہے اس لیے کہ اگر وہ فضول خرچی نہ کرتا تو اس کا مال بچتا جو اس کے اپنے یا اہل وعیال کے کام آتا اور اگر کار خیر میں خرچ کرتا تو دوسروں کا بھلا ہوتا اور اسے ثواب ملتا۔ اس طرح فضول خرچی کرنے والا بہر حال اپنے کو خسارہ میں ڈالتا ہے اور دوسروں کا بھی نقصان کرتا ہے، اس ضمن میں قرآنی ہدایات ملاحظہ ہوں:

كلوا واشربوا ولا تسرفوا انه لا يحب المسرفين (الاعراف:۳۱)

(کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو بے شک وہ (اللہ) فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

وَلاَ تُبَذِّرْ تَبْذِيراً ○ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُواْ إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ○ (بنی اسرائیل:۲۶-۲۷)

(اور مال کو) بے جا نہ اڑاؤ بے شک مال کو بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے)

ان میں پہلی آیت اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ جو چیزیں انسان کے بقا و تحفظ کے لیے ضروری ہیں ان کا استعمال نہ صرف مطلوب ہے بلکہ ان کا حکم دیا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ان کو بلا ضرورت بے دریغ خرچ نہ کرو، اس لیے کہ یہ نعمت کا ضیاع ہے جسے اللہ پسند نہیں فرماتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمتیں صحیح طور پر استعمال ہوں۔ خود اپنے کام آئیں اور دوسروں کی ضرورتیں اس سے پوری ہوں۔ دوسری آیت کا یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ اس میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے اور اس کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ گویا فضول خرچی اللہ کی ناشکری ہے اور ایسا کرنا شیطان کی راہ پر چلنا ہے۔ شیطان کبھی نہیں چاہتا کہ انسان کوئی ایسا کام کرے جس سے اس کا فائدہ ہو یا دوسروں کا بھلا ہو۔ وہ خود ناشکرا ہے اور انسان کو ناشکری پر ابھارتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ قرآن فضول خرچی کی طرح بخل کے بھی سخت خلاف ہے۔ ضرورت کے باوجود مال نہ خرچ کرنا اور اسے روکے رکھنا بھی قرآن کی نظر میں ایک نہایت ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس سے بھی اللہ کی ناشکری ہوتی ہے اور دوسروں کا حق مارا جاتا ہے۔ بخل کرنے والا نہ تو اپنے اوپر مال خرچ کرتا ہے اور نہ گھر والوں پر۔ وہ نیک کاموں میں مال

خرچ کرنے سے بھی ہاتھ روکے رکھتا ہے۔اس طرح وہ اپنے کو خسارہ میں ڈالتا ہے اور کار خیر کے ثواب سے بھی محروم رہتا ہے۔ دراصل اسلام اعتدال کی راہ پسند کرتا ہے۔ نہ تو وہ صاحب مال سے یہ چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ لٹا دے یا دوسروں کو دے ڈالے اور وہ خود آخر میں محتاج ودرماندہ بن کر رہ جائے اور نہ ہی اس کی نظر میں یہ بات پسندیدہ ہے کہ انسان مال خرچ کرنے سے ہاتھ کو اس طرح روکے کہ خود اپنی ضرورت بھی نہ پوری کر سکے،اس سلسلہ میں اللہ کی ہدایت یہ ہے:

وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُوراً ٥ (بنی اسرائیل:۲۹)

(اور نہ اپنے ہاتھ کو گردن میں باندھے رکھو(کہ کسی کو کچھ دو ہی نہ) اور نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دو(کہ سب کچھ دے ڈالو)اور ملامت زدہ وعاجز بن کر رہ جاؤ)

قرآن کی نظر میں اللہ کے نیک بندوں کی روش یہ ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَاماً ٥ (الفرقان:٦٧)

(اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی وبخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان کے درمیان بیچ کی راہ اختیار کرتے ہیں)

بعض اوقات بخیل یہ سوچتے ہیں کہ اگر مال خرچ کرنے کے بجائے اسے بچائیں گے اور اسے جمع رکھیں گے تو یہ ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔قرآن نے اس سوچ کو غلط قرار دیا ہے۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جو مال نہ اپنے کام آئے اور نہ دوسروں کے۔اس میں کیا خیر ہوسکتا ہے۔دوسرے بخل سے وہ مقصد نہیں پورا ہوتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مال کی یہ نعمت عطا کی ہے۔تیسرے آخرت میں بخل کا جو خمیازہ بھگتنا پڑے گا وہ ان سب کے علاوہ ہے اور قرآن کی رو سے وہ بڑا تکلیف دہ ہوگا جیسا کہ اس آیت سے اشارہ ملتا ہے:

وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْراً لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُواْ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضِ وَاللّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ٥ (آل عمران:۱۸۰)

(اور جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ بخل میں ان کے لیے خیر ہے، یہ ان کے حق میں بری شئ ہے۔ اللہ ہی کے لیے آسمان وزمین کی میراث ہے اور اللہ ان تمام اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو)

آیت کے آخری حصہ میں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ زمین وآسمان کے سارے خزانے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں جب بندہ اللہ کے حکم کے مطابق اپنا مال خرچ کرے گا تو وہ اسے اور عطا کرے گا اور اس کے بچے ہوئے مال میں برکت دے گا۔ مقصد یہ کہ صاحب مال کے لیے خیر وفلاح حکمِ الٰہی کے مطابق مال خرچ کرنے میں ہے نہ کہ اسے روکنے یا جمع کرنے میں۔ یہ آیت اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنفِقُوا خَيْراً لِّأَنفُسِكُمْ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (التغابن:۱۶-۱۷)

(اور سنو وفرماں برداری بجالاؤ اور [اپنے مال کو نیک کاموں میں] خرچ کرو۔ یہ تمہارے لیے باعث خیر ہے اور جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچا لیے گئے وہی کامیاب ہیں)

انفاق کے بارے میں قرآن کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اس سے مقصود صرف رضائے الٰہی ہو۔ مال اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے ملتا ہے۔ یہ اس کی ربوبیت ورزاقیت کا فیض ہے، اس لیے اسے اسی کے حکم کے مطابق اور اسی کی رضا کے لیے خرچ کیا جائے۔ درحقیقت اجر کثیر کا استحقاق اخلاص نیت پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَوٰةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ (الروم:۳۹)

(اور جو زکوۃ تم لوگ دیتے ہو اللہ کی رضا جانتے ہوئے تو یہی لوگ ہیں جو [اللہ کے یہاں] اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں)

وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ فَلأنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلاَّ ابْتِغَاء وَجْهِ اللّهِ وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُونَ○ (البقرہ:۲۷۲)

(جو مال بھی خرچ کرو گے وہ تمہارے لیے بہتر ہوگا اور نہ خرچ کرو مگر اللہ کی خوشنودی کے لیے اور جو مال بھی خرچ کرو گے وہ تم کو پورا کردیا جائے اور تمہارے حق میں

ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی)

ایک آیت میں اہل ایمان کی یہ روش بیان کی گئی ہے کہ وہ محض رضاء الٰہی کی طلب میں غرباء ومساکین کی مدد کرتے ہیں اور وہ ان سے کسی بدلہ کے طلب گار نہیں ہوتے۔ متعلقہ آیت ملاحظہ ہو:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً ٥ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُوراً ٥ (الدہر:۸-۹)

(اور وہ اللہ کی محبت میں مسکینوں، یتیموں وقیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تمہیں محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ چاہتے ہیں کہ تم ہماری شکرگزاری کرو)

ان تمام آیات سے یہی قرآنی نکتہ سامنے آتا ہے کہ اللہ رب العزت کے نزدیک اسی انفاق (یا نیک کام کے لیے مال خرچ کرنے) کی قدروقیمت ہے جس سے صرف رضائے الٰہی مقصود ہو اور کوئی دنیوی غرض وابستہ نہ ہو)

اسی ضمن میں انفاق سے متعلق قرآن کی اس تعلیم کا ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ریا ونمود کا شائبہ نہ ہو یعنی مال خرچ کر کے نمائش یا شہرت مقصود نہ ہو۔ یہ دراصل مذکورہ بالا اصول پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ جب مال کے ذریعہ کارخیر میں شرکت صرف اللہ کی رضا کے لیے ہوگی تو اس میں ریا ونمود کی آمیزش کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انفاق کرتے وقت اس سے اجتناب پر خاص طور سے زور دینے کی وجہ یہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ شہرت ونمائش کو پسند کرتا ہے اور اس کے لیے بسا اوقات مال ودولت کو بھی استعمال کرتا ہے، قرآن کی رو سے وہ لوگ اللہ کی نگاہ میں انتہائی ناپسندیدہ ہیں جو ریا ونمود کے لیے انفاق کرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل شیطان کی رفاقت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَن يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِيناً فَسَاءَ قِرِيناً٥ (النساء:۳۸)

(اور وہ لوگ بھی (اللہ کو ناپسند ہیں) جو اپنے مال محض لوگوں کو دکھاوے کے لیے

خرچ کرتے ہیں اور آخر میں یہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ روز آخر پر۔ شیطان جس کا رفیق ہوا سے بہت بری رفاقت میسر ہوئی)

آیت کا آخری حصہ اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ اسراف کی طرح ریا ونمود کو بھی شیطان سے قربت کا شاخصانہ قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ شیطان (جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا) کبھی نہیں چاہتا کہ انسان نیک کام کرے اور وہ مقبول ہو اس لیے وہ اسے دکھاوے کے کام پر بھی ابھارتا ہے جو اسے انجام کے اعتبار سے غارت کر دیتا ہے۔ ایک دوسری آیت سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ دکھاوے کے لیے خرچ کرنا انفاق کے عمل یا صدقہ وخیرات کو ضایع کر دیتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تُبْطِلُواْ صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالأذَى كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاء النَّاسِ وَلاَ يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِo (البقرہ:۲۶۴)

(اے ایمان والو اپنے صدقات احسان جتا کر و تکلیف دے کے ضائع نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ یوم آخر پر)

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ احسان جتانے اور ایذا رسانی کے علاوہ ریا ونمود سے بھی صدقہ وخیرات کا اجر ضائع ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کے مطابق انفاق کے اصول و آداب میں یہ بھی ہے کہ اچھا مال خرچ کیا جائے یعنی کسی کو نقد کی صورت میں مدد کرنی ہو تو اسے کھوٹے سکے یا کٹے پھٹے نوٹ نہ دیے جائیں یا کسی کو کوئی چیز دینی ہو تو ایسی چیز نہ دی جائے جو بالکل پرانی ہو چکی ہو اور استعمال کے قابل بھی نہ ہو۔ اس ضمن میں قرآن کی واضح ہدایت یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الأَرْضِ وَلاَ تَيَمَّمُواْ الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلاَّ أَن تُغْمِضُواْ فِيهِ وَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌo (البقرہ:۲۶۷)

(اے مومنو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے اچھی اور پاک چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اس میں سے خراب

چیز کا (دینے کے لیے) قصد نہ کرو (کہ وہی چیز اگر تمہیں دی جائے) تو تم اس کے لینے والے نہ ہو بلکہ اس سے اعراض کرو، اللہ بے نیاز ہے اور ہر حال میں قابل تعریف ہے)

اس آیت میں طیب مال خرچ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ طیب سے مراد (جیسا کہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے) وہ مال ہے جو جائز ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہے اور وہ مال بجائے خود پاک واچھا ہو۔ یعنی گھٹیا و بے وقعت نہ ہو۔ قرآن نے یہ کہہ کر اس ہدایت کو اور موثر بنا دیا کہ ایسی خراب چیز کسی غریب یا ضرورت مند کو نہ دی جائے کہ اگر وہی چیز اسے دی جائے تو وہ اسے پسند نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمدہ مال یا اچھی چیز انسان کو محبوب ہوتی ہے، اسے اپنے سے جدا کرنے یا دوسروں کو دینے میں سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اسی لیے اس عمل کو نیکی کا اعلیٰ مقام قرار دیا گیا ہے کہ کوئی اپنا محبوب مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ ارشاد ربانی ہے:

لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ (آل عمران:۹۲)

(تم نیکی (کے اعلیٰ مقام) کو ہرگز نہیں پہنچ سکو گے جب تک وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمہیں عزیز ہیں)

ایک حدیث سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال اتی رسول الله ﷺ فقال يا رسول الله ای الصدقة اعظم فقال ان تصدق وانت صحيح شحيح، تخشی الفقر وتامل الغنی ۱ (صحيح مسلم: کتاب الزکوٰة باب بيان افضل الصدقة صدقة الصحيح الشحيح)

(حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا کہ یا رسول اللہ کون سا صدقہ [اجر کے لحاظ سے] سب سے بڑا ہے جواب میں فرمایا کہ وہ صدقہ جو تم اس حال میں کرو کہ تم تندرست ہو۔ بخل تم پر غالب ہو۔ افلاس کا اندیشہ ہو اور دولت مندی کی خواہش ہو)۔

ظاہر ہے کہ انسان اس چیز کا حریص یا خواہش مند ہوتا ہے جو پسندیدہ ہوتی ہے اور اچھی لگتی ہے۔

انفاق کے باب میں قرآن کی یہ ہدایت بھی بہت اہم ہے کہ کسی پر صدقہ وخیرات

کر کے یا کسی محتاج کی مدد کر کے اس پر احسان نہ جتایا جائے اور نہ ہی اسے ستایا جائے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ کوئی شخص صدقہ وخیرات کرتا ہے یا کسی پر اپنا مال خرچ کرتا ہے تو اس پر احسان نہیں کرتا بلکہ یہ غریب یا محتاج کا حق تھا جسے ادا کرنے کی اسے توفیق نصیب ہوئی۔ بلکہ دینے والے کو محتاج کا احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ اس کے توسط سے ایک حق کی ادائیگی سے سبک دوش ہو گیا اور اجر کثیر کا مستحق بنا۔ سچ پوچھیے تو کسی کو کچھ دے کر احسان جتانے والا یا اسے تکلیف پہنچانے والا نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنتا ہے۔ اس آیت کی تشریح و ترجمانی اوپر گزر چکی ہے کہ اے ایمان والو اپنے صدقات احسان جتا کر اور تکلیف دے کر خاک میں نہ ڈالو۔

دراصل احسان یا ایذا رسانی محتاجوں کی تحقیر اور غرباء کے عزتِ نفس کی پامالی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دیتا وہ تو اس بات کو بھی گوارا نہیں کرتا کہ کسی سائل کو جھڑکا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا صاف صاف حکم ہے:

وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ٥ (الضحیٰ:١٠) (اور مانگنے والے کو جھڑکو نہیں)

قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ ڈانٹنے وجھڑکنے کے بجائے ان سے بھلی بات کہی جائے اور اگر انہیں کچھ نہ دینا ہو تو خوش اسلوبی سے ان سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ اس آیت سے یہی سبق ملتا ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ (البقرہ:٢٦٣)

(بھلی بات کہنا اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے تکلیف ہو اللہ بے نیاز اور بردبار ہے)

قرآن کریم نے محتاجوں و ناداروں کے باب میں نرم روی، کشادہ دلی و اعلیٰ ظرفی کو کس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس کی اس ہدایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اہل ثروت کسی حاجت مند کی مدد اس وجہ سے نہ ترک کر دیں کہ اس سے کوئی نازیبا حرکت صادر ہو جائے یا اس کی کوئی بات ناگوار خاطر ہو جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ

وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ o (النور:٢٢)

(اور تم میں جو صاحب فضل و وسعت ہوں، وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ کی مدد نہ کریں گے انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے اور اللہ غفور رحیم ہے)

بعض مفسرین نے ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں اس آیت کی جو تشریح کی ہے اس سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ اگر کوئی مالدار کسی ضرورت مند کی مدد کرتا رہا ہے اور پھر وہ موخر الذکر سے کسی بات پر ناراض ہو جائے تو بھی انسانی ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کی مدد جاری رکھے اور اس شخص سے ناراضگی کی وجہ سے اپنا ہاتھ نہ روک لے بلکہ ایسے موقع پر عفو و درگزر سے کام لے۔ قرآن نے آیت کے آخر میں کس موثر انداز میں معاف کر دینے کی تعلیم دی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ یعنی جس طرح ہر شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں کو بخش دے اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ دوسرے انسان کی غلطی معاف کرنے میں اعلیٰ ظرفی سے کام لے۔

محتاجوں کے سلسلہ میں ہمدردانہ و فراخدلانہ رویہ اختیار کرنے کی ہدایت اس آیت سے بھی ملتی ہے جس میں مقروض سے متعلق اہل ثروت کو ہدایت دی گئی ہے۔ مقروض بھی بہر حال ضرورت مند ہوتے ہیں۔ اس ہدایت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مقروض تنگ دستی کی وجہ سے قرض کی ادائیگی سے قاصر ہیں اور اس کے لیے کچھ مہلت چاہتے ہیں تو قرض دینے والے کو چاہیے کہ وہ انہیں مہلت دے دیں اگر وہ انہیں بالکل معاف کر دیں تو یہ ان کے حق میں مزید بہتر ہوگا۔ متعلقہ آیت ملاحظہ کریں۔

وَإِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o (البقرہ:٢٨٠)

(اور اگر مقروض تنگ دست ہوں تو گنجائش ہونے تک انہیں مہلت دو اور اگر مقروض کو (بالکل) بخش دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر تم اس حقیقت کو سمجھنے والے ہو جاؤ)۔

آیت کا آخری حصہ دل و دماغ کو اپیل کرنے والا اور خیر کی راہ میں مسابقت کی

دعوت دینے والا ہے۔

انفاق یا بھلائی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کے اصول وآداب بیان کرنے کے علاوہ قرآن نے مختلف آیات میں ان افراد کی نشاندہی کی ہے جو ایک شخص کے مال میں اپنا حق رکھتے ہیں یا جن پر مال خرچ کرنا قرآن کی نظر میں مطلوب ہے۔قرآن کی متعلقہ آیات پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صاحب مال کے مال میں سب سے پہلے والدین، گھر والے اور رشتہ دار اپنا حق رکھتے ہیں۔اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ o (البقرہ:۲۱۵)

(کہہ دیجئے جو مال بھی تم خرچ کرو اس کے مستحق [درجہ بدرجہ] ماں باپ اور رشتہ دار ہیں، پھر یتیم، مسکین اور مسافر ہیں)

اس کے علاوہ متعدد آیات (بقرہ:۸۳، النساء:۳۶، الانعام:۱۵۱، العنکبوت:۸، بنی اسرائیل:۲۳، احقاف:۱۵) میں والدین کے ساتھ احسان (بھلائی کرنے) کا حکم دیا گیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً o (بنی اسرائیل:۲۳)

(اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو)

لفظ احسان کے مفہوم میں نیک برتاؤ، خوش گفتاری، دیکھ ریکھ، جسمانی مدد اور مالی اعانت سب کچھ شامل ہے۔دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ اس نوع کی مختلف آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے حکم کے فوراً بعد والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت دی ہے۔اس سے ان کے مقام ومرتبہ کی بلندی ثابت ہوتی ہے کہ انسانوں میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ والدین اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی دیکھ ریکھ پر مال خرچ کیا جائے۔

والدین کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو ان کے بارے میں وصیت کی (ووصینا الانسان بوالدیه /لقمان:۱۴) اسی طرح اولاد کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ان کے بارے میں وصیت کرتا ہے (یوصیکم الله فی

اولادکم / النساء:۱۱) اور پھر ان کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ظاہر ہے کہ وصیت یا نصیحت ان کے ساتھ نیک برتاؤ، خوش معاملگی اور ان کی نگہداشت سے متعلق ہے اور اس میں بجا طور پر ان پر مال خرچ کرنا بھی شامل ہے۔اسی طرح اللہ رب العزت نے انسان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کریں۔ہم انہیں بھی روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی (بنی اسرائیل:۳۱) اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اولاد کی کفالت والد کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

بیویوں کے حقوق کے سلسلہ میں قرآن نے شوہروں کو اصولی طور پر یہ یاد دلایا کہ عورتوں کا حق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق مردوں کا حق عورتوں پر ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ؀ (البقرہ:۲۲۸)

(اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں)

عورتوں کے حقوق میں ان کے مالی حقوق سرفہرست ہیں۔یہ بات بخوبی معروف ہے کہ شوہر پر بیوی کی کفالت فرض ہے یعنی شوہر اپنے وسائل سے بیوی کی رہائش، کھانے پینے اور لباس وغیرہ کا نظم کرے۔یہ نکتہ اس آیت سے مزید واضح ہوتا ہے جس میں عورت پر مرد کی فضیلت کی ایک وجہ واضح طور پر یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنا مال عورت پر خرچ کرتے ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ؀ (النساء:۳۴)

(مرد عورت کے نگراں ومحافظ ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں)

عورتوں کے جو مالی حقوق مرد پر عائد ہوتے ہیں ان میں حق مہر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔فرمان الٰہی ہے:

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء:۴)۔اور عورتوں کے مہر خوشی خوشی ادا کرو۔ اس آیت میں لفظ ''نحلة'' (خوشی خوشی) معنی خیز ہے۔اس سے شوہروں کے

ذہن میں یہ حقیقت جاگزیں کرنا مقصود ہے کہ مہر کی ادائیگی کو بوجھ نہ سمجھیں بلکہ اس احساس کے ساتھ ادا کریں کہ یہ بیوی کے مسلمہ حق کی ادائیگی یا ایک اہم فریضہ کی بجا آوری ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ احساس ہوگا تو شوہر کو فطری طور پر خوشی ہوگی کہ وہ ایک فریضہ سے سبک دوش ہوگیا اور یہ سوچ کر بھی اسے خوشی ہوگی کہ یہ کسی اور کی نہیں بلکہ اس کے حق کی ادائیگی ہے جس کے ساتھ زندگی بھر رہنا ہے۔

جہاں تک اقرباء کے مالی حقوق کا تعلق ہے قرآن کی مذکورہ بالا آیت (البقرہ: ۲۱۵) میں والدین کے بعد انہیں کو مال کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسری آیت میں حسن سلوک کی تاکید کے ضمن میں والدین کے بعد رشتہ داروں کا ذکر ہے (النساء: ۳۶)۔ سورہ النحل کی ایک آیت میں لوگوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کی عمومی ہدایت کے بعد اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کی تلقین کی۔ ارشاد ربانی ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِيْ الْقُرْبَى (النحل: ۹۰)

(بے شک اللہ تعالیٰ انصاف وحسن سلوک اور اقرباء کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے)۔

ایک جگہ براہ راست خطاب کرتے ہوئے یہ حکم دیا:

وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (بنی اسرائیل: ۲۶)

(اور رشتہ دار، غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق دیتے رہو)

متعدد آیات میں رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید کی گئی ہے۔ ان میں ان کا مالی حق مقدم ہے خاص طور سے ان اقرباء کے سلسلہ میں جن کی مالی حالت اچھی نہیں ہے اور وہ اعانت کے مستحق ہیں قرآن وحدیث دونوں میں صلہ رحمی پر خاص زور دیا گیا ہے رشتوں کو جوڑنے ومضبوط کرنے کا ایک اہم ذریعہ یہ ہے کہ رشتہ داروں میں جو غریب محتاج ہوں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے اور اپنے مال میں انہیں شریک کیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ والدین وگھر والوں کے بعد رشتہ دار ہی سب سے زیادہ قریبی ہوتے ہیں۔ وہ خوشی وغم میں شریک رہتے ہیں اور ضرورت پر کام آتے ہیں اس لیے وہ خاص طور سے اس کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے اور ضرورت پڑنے پر ان کی مالی اعانت

میں فراخدلی کا مظاہرہ کیا جائے۔

مزید برآں قرآن کریم میں ترکہ کی تقسیم کے وقت بھی اقرباء کا خیال رکھنے کی ہدایت دی گئی ہے اس ضمن میں خاص طور سے ان اقرباء کا ذکر کیا گیا ہے جو شرعی نقطہ نظر سے وراثت کے حقدار نہیں ہوتے ، انہیں ترکہ میں سے کچھ دینے کی تعلیم دی گئی ہے۔قرآن کی اس آیت سے یہی درس ملتا ہے:

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُواْ الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُواْ لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوفاً(النساء:۸)

اور جب تقسیم کے وقت (وراثت سے محروم) رشتہ دار، یتیم ومسکین آئیں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دے دو اور ان سے خوش اسلوبی سے کلام کرو)۔

آیت کے آخری حصہ میں پھر یہ قیمتی سبق یاد دلایا گیا ہے کہ وراثت سے محروم اقرباء اور دوسرے حاجت مند لوگ تقسیم ترکہ کے وقت حاضر ہوں تو ان پر ناگواری نہ ظاہر کی جائے اور نہ زجر و توبیخ کی جائے بلکہ ان سے خوش کلامی کا مظاہرہ کیا جائے اور اگر کسی وجہ سے انہیں ترکہ میں سے کچھ دینے کی گنجائش نہ ہو تو بھی ان سے بھلی بات کہی جائے۔

یہاں یہ وضاحت مناسب و برمحل معلوم ہوتی ہے کہ والدین، اہل خاندان اور اعزہ واقرباء کے مالی حقوق کے سلسلہ میں ان کا حق وراثت بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کی ادائیگی کی طرف قرآن نے بار بار توجہ دلائی۔اس حق کی ادائیگی اس وجہ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کی ادائیگی کے سلسلہ میں غفلت وکوتاہی عام ہے۔دوسرے یہ بات محتاج تفصیل نہیں کہ کمزور وارثین کے حقوق کی پامالی کے واقعات زیادہ پیش آتے ہیں۔قرآنی آیات میں اس بات پر زور ملتا ہے کہ ترکہ میں جس کسی کا بھی حق ثابت ہے اس کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے اور اس ضابطہ کے مطابق ادا کیا جائے جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ میت کے ترکہ میں وارثین کے حق یا حصہ کے بیان میں دو لفظ (نصیباً مفروضا، فریضةً من الله) استعمال کیے گئے ہیں جو خاص طور سے قابل غور ہیں۔ان الفاظ سے دو باتیں ذہن نشین کرانی مقصود ہیں۔اول یہ کہ قرآن میں ورثہ کا جو کچھ حصہ بیان کیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے، دوسرے یہ کہ اس کی ادائیگی فرض ہے۔یعنی ترکہ میں

حصہ متعین کرتے وقت نہ توکسی کی من مانی چلے گی اور نہ اس کی ادائیگی میں تساہلی روا ہوگی۔

وراثت میں حصہ داروں کے حق کے سلسلہ میں قرآن کی بنیادی آیت یہ ہے:

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (النساء:۷)

(مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا اور عورتوں کا بھی اسی مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا خواہ تھوڑا ہو یا بہت، یہ اللہ کے مقرر کردہ حصے ہیں)۔

اس آیت میں ایک اصولی بات یہ واضح کی گئی ہے کہ ترکہ میں عورتوں و مردوں دونوں کا حصہ ہے۔ والدین کے علاوہ رشتہ دار بھی اس کے حق دار ہیں، دوسرے اس حق کی ادائیگی کے وقت یہ بات ذہن میں رہے کہ ورثہ کے ساتھ یہ کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ ان کا حق تھا جو انہیں دیا جارہا ہے۔ دوسرے ہر وارث کا جو حصہ مقرر ہے وہ ذات علیم، خبیر و حکیم کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اسی کے مطابق وراثت کی تقسیم میں خیر و برکت ہے۔ اللہ رب العزت ہی کو اس بات کا صحیح صحیح علم ہے کہ کون وارث مورث سے زیادہ قربت رکھتا ہے اور کون کتنے میراث کا مستحق ہے اور کس کو کتنا دینا نفع بخش رہے گا۔

آیت کے آخری حصہ میں اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، اس کی ضابطہ کے مطابق تقسیم کو یقینی بنایا جائے۔ یہ تاکید اس صورتحال میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جب میت کا چھوڑا ہوا مال تھوڑا یا معمولی ہوتا ہے تو اس کی تقسیم سے غفلت برتی جاتی ہے۔ اس طرح تقسیم وراثت کے بعد کسی کے حصہ میں بہت کم مال آرہا ہے تو اسے یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ترکہ میں دوسو روپیہ تقسیم ہونا ہے یا بیس ہزار، تقسیم کے لئے اہتمام میں دونوں برابر ہیں۔ اس طرح کسی کے حصہ میں پانچ روپیہ آتا ہے یا پانچ سو ادائیگی کی ضرورت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں روا رکھا جاسکتا۔

اوپر قرآن کریم کے حوالہ سے والدین، اہل خانہ و اقرباء کے مالی حقوق واضح کیے گئے۔ ان سب کے علاوہ معاشرہ کے ایک اور طبقہ کے افراد جن کے مالی حقوق قرآن میں بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں وہ یتامیٰ ہیں۔ یہ سماج کے انتہائی کمزور طبقات میں شمار

ہوتے ہیں اور مالی حقوق کی پامالی کے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔لوگ بڑی آسانی سے ان کے مال واسباب کو غصب کر لیتے ہیں اور انہیں حق وراثت سے بھی محروم کر دیتے ہیں بعض اوقات خود ان کے ولی یا سرپرست بن کر نگرانی کے بہانے ان کے مال و جائداد میں خرد برد کرتے ہیں اور انتہائی بد دیانتی کا ثبوت دیتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ جس گھر میں کوئی یتیم ہوتا ہے سب سے پہلے اس گھر کے لوگوں بالخصوص ولی یا سرپرست کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کی دیکھ ریکھ کریں اور اس کے حقوق کا تحفظ کریں اور پھر پورا معاشرہ اس بات کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ وہ اجتماعی طور پر یتیموں کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے اور اس کی حق تلفی کرنے والوں کو اس سے باز رکھے۔قرآن کی جن آیات میں یتامیٰ کے ساتھ حسن سلوک یا ان کے حقوق کا ذکر ہے ان میں سے بیشتر کا تعلق مالی حقوق سے ہے۔

قرآن میں بڑے واضح لفظوں میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ یتامیٰ کے ساتھ نیک برتاؤ کیا جائے (النساء:۳۸۱۹)،ان کے مال واسباب کی دیانت دارانہ نگہداشت کی جائے (الانعام:۱۵۲)،ان کے مالی حقوق ادا کیے جائیں اور ان کی ہر ممکن مدد کی جائے (البقرہ: ۲۱۵،النساء:۸)ان کا مال بقدر ضرورت خرچ کیا جائے (النساء:۶)ان کے مال سے بیجا فائدہ نہ اٹھایا جائے (الانعام:۱۵۲،النساء:۶) سن شعور کو پہنچنے پر ان کا مال ان کے حوالہ کر دیا جائے (النساء:۶)،اور ان کے ساتھ ہر حال میں انصاف کا معاملہ کیا جائے (النساء: ۱۲۷)۔ان آیات کی روشنی میں یتیموں کے مالی حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں کچھ خاص نکات سامنے آتے ہیں:

یتامیٰ کو بھی ان افراد میں شامل کیا گیا ہے جن کے ساتھ حسن سلوک کی خاص تاکید کی گئی ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى (النساء:۳۶) (والدین، اقرباء اور یتیموں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو)۔

ایک آیت (البقرہ:۲۱۵) میں والدین واقرباء کے ساتھ یتامیٰ کو بھی اس بات کا زیادہ مستحق قرار دیا گیا ہے کہ ان پر مال خرچ کیا جائے۔یتیموں کے مالی حقوق کی پاسبانی کے تئیں قرآن کس درجہ حساس ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کو یہ بھی گوارا نہیں

کہ کوئی ان کے مال کے قریب غلط نیت سے جائے،ان کے مال میں اپنا مال ملا کر اس کا ناجائز فائدہ اٹھائے یا اپنے خراب مال کو ان کے اچھے مال سے بدل لے۔متعلقہ آیات ملاحظہ ہوں:

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ (الانعام:١٥٢)

(اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ بھٹکو مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ سن شعور کو پہنچ جائیں)۔

وَآتُوا الْيَتَامَى أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ (النساء:٢)

(اور یتیموں کو ان کے مال دو اور ان کے اچھے مال اپنے خراب مال سے نہ بدلو)

اس سے پہلے قرآن کی یہ ہدایت گذر چکی ہے کہ جب ترکہ کی تقسیم کے وقت اقرباء، یتامیٰ ومساکین (جو ترکہ کے حقدار نہیں ہیں) کچھ طلب کے ساتھ حاضر ہوں تو ان کی امید پوری کی جائے اور ان سے بھلی بات کہی جائے (النساء:٨) یعنی اگر انہیں کچھ نہ بھی دینا ہو تو ان کے ساتھ سخت کلامی نہ کی جائے ایک جگہ تو بہت صاف لفظوں میں انہیں ڈانٹنے وجھڑکنے سے منع کیا گیا ہے۔فرمانِ الٰہی ہے۔

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ (الضحی:٩)　　(اور یتیم کو جھڑکو نہیں)

مزید براں قرآن نے یتیموں کے مالی حقوق کی ادائیگی کی تاکید کرتے ہوئے اس پہلو سے بھی لوگوں کو متنبہ کیا ہے کہ ان کے حقوق سے انہیں محروم کرنا آخرت میں بہت بڑے خسارہ کا باعث ہوگا اور اس کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی جیسا کہ اس آیت سے واضح ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا (النساء:١٠)

(اور جو لوگ ظلم وزیادتی کے ذریعہ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتے ہیں اور وہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے)۔

مختصر یہ کہ یتامیٰ بہر حال حسن سلوک، ہمدردی و مالی اعانت کے مستحق ہیں۔ان کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کیا جائے جو ان کے حق میں بہتر ہو خاص طور سے ان کے مالی معاملات میں بڑی احتیاط و دیانت داری برتنے کی ضرورت ہے،اس لئے کہ اس پر ان کا

گذر بسر یا معاشی زندگی کی خوشگواری منحصر ہوتی ہے۔اس سلسلہ میں قرآن کے نقطۂ نظر کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے یہ ہدایت دی کہ انہیں گواہوں کی موجودگی میں مال حوالہ کیا جائے۔قرآن کی ایک آیت میں بڑے جامع انداز میں یتیموں کے سلسلہ میں مطلوبہ رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ارشاد ربانی ہے:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَى قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ (البقرہ:۲۲۰)

(اور یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے ان کو جواب دیجئے کہ جس میں ان کی بہبود ہو وہی بہتر ہے)۔

یتیموں کے سلسلہ میں قرآن کا یہ انداز ناصحانہ بڑا دلنشیں ہے کہ کوئی شخص اسے نہیں پسند کرے گا کہ اس کی وفات کے بعد کوئی اس کے بچوں کے ساتھ زیادتی کرے یا برا سلوک کرے اسی طرح یہ سوچنا چاہئے کہ یتیم بھی کسی کے بچے ہیں لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ان کے ساتھ نرمی، ہمدردی و بھلائی کا رویہ اختیار کیا جائے۔جیسا کہ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جائے۔(النساء:۹)

ایک حدیث میں بھی بڑے مؤثر انداز میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک و حسن معاملہ کی فضیلت اجاگر کی گئی ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ گھر سب سے بہتر ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ نیک برتاؤ کیا جائے اور وہ گھر سب سے برا ہے جس میں یتیم کے ساتھ برا برتاؤ کیا جائے۔[۳۳] (سنن ابن ماجه، كتاب الادب، باب حق اليتيم)

مالی معاملات میں ایک اور مسئلہ جو بہت اہمیت رکھتا ہے وہ عہد و پیمان یا قول و قرار کی پابندی کا ہے۔تجارت، خرید و فروخت، قرض و رہن اور لین دین کے مختلف معاملات میں ایک شخص دوسرے سے کوئی عہد و پیمان یا وعدہ کرتا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ وعدہ یا قول و قرار پورا ہونے پر لین دین کے معاملات خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں اور تعلقات خوشگوار رہتے ہیں۔وعدہ خلافی یا عہد شکنی کی صورت میں اختلاف و نزاع پیدا ہوتا ہے، تعلقات خراب ہوتے ہیں، جھگڑا لڑائی کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ان سب سے تجارت کا نقصان ہوتا ہے اور لین دین کے معاملات متاثر ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں روزمرہ زندگی میں قول و قرار کی پابندی اور وعدہ پورا کرنے پر

خاص زور دیا ہے، ان ہدایات وتعلیمات کا اطلاق بجا طور پر مالی معاملات پر بھی ہوتا ہے اور بعض آیات کے سیاق وسباق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا تعلق لین دین کے معاملات سے ہے۔قول وقرار کی اہمیت واضح کرتے ہوئے قرآن نے یہ متنبہ کیا ہے کہ قیامت میں اس کے بارے میں باز پرس ہوگی، دوسرے یہ حقیقت آشکارا کی ہے کہ ایفاءِ عہد مومن کی شناخت ہے۔فرمان الٰہی ہے۔

وَأَوْفُواْ بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولاً (بنی اسرائیل:۳۴)

(اور تم لوگ عہد پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَوْفُواْ بِالْعُقُودِ (المائدہ:۱)

(اے مومنو! عہد وپیمان پورا کرو)

پہلی آیت کے آخری حصہ سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ وعدہ یا قول وقرار کو معمولی بات نہ سمجھا جائے اس کی خلاف ورزی بہت بڑا گناہ ہے اس کا وبال صرف دنیا تک محدود نہیں بلکہ آخرت میں بھی اس کے بارے میں جوابدہ ہونا پڑے گا۔درحقیقت کسی صاحبِ ایمان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ وعدہ خلافی کا مرتکب ہوگا۔قرآن کی رو سے عہد یا وعدہ پورا کرنا اہل ایمان کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُواْ (البقرہ:۱۷۷)

(اور [نیک لوگ وہ ہیں] جب وہ عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں)

اس کے علاوہ سورہ المومنون (آیت نمبر ۸) میں امانت وعہد کی پاسداری کو ان اعمال میں ذکر کیا گیا ہے جو اہل ایمان کو فوز وفلاح سے ہم کنار کرنے والے ہیں۔اوپر وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں عہد پورا کرنے کو دین کے لوازمات میں شمار کیا گیا ہے (لا دین لمن لا عهد له)۔[۴]

مالی معاملات کے استحکام اور نزاع واختلاف سے تحفظ کے لئے قرآن کریم نے ایک اور اہم ضابطہ وضع کیا ہے اور وہ یہ کہ فریقین میں لین دین کے جو کچھ معاملات طے ہوں ان کا تحریری ریکارڈ تیار کرلیا جائے تاکہ یہ دستاویز آئندہ کام آئے۔قرآن کی یہ ہدایت خاص طور سے قرض کے معاملہ سے تعلق رکھتی ہے لیکن اسے لین دین یا مالی معاہدہ

کے ہر معاملہ پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ (البقرہ:۲۸۲)

(اے ایمان والوں جب مقررہ مدت کے لئے آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو)

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ قرآن نے دستاویز کی تیاری میں انتہائی احتیاط برتنے کی تاکید کی ہے۔ اس لئے کہ آئندہ اس پر بہت سے معاملات کا انحصار ہوگا۔ قرآن کی یہ واضح ہدایت ہے کہ لین دین کا تحریری ریکارڈ ٹھیک ٹھیک تیار کیا جائے۔ اس میں لاپرواہی وغفلت یا جان بوجھ کر بددیانتی نہ ہو کہ کسی ایک فریق کے ساتھ زیادتی وناانصافی کا ذریعہ بنے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (البقرہ:۲۸۲)

(اور تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف سے لکھے)

انصاف سے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ معاملہ طے ہو اس کو لکھنے میں کمی بیشی یا کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ معاہدہ کی دفعات کو صحیح طور پر تحریر کیا جائے۔ دوسرے ریکارڈ کو مزید مستحکم بنانے کے لئے قرآن نے یہ ضروری قرار دیا کہ اس کی تیاری کے وقت دو گواہ موجود رہیں۔ قرض کے معاملہ کو تحریر کرنے کی ہدایت کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى (البقرہ:۲۸۲)

(اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہیاں کرلو اور اگر مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہی کے لئے پسند کرو تا کہ اگر ایک بہک جائے تو دوسری اس کو یاد دہانی کرا دے)۔

قرآن نے مالی معاملات میں دستاویز تیار کرنے کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اس نے تحریری صلاحیت رکھنے والوں کا یہ اخلاقی فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اصحابِ

معاملات کے ساتھ تعاون کریں اور اگر اس کے لئے ان سے رجوع کیا جائے تو وہ اس خدمت سے انکار نہ کریں۔قرآن کی ہدایت ملاحظہ ہو:

وَلاَ يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ (البقرہ:۲۸۲)

(اور لکھنے والے کو چاہئے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اسے سکھایا ہے۔پس وہ لکھے)۔

اس آیت کا یہ نکتہ قابل غور ہے کہ کتنے دلنشین انداز میں اس میں تحریری صلاحیت والوں کو یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ صلاحیت اللہ رب العزت کی بخشی ہوئی نعمت ہے۔پس چاہئے کہ وہ آگے بڑھ کر اسے اچھے و مفید کاموں کے لئے استعمال کریں یا اس کے ذریعہ دوسروں کی مدد کریں۔یہ اس صلاحیت کا بہترین استعمال ہے اور نعمت خداوندی کی شکر گزاری بھی ہے۔

اسی طرح گواہوں کے سلسلہ میں قرآن کی یہ ہدایت بہت اہم ہے کہ اگر ضرورت کے وقت انہیں گواہی کے لئے طلب کیا جائے تو وہ اس سے گریز نہ کریں اور گواہی دینے میں حق و صداقت سے کام لیں۔ارشاد الٰہی ہے:

وَلاَ يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا (البقرہ:۲۸۲)

(اور اگر گواہوں کو بلایا جائے تو وہ [حاضر ہونے و گواہی دینے سے] انکار نہ کریں)۔

گواہی چھپانے یا سچ سچ گواہی نہ دینے پر قرآن نے کتنے سخت الفاظ میں تنبیہ کی ہے ملاحظہ ہو:

وَلاَ تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيْمٌ (البقرہ:۲۸۳)

(اور تم لوگ گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی چھپاتا ہے یقیناً اس کا دل گنہ گار ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہے)

موجودہ دور میں ملزمین یا ان کے حمایتیوں کی جانب سے گواہوں کو ڈرانے دھمکانے اور انہیں گواہی دینے سے روکنے یا سچی شہادت سے باز رکھنے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور ان مذموم حرکات کا مقدمات کی سنوائی پر اثر پڑتا ہے۔اور دوسرے حقوق کے ساتھ مالی حقوق کی بازیابی بھی مشکل ہوجاتی ہے۔قرآن نے آج سے تقریباً

ڈیڑھ ہزار برس قبل ملزمین یا ان کے طرفداروں کی ان مجرمانہ حرکات پر قدغن لگانے کے لیے کیسی سخت ہدایت جاری کی۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلاَ يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلاَ شَهِيدٌ وَإِن تَفْعَلُواْ فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ (البقرہ:۲۸۲)

(اور کاتب و گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہارے لیے گناہ ہوگا)۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مالی معاملات سے متعلق قرآنی ہدایات وتعلیمات بہت جامع ومحکم ہیں اور سماجی ومعاشی زندگی کی بہتری وخوشگواری کے لئے نہایت مؤثر ومفید ہیں۔ ان میں غور وفکر سے قرآن کے جو خاص خاص مطالبات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں۔ کسب مال کے لئے جائز ذرائع اختیار کئے جائیں اور تمام باطل طریقوں (بالخصوص چوری، رشوت، سود، خیانت، غصب، غبن وفریب) سے کلی پرہیز کیا جائے، جو مال حاصل کیا جائے یا جو چیزیں استعمال میں لائی جائیں وہ حلال و پاک ہوں، مال خرچ کرنے میں اسراف وبخل دونوں سے اجتناب کیا جائے، اس لئے کہ دونوں میں بندوں کی حق تلفی اور اللہ کی ناشکری ہے۔ کمائے ہوئے مال میں سے والدین، اہل خانہ، اقرباء، غرباء، مقروض، یتامیٰ و دوسرے ضرورت مندوں کے حقوق پورے کیے جائیں، ترکہ میں ورثہ کا جو حق ہے اسے دیانت داری کے ساتھ ادا کیا جائے۔ نیک کام کے لیے مال خرچ کرنے میں تاخیر نہ کی جائے۔ ضرورت مندوں کو جو مال واسباب دیا جائے وہ اچھا وقابل استعمال ہو، انفاق فی سبیل اللہ سے مقصود محض رضائے الٰہی ہو، ریا ونمود یا کسی دوسری غرض کا اس میں شائبہ نہ ہو، کسی محتاج پر مال خرچ کر کے نہ تو احسان جتایا جائے اور نہ اسے ستایا جائے مزید برآں لین دین کے معاملات میں دیانت داری اور قول وقرار کی پابندی ضروری ہے، مالی معاملات میں اختلاف ونزاع سے بچنے کے لئے بہتر ہے کہ لین دین یا مالی معاہدہ کے وقت گواہوں کی موجودگی میں تحریری دستاویز تیار کی جائے۔ مختصر یہ کہ مالی لین دین کے تمام معاملات میں دیانت داری، صفائی، شفافیت اور دغا وفریب سے دوری متعلقہ قرآنی ہدایات کے سب سے اہم اجزا ہیں، ان پر عمل پیرا ہونے پر نہ صرف معاشی ومالی امور کی بحسن وخوبی انجام دہی منحصر ہے بلکہ اس میں سماجی زندگی کی خوشگواری کی بھی ضمانت ہے۔ اللہ کرے ہمیں اس حقیقت کو سمجھنے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی توفیق نصیب ہو۔ اللہ الموفق وھو المستعان۔

اسلامی معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام قرآن کریم کی روشنی میں

خورشید احمد اعظمی

رجوع إلی القرآن کی ضرورت واہمیت:

قرآن کریم اس اہمیت کے پیش نظر کہ وہ کتاب ہدایت، منہج شریعت اور انسانی زندگی کا دستور العمل ہے، قوموں کی تہذیب وتمدن اور افکار ونظریات کو بدلنے کی اس میں صلاحیت ہے، اس کا مستحق ہے کہ کسی بھی دور میں معاشرہ کے کسی بھی اہم مسئلہ میں اس کی طرف رجوع کیا جائے، اس کے اندر فہم وتدبر کی سعی کی جائے، اس پر عمل کی راہ ہموار کی جائے، اس کے اندر چھپی اس چیز کو تلاش کیا جائے جو کسی قوم کو شتربانی کے درجہ سے ترقی کر کے جہاں بانی کے مرتبہ پر پہونچا سکتی ہے، اور اس لیے بھی کہ خود قرآن کریم اپنے اندر تدبر اور غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

"کتاب انزلناہ إلیک مبارک لیدبروا آیاتہ ولیذکر أولو الألباب" (سورہ ص:۹۲)۔

(یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں تدبر کریں، اور تاکہ اہل عقل نصیحت حاصل کریں)۔

قرآن کریم کی تلاوت بجائے خود ایک عبادت ہے، لیکن دنیا وآخرت سے متعلق کسی بھی امر میں رہنمائی وراہ یابی کے لیے، قرآن کریم کی آیات میں غور وفکر کرنا، اور اس کے معانی ومنشاء کو ہر دور میں سمجھنا ضروری ہے اور کسی بھی مسئلہ کی اسلامی نقطۂ نظر سے حیثیت جاننے کے لیے اولین طور پر قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔

معاشرہ کے مسائل میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ معاشرہ میں عورت کا مقام اور اس

کی کیا حیثیت ہے، معاشرہ میں اس کے کیا حقوق ہیں، اور اسلام نے عورت کو کیا مقام بخشا ہے، اس کی وضاحت کے لیے حتی المقدور قرآنی آیات کی روشنی میں ایک ناتمام کوشش اس تحریر میں کی جارہی ہے۔ وما توفیقی إلا باللہ۔

اسلام سے قبل دورِ قدیم میں عورت کا مرتبہ ومقام:

عورت جسے خالق کائنات نے اشرف المخلوقات انسان کی نوع میں پیدا کیا، اور بقول شاعر مشرق جس کے وجود سے اس کائنات میں رنگ ہے، اور بقول کسی فلسفی دنیا کی سب سے بڑی مصیبت ہونے کے باوجود اس سے مفر نہیں، وہ عورت جو کسی بھی پیغمبر، ولی، عبقری، جینئس، مفکر وفلسفی کی اولین درسگاہ وگہوارۂ تربیت ہے اس عورت کے بارے میں زمانۂ قدیم سے ہی فلاسفہ ومفکرین اور علمبرداران تہذیب کی آراء، مختلف، اہانت آمیز اور ناگفتہ بہ رہی ہیں، مشہور مصری عالم محمد قطب اپنی کتاب "شبهــــات حــول الإســلا م ص ۱۰٦" میں لکھتے ہیں:

قدیم یورپ بلکہ دنیا بھر میں عورت کو کوئی قدر ومنزلت حاصل نہیں تھی، قدیم علماء اور فلاسفہ عرصہ دراز تک اس کے بارے میں کچھ اس قسم کے موضوعات پر سر کھپاتے رہے کہ "کیا عورت میں بھی روح ہوتی ہے؟ اگر اس میں روح ہوتی ہے تو یہ انسانی روح ہے یا حیوانی روح؟ اور اگر انسانی روح ہے تو مرد کے مقابلہ میں اس کا صحیح معاشرتی مقام کیا ہے؟ کیا عورت پیدائشی طور پر ہی مرد کی غلام ہے یا غلام سے اس کا مقام کچھ اونچا ہے؟" (۱)

ڈاکٹر بہی الخولی لکھتے ہیں:

زمانۂ قدیم میں عورت کو ایک ناپاک جنس سمجھا جاتا تھا جو روح سے خالی ہو، اسے بیوی کی حیثیت بالکل حاصل نہیں تھی، لیکن جب انھوں نے اس کے ساتھ انصاف کرنا چاہا تو فرانس کے اجلاس منعقدہ ٦٨٥ عیسوی میں یہ بل پاس کیا کہ عورت حیوان نہیں ایک انسان ہے جو مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ (۲)

عورتوں سے متعلق جو بھی خیالات ونظریات کتابوں میں ملتے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا کی قدیم ومشہور چینی وہندی رومی ویونانی کسی بھی تہذیب میں عورت کو کوئی بھی

قانونی یا معاشرتی حق حاصل نہیں تھا، کہیں وہ محض سامان عیش وتفریح تھی تو کہیں اسے جانوروں اور منقولہ اشیاء کی طرح اثاث وراثت سمجھا گیا، اسے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا حق تھا اور نہ شوہر کی وفات کے بعد زندہ رہنے کا حق (۳) عرب قبائل میں بھی عورتوں کے متعلق کچھ اچھے رجحانات نہ تھے، بلکہ بعض قبائل میں تو اسے باعث ننگ وعار سمجھا جاتا تھا اور انہیں زندہ درگور کردیا جاتا تھا جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”وإذا بشر أحدهم بالأنثى ظل وجهه مسودا وهو كظيم، يتوارى من القوم من سوء ما بشربه أيمسكه على هون أم يدسه في التراب، ألا ساء ما يحكمون“ (النحل:۸۵-۹۵)۔

(اوران میں سے کسی کو جب بیٹی (پیدا ہونے) کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ غمزدہ ہوتا ہے، اس دی ہوئی خبر کی برائی سے قوم سے چھپتا پھرتا ہے کہ ذلت برداشت کرکے اس لڑکی کو باقی رکھے یا زمین میں گاڑ دے، سنو! برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں)۔

عورتوں کے ساتھ معاشرت، کھانے پینے اور حقوق میں عدم مساوات اور ظالمانہ برتاؤ کو نقل کرتے ہوئے ایک آیت میں بیان کیا ہے:

”وقالوا ما في بطون هذه الأنعام خالصة لذكورنا ومحرم على ازواجنا وإن يكن ميتة فهم فيه شركاء، سيجزيهم وصفهم انه حكيم عليم“ (سورہ انعام:۱۴۰)۔

(اوران مشرکین نے کہا کہ جو بچہ ان چوپایوں کے پیٹ میں ہے وہ خاص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہوتا تو سب اس میں شریک ہوتے، عنقریب اللہ ان کے ڈھکوسلوں کی سزا دیگا وہ حکمت والا جاننے والا ہے)۔

عورت جدید ترقی یافتہ دور میں:

دور حاضر جسے تمدن وثقافت کے اعتبار سے ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے اور جس پر مغربی تہذیب کا غلبہ ہے یہ تہذیب درحقیقت وجود میں آئی ہے قیصر وکلیسا کی جنگ کے نتیجہ میں، جس کی وجہ سے وہ مذہب بیزار بھی ہے اور انسانیت سے عاری بھی، اس تہذیب میں

اخلاق واقدار اور قوانین وضوابط کا معیار خود انکا اچھا یا برا، اور مفید یا مضر ہونا نہیں ہے بلکہ اس کے نزدیک معیار اپنا احساس، اپنی غرض اور اپنی پسند یا ناپسند ہے، اور اس کی اساس مادہ پرستی اور وقتی نفع ہے، جس کے سبب یہ تہذیب جدید یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ خالق کائنات نے نوع انسانی کو دو جنس مذکر ومؤنث کس لیے بنایا ہے، اور دونوں جنسوں میں قوت ومزاج اور صلاحیت کار کے لحاظ سے کیا فرق ہے، مرد وزن کے مقصد تخلیق سے صرف نظر کا ہی نتیجہ ہے کہ اس تہذیب کے پجاری ہم جنس پرستی کے قانونی جواز کا مطالبہ کرتے ہیں، بلکہ بعض ممالک میں اسے قانونی جواز مل بھی گیا ہے۔

اس تہذیب جدید بھی میں عورت کی حیثیت حقیقتاً زمانہ قدیم سے کچھ مختلف نہیں ہے، آج بھی عورت محض سامان تفریح اور ایک خادمہ کی حیثیت میں ہے مگر اس کی اس حیثیت پر خوبصورت اور جذباتی الفاظ اور نعروں کا کور اور غلاف چڑھا دیا گیا ہے، اس تہذیب جدید نے بھی عورت کے مقصد تخلیق سے تجاہل برتتے ہوئے، اسے محض اپنی لذت وشہوت کی تسکین وتکمیل کا سامان سمجھا اور ظلم یہ کیا کہ اس کے جسمانی نظام وساخت اور صنفی نزاکت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے نفقہ کی ذمہ داری سے بھی سبکدوش رہنا چاہا، اور ان دونوں اغراض کے حصول کے لیے اس نے مساوات اور آزادئ نسواں کا کھوکھلا نعرہ لگایا اور اسلام نے عورت کی خلقت و وظیفۂ عمل کے پیش نظر اس کے ساتھ جو رحمت وشفقت اور عظمت وتحفظ کا معاملہ کیا اسے قید وظلم سے تعبیر کرتے ہوئے لوگوں کو مذہب سے بیزار کرنے کا بھی کام لیا، جبکہ اسلام نے عورت کو جو مقام بلند بخشا ہے وہ بالکل اس کی فطرت وطبیعت اور اس کے مرتبہ کے مطابق ہے اور وہ معزز مقام آج تک عورت کو نہ کسی تہذیب نے دیا ہے اور نہ اس سے بہتر اور بلند مقام کی آئندہ امید کی جا سکتی ہے۔

عورت کا مقام اسلامی معاشرہ میں:

اسلامی دستور وشریعت کی دونوں بنیادی اساس، قرآن وحدیث میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، اچھا معاملہ اور ان کی عزت واحترام اور حقوق شناسی سے متعلق بے شمار نصوص موجود ہیں جو کسی بھی خاندانی نظام کی استواری، معاشرہ کی پاکیزگی اور باہمی الفت

ومودت کے لیے ضروری اور حق تلفی سے احتراز اور نفس پرستی وخود غرضی سے دور رہنے کے لیے تازیانہ ہیں، ان نصوص سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت کی ایک مسلمہ حیثیت اور باعزت مقام ہے اور معاش انسانی کے نظام میں اس کی طبیعت ومزاج کا لحاظ کرتے ہوئے اسے شریک کار وحصہ دار بنایا گیا ہے اور مردوں کی طرح اس کو بھی حقوق واختیارات حاصل ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی تعلیمات پر غور کرنے کے بعد ہر انصاف پسند، سنجیدہ مزاج اور سلیم الطبع یہ باور کرنے پر مجبور ہوگا کہ اسلام نے عورتوں سے متعلق جو احکام وتعلیمات دی ہیں وہی درحقیقت اس کے ساتھ انصاف اور مساوات کے مرادف ہیں کیونکہ مساوات اور آزادی کا مفہوم اشیاء واشخاص کے لحاظ سے ہی متعین ہوتا ہے، مغربی تہذیب عورتوں سے متعلق جس مساوات اور آزادی کی بات کرتی ہے وہ مساوات اور آزادی تو اس تہذیب میں بلکہ کسی بھی قوم میں خود مردوں کو حاصل نہیں ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کسی بھی مملکت کا صدر اور اس کا ایک عام آدمی کلی طور پر ایک دوسرے کے مساوی ہوں، یا کسی عام آدمی کو اس کی آزادی حاصل ہے کہ وہ صدر مملکت کی وردی میں ملبوس ہو؟ جس طرح ملکی نظام میں بہت سارے حقوق میں مساوات کے ساتھ کچھ نہ کچھ فرق وامتیاز ہوتا ہے بعض کو بعض پر فضیلت ہوتی ہے، اسی طرح خاندانی اور معاشرتی نظام میں بھی عورتوں اور مردوں میں بہت سارے حقوق میں مساوات ہونے کے باوجود مردوں کو عورتوں پر اس اعتبار سے فوقیت ہے کہ وہ ان کے منتظم، محافظ ونگراں اور کفیل ہیں، مردوں کی ذمہ داریاں کچھ اور ہیں اور عورتوں کی ذمہ داریاں کچھ اور، ہم اگلی سطور میں قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ مرد وعورت دونوں کی خلقت مزاج اور وظیفۂ عمل کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے اور اسے عزت واحترام کے کس مرتبہ سے سرفراز کیا ہے، جو عزت واحترام اور مقام دوسری تہذیب واقوام کبھی بھی اسے نہیں دے سکتیں۔

عورت بھی مرد کی طرح انسان ہے:

قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس امر کی وضاحت ملتی ہے کہ مبدأ تخلیق کے

لحاظ سے مرد وعورت میں کوئی تفریق نہیں ہے، بلکہ سب سے پہلی عورت حواء کی تخلیق مرد سے کر کے اس جذبہ عاطفت کو بیدار کیا گیا ہے کہ عورت مرد کا ایک جزو وحصہ ہے اور اسی کے خمیر سے بنی ہے، لہذا اس کے ساتھ محبت وشفقت کا ہی جذبہ رکھنا چاہئے، ورنہ اس پیدا کرنے والے نے جس طرح مرد کو بغیر کسی نفس کے پیدا کیا ہے عورت کو بھی الگ سے پیدا کرسکتا تھا، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

”یاایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدہ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء واتقوا اللہ الذی تساء لون بہ والأرحام، إن اللہ کان علیکم رقیبا“ (سورہ نساء آیت:۱)۔

(اے انسانو! اپنے اس رب سے ڈور جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا تخلیق کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد وعورت پھیلائے اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اور انساب رحمی کا لحاظ کرو (قطع رحمی سے ڈرو) بیشک اللہ تم پر نگراں ہے)۔

قرآن کریم کی یہ آیت پیغام دے رہی ہے کہ عورت کی تخلیق نفس واحدہ آدم سے ہوئی ہے، لہذا وہ بھی آدمی اور انسان ہے، پھر اللہ تعالی نے ایک نظام کے تحت ان دونوں کے اشتراک سے دوسرے تمام مرد وزن کو وجود بخشا، آگے مزید تنبیہ فرمائی کہ وہ رشتے جو رحم (عورت کی ذات) سے قائم ہیں ان کو نبھاؤ، ان کو توڑنے سے ایسا ہی ڈرو جیسا کہ تم اس اللہ سے ڈرتے ہو جس کے توسط سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اس سلسلہ کی کوئی کوتاہی اللہ سے مخفی اور پوشیدہ نہیں رہے گی۔

اس موقع پر ایک ضمنی بات جس کا مستقلاً ذکر کسی مناسبت سے کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں بھی عورتوں اور ان کے حقوق کا ذکر کیا ہے وہاں تقوی اختیار کرنے اور اللہ سے ڈرنے کا بھی حکم ضرور کیا ہے۔ ایک دوسری آیت میں اس مضمون کی وضاحت کرتے ہوئے کہ عورت کی تخلیق بھی اسی مادہ سے ہوئی ہے جس مادہ سے مرد کی تخلیق ہے، ارشاد ربانی ہے:

"فجعل منه الزوجين الذكر والأنثى" (سورہ قیامۃ آیت:۹۳)۔
(پھر اسی نطفہ اور علقہ سے دونوں صنف مذکر اور مؤنث کو بنایا)۔

اس آیت قرآنی نے واضح طور پر یہ پیغام دیا ہے کہ مبدأ تخلیق مرد وزن کا ایک ہی ہے اور مرد وعورت دونوں ہی مذکر ومؤنث کے اشتراک سے وجود میں آئے ہیں، لہٰذا انسان ہونے میں دونوں میں کوئی فرق وتفاوت نہیں، اور نہ مذکر ومؤنث ہونے کے لحاظ سے کسی کو برتری اور اعزاز حاصل ہے، بلکہ ایک آیت میں اس مضمون کو بھی ذکر کردیا کہ اللہ کے نزدیک شرف وکرامت تو محض تقوی کی بنیاد پر ہے خواہ وہ متقی مرد ہو یا عورت، قرآن کریم کی آیت ہے:

"يايها الناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم إن الله عليم خبير" (سورہ حجرات آیت:۳۱)۔
(اے لوگو! ہم نے تم کو مذکر ومؤنث سے پیدا کیا ہے اور تم کو شاخوں اور قبیلوں میں اس لیے بنایا ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بلاشبہ تم میں کا سب سے معزز اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، بیشک اللہ جاننے والے خبر رکھنے والے ہیں)۔

بندگی اور عمل صالح کا حق مرد وعورت دونوں کو یکساں طور پر حاصل ہے:

مذکورہ آیت قرآنی سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے انسان خواہ مذکر ہوں یا مؤنث، مذکر ومؤنث کے اختلاط واشتراک سے پیدا ہوئے ہیں وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اعزاز واکرام کا حق بھی کسی خاص جنس کو حاصل نہیں بلکہ بلا امتیاز تذکیر وتانیث اور بلا تفریق شعوب قبائل ہر ایک کو یہ موقع حاصل ہے کہ اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقام بلند حاصل کرسکے، یہ مضمون ایک دوسری آیت میں صراحتاً مذکور ہے:

"ومن يعمل من الصالحات من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فأولئك يدخلون الجنة، ولايظلمون نقيرا" (سورہ نساء آیت:۴۲۱)۔
(اور مذکر ومؤنث میں سے جو لوگ بھی اچھا عمل کریں گے اس حال میں کہ وہ مومن ہوں تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور کچھ بھی ظلم نہیں کیے جائیں گے)۔

"ومن عمل صالحا من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فلنحيينه حياةً طيبةً ولنجزينهم اجرهم بأحسن ماكانوا يعملون" (سورہ نحل:۹۷)۔

(مومن ہوتے ہوئے مذکرومؤنث میں سے جس نے بھی اچھا عمل کیا تو ہم اسے بہترین زندگی دیں گے اوران کواس سے بہتر اجر دیں گے جووہ کرتے تھے)۔

ان جیسی آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی عبادت کرنے اور عمل صالح بجالانے کا پورا حق حاصل ہے، بلکہ اعمال کی بنیاد پر بسا اوقات کوئی عورت کسی مرد سے عنداللہ فائق اور برتر بھی ہوسکتی ہے، جیسا کہ إن أكرمكم عند الله أتقاكم کے اطلاق سے ظاہر ہوتا ہےاور یہ کہ اللہ تعالیٰ تذکیر وتانیث کی اساس پر کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتے، ایمان کے ساتھ کسی کا بھی عمل صالح ،اللہ کے نزدیک قابل قبول ہےاوروہ جنت میں جانے کا مستحق ہے،ایک دوسری آیت سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

"فاستجاب لهم ربهم أني لا أضيع عمل عامل منكم، من ذكر أو أنثى بعضكم من بعض ...... الآية" (سورہ آل عمران آیت:۱۹۵)۔

(تو ان کے رب نے ان کی (دعا کو) قبول کیا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، مذکر ہو یا مؤنث، تم میں کے بعض، بعض سے ہیں)۔

یہ اوراس جیسی دیگر متعدد آیات سے اسلام میں عورتوں کے مقام کا پتہ چلتا ہے کہ وہ انسان ہونے میں، عبادت اور عمل صالح کے بجالانے میں اور اجر وثواب کے مستحق ہونے میں مردوں کے مثل اور ہم پلہ ہیں۔

عورت کوحقوق بھی حاصل ہے:

اسی طرح معاشرتی زندگی میں بھی عورتوں کو مردوں کی طرح بہت سارے حقوق کے مالک ہونے کا حق حاصل ہے، دیگر تہذیب ومذاہب کی طرح وہ اسلامی معاشرہ میں حقوق سے محروم نہیں ہے اوران حقوق کے استحقاق کا ثبوت قرآن کریم سے ملتا ہے، ایک آیت میں مذکور ہے:

"ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة والله عزیز حکیم" (سورہ بقرۃ آیت:۲۲۸)۔
(اور ان کے لیے (حقوق) ہیں اسی کے مثل جیسا کہ ان پر ہیں، بھلائی کے ساتھ اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت ہے، اور اللہ غالب ہیں حکمت والے ہیں)۔

یہ آیت قرآنی صراحتاً اس کا حکم دے رہی ہے کہ ازدواجی زندگی میں جس طرح بیویوں پر شوہروں کے بہت سارے حقوق لازم ہیں ویسے ہی شوہروں پر بیویوں کے حقوق واجب ہیں، البتہ معاشرتی نظام کے تحت مردوں کو عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے جیسا کہ کسی بھی نظام کو قائم رکھنے کے لئے اسکے قانون میں سربراہ کو ماتحتوں پر برتری حاصل ہوتی ہے، اس آیت کی تفسیر میں مذکور ہے:

"أی لهن من حقوق الزوجیة علی الرجال مثل ما للرجال علیهن"(۴)
(یعنی عورتوں کے لیے زوجیت کے حقوق مردوں پر ثابت ہیں جیسا کہ مردوں کے لیے عورتوں پر ہیں)۔

یہ حقوق مادی ہوں یا معنوی، نفقات، باہمی تعاون، رائے مشورہ، محبت و الفت ہر ایک کو شامل ہیں حتی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

"إنی لأتزین لامرأتی کما تتزین لی، وما أحب أن استنظف کل حقی الذی لی علیها فتستوجب حقها الذی لها علیّ، لأن الله تعالیٰ قال: ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف"(۵)
(میں اپنی اہلیہ کے لئے ایسا ہی زینت اختیار کرتا ہوں جیسا کہ وہ مرے لئے زینت کرتی ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے وہ تمام حقوق حاصل کرلوں جو مرے اس پر عائد ہوتے ہیں کہ وہ بھی مرے اوپر اپنے ان تمام حقوق کو واجب کر دے جو اس کے مجھ پر لازم ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بھلائی کے ساتھ ان کے بھی حقوق ہیں جیسا کہ ان پر حقوق ہیں)۔

وللرجال علیهن درجة کی تفسیر میں اگرچہ وہ اقوال بھی منقول ہیں جو ایک نگراں اور ذمہ دار کو اپنے ماتحتوں پر مرتبہ حاصل ہونے کے مرادف ہیں جن کے صحیح ہونے

میں کوئی کلام نہیں اور جو "الرجال قوامون علی النساء" کے ہم معنی ہیں، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں ایک قول یہ بھی منقول ہے جو دیگر اقوال کے معارض بھی نہیں ہے، فرماتے ہیں:

"الدرجة إشارة إلى حض الرجال على حسن العشرة والتوسع للنساء في المال والخلق"(٦)

(الدرجہ (فضیلت) اشارہ ہے مردوں کو ترغیب دینے کی جانب عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت اور مال واخلاق میں ان پر توسع کی جانب۔

یعنی مردوں کو جو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کے ساتھ حاکمانہ، ظالمانہ اور جابرانہ معاملہ کریں۔ بلکہ ان کے ساتھ حسن اخلاق اور معاملات میں توسع، رفق اور ملاطفت کا طریقہ اپنائیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورتوں کو بھی حقوق حاصل ہیں اور ہم نے اس کے استشہاد کے لئے قرآن کریم کی آیات سے وہ حصہ پیش کیا ہے جو معاملات زوجیت سے متعلق ہے، کیونکہ خود اسلام میں شوہر کو جو عظیم مرتبہ حاصل ہے اس کے پیش نظر زیادہ امکان تھا کہ عورت حقوق سے محروم ہو، مگر بیوی ہونے کے باوجود شوہر پر اس کو حقوق کا حاصل ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ دوسرے حقوق اسے بدرجہ اولی حاصل ہوں گے، ہم یہاں مختصراً چند خاص حقوق کا ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔

حق ملکیت:

جس طرح مردوں کو کسی مال و جائیداد کے مالک ہونے کا حق حاصل ہے، اسی طرح اسلامی معاشرہ میں عورتوں کو بھی اشیاء منقولہ وغیر منقولہ کی ملکیت کا حق حاصل ہے، اور ملکیت کے جو بھی اسباب وذرائع ہیں مثلاً وراثت، خرید وفروخت، ہبہ وعطیہ، ان سارے ذرائع سے اس کی ملکیت ثابت ہے، اور اپنی ملکیت میں تصرف کا بھی انکو مکمل اختیار حاصل ہے، اور ان کی مرضی کے بغیر ان کے مال میں کسی دوسرے کو تصرف کا اختیار نہیں، قرآن کریم کی آیت ہے:

"وآتوا النساء صدقاتهن نحلة فإن طبن لكم عن شئ منه نفسا فكلوه هنيئا مريئاً" (سورۃ النساء آیت:۴)۔

(اور دو عورتوں کو ان کی مہر خوشی سے، پھر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تمہارے لئے چھوڑ دیں تو اس کو کھاؤ خوب شوق سے)۔

زمانۂ جاہلیت میں کوئی شخص کسی یتیم لڑکی سے شادی کرتا تھا اور اس کی مہر نہیں دیتا تھا، یا عورت کے اولیاء ان کی مہر پر قبضہ کر لیتے تھے انہیں نہیں دیتے تھے، قرآن کریم نے اپنے بلیغانہ انداز میں دونوں کو ہی خطاب کیا ہے کہ عورتوں کی مہر ان کے حوالہ کریں، اور اس مہر کے ان کی ملکیت ہونے کے لیے صراحتاً صدقات کی اضافت ان عورتوں کی طرف کیا، پھر مزید اس کو مؤکد کرتے ہوئے یہ کہا کہ اگر وہ اپنے اندر سے راضی ہوں تو تم کو اس مال سے کھانے کی اجازت ہے ورنہ نہیں، اس مضمون کو ایک دوسری آیت میں ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے:

"فما استمتعتم به منهن فآتوهن أجورهن فريضة ولاجناح عليكم فيما تراضيتم به من بعد الفريضة إن الله كان عليما حكيما" (سورۃ النساء آیت:۲۴)۔

(پھر جو تم نے ان سے استمتاع کیا تو ان کو ان کی مہر دو مقرر کی ہوئی اور تم پر کوئی حرج نہیں اس کے بارے میں جن پر تم دونوں راضی ہو جاؤ مقرر کئے ہوئے کے بعد بیشک اللہ علم والے حکمت والے ہیں)۔

جس مہر کو گذشتہ آیت میں ایک خاص تأثر دینے کے لیے کہ مہر کی ادائیگی صدق دل سے بطور عطیہ کے ہو اسے بار نہیں محسوس کرنا چاہئے، صدقات اور نحلہ سے تعبیر کیا ہے اسی کو یہاں اجر اور فریضہ سے تعبیر کیا ہے کہ اس سبب سے کہ تمہارے لیے ان سے استمتاع حلال ہو گیا اس کا اجر انہیں دو اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا ہوا حق ہے، اور یہ اجر و مہر صرف عورت کے لیے ہی ہے مردوں کے لئے نہیں ہے، جبکہ عورت کو بھی جنسی سکون ملتا ہے، اس لئے کہ عورت نکاح کے بعد اس شوہر کی پابند ہوتی ہے اور مرد کو اس کے علاوہ دیگر ازواج سے بھی استمتاع کا حق ہوتا ہے۔

عورتوں کے لیے مال حاصل کرنے اور اس کا مالک ہونے پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے جو درحقیقت میراث میں فرق سے متعلق نازل ہوئی ہے:

"للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن"
(سورۃ نساء آیت:۳۲)۔
(مردوں کو حصہ ہے اس سے جو انھوں نے کمایا اور عورتوں کے لیے حصہ ہے جو انھوں نے کمایا)۔

حق وراثت:

اسلام سے پہلے عورتوں کے لیے حصۂ وراثت کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ وہ خود شوہر کی وفات کے بعد دیگر اشیاء کی طرح ورثہ کی طرف وراثۃً منتقل ہوتی تھیں، اور آج بھی بہت سی اقوام اور قوانین میں عورت کا وراثۃً کوئی حصہ نہیں ہوتا، بلکہ خود مغربی ممالک کا حال یہ تھا کہ گیارہویں صدی عیسوی تک بیوی کی خرید وفروخت بھی ہوتی تھی (۷)۔ مگر اسلامی معاشرہ میں عورتوں کو حقوق وراثت حاصل ہیں، اور اسلام نے عورت کو ماں، بیٹی، بہن، بیوی ہر حیثیت سے وراثت میں مناسب حصہ دیا ہے اور ورثہ کا یہ حصہ کسی حدیث یا قول فقیہ کے ذریعہ نہیں بلکہ خود خالق کائنات کی طرف سے مقرر ہے، جس کا انکار کفر اور اس کے مطابق عمل نہ کرنا فسق ہے، قرآن کریم کی سورۂ نساء کی آیت ۱۱ تا ۱۴ میں اس کی تفصیل مذکور ہے، جس کی ابتدا اس طور پر ہوتی ہے کہ:

"یوصیکم الله فی أولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین ...... الآیة"
(سورۂ نساء آیت ۱۱ و ۱۲)
(اللہ تم کو حکم کرتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے)۔

پھر اس کی پوری تفصیل مذکور ہے کہ کب بیوی کو ایک چوتھائی اور کب آٹھواں حصہ ملے گا، کب ماں کو چھٹا حصہ اور کب ایک تہائی حصہ ملے گا، کب بہن، بیٹی کو آدھا اور کب دو تہائی ملے گا، اور ان کے بالمقابل موجود مرد کو کیا ملے گا۔

پھر تیرہویں آیت میں یہ صراحت کردیا کہ یہ اللہ کے حدود اور احکام ہیں جو ان کی اطاعت اور پیروی کرے گا اس کے لیے جنت اور کامیابی ہے اور اس کے بعد یہ وعید

اور تنبیہ مذکور ہے:

"ومن يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله ناراً خالداً فيها وله عذاب مهين" (آیت:۱۴)۔

(اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا تو اللہ اس کو آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہنے والا ہوگا اور اس کے لیے توہین آمیز عذاب ہے)۔

لہٰذا کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں کہ کسی بھی عورت کو اس کی وراثت سے محروم کرے، یہ اس کا اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا حق ہے جس کی خلاف ورزی حدود اللہ سے تجاوز ہے اور اس پر سخت عذاب کی وعید ہے۔

حق نفس (خود اختیاری):

اسی طرح سے اسلام نے عورت کو اس کے نفس پر اسے اختیار دیا ہے، اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح درست نہیں ہوگا، اور اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا ولی کسی کے ساتھ کر دیتا ہے تو بالغ ہوتے ہی لڑکی کو اس نکاح کے فسخ کا اختیار ہوتا ہے، عورت کا یہ حق بھی قرآن کریم کی نصوص سے ثابت ہے، ارشاد ربانی ہے:

"وإذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن فلا تعضلوهن أن ينكحن ازواجهن إذا تراضوا بينهم بالمعروف ذلك يوعظ به من كان منكم يومن بالله واليوم الآخر ذلك ازكى لكم واطهر والله يعلم وأنتم لاتعلمون" (سورۂ بقرہ آیت:۲۳۲)۔

(اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو ان کو منع مت کرو کہ وہ اپنے (سابق) شوہروں سے نکاح کریں جب کہ وہ آپس میں بھلائی کے ساتھ راضی ہو جائیں یہ نصیحت کی جاتی ہے اس کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، یہ تمہارے لیے زیادہ صاف اور پاکیزہ ہے، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے)۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں مذکور ہے:

"والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجاً يتربصن بانفسهن أربعة أشهر وعشراً فاذا بغلن أجلهن فلا جناح عليكم فيما فعلن فی أنفسهن بالمعروف والله بما تعملون خبير" (سورہ بقرہ آیت:۲۳۴)۔

(اور تم میں سے وہ لوگ جو وفات پا جائیں اور چھوڑتے ہیں بیویاں تو وہ روکے رکھیں گی اپنے کو چار مہینے اور دس دن، پھر جب اپنی عدت کو پورا کرلیں تو تم پر کوئی حرج نہیں جو وہ اپنے بارے میں معروف طور پر کریں، اور جو بھی تم کروگے اللہ خبر رکھنے والا ہے)۔

ان دونوں آیتوں میں فعل نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے، اور مردوں کو ان کے اختیار میں دخل اندازی سے منع کیا گیا ہے جبکہ ان کا یہ عمل معروف اور شرعی طریقہ پر ہو، شرعی حدود سے وہ کسی بھی صورت میں آزاد نہیں جیسے کوئی شہری ملکی قوانین سے آزاد نہیں ہوتا، اور یہ پابندی اس کی آزادی کے منافی شمار نہیں کی جاتی، عورتوں کے اس حق کے بارے میں احادیث نبوی میں یہ تشریح ملتی ہے:

"إن النبی صلی الله عليه وسلم قال: الأيم أحق بنفسها من وليها والبكر تستأذن فی نفسها وإذنها صماتها"۔(۸)

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ثیبہ عورت (غیر کنواری) اپنے ولی سے زیادہ اپنے نفس کی مستحق ہے اور باکرہ (کنواری) عورت سے اس کے بارے میں اجازت لی جائے گی، اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہوگی)۔

لہٰذا عورت کنواری ہو یا غیر کنواری بالغ ہو جائے تو وہ اپنے نفس کی مالک ومختار ہوتی ہے، اب بغیر اس کی اجازت اور مرضی کے کسی کے لیے اس کا نکاح کسی کے ساتھ کرنا درست نہیں ہوگا، اگرچہ معاشرہ کے مطابق ان کے نکاح کے امور ان کے اولیاء انجام دیں۔

حق مساوات:

سطور بالا سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کو مرد کے مساوی حقوق حاصل ہیں، خواہ اس کے انسان ہونے کا مسئلہ ہو جو دور قدیم میں مختلف فیہ اور زیر بحث رہا ہے، یا اس کے عبادت کرنے اور اجر وثواب کے مستحق ہونے کا ہو یا حق ملکیت

وراثت ہو، یا نکاح کرنے کا حق ہو، اسی طرح عورت کی نسوانیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے تعلیم حاصل کرنے اور اس کے ملازمت کرنے کا حق، ان سارے حقوق میں اسلام نے اپنے معاشرہ میں عزت واحترام کا مقام دیتے ہوئے اسے ان کا مستحق قرار دیا ہے۔

البتہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان سارے حقوق میں کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے، مثلاً عورت کا اپنے پورے ایام میں عبادت کا اہل نہ ہونا، وراثت میں مرد کے نصف حصہ پانا، نکاح میں بیک وقت ایک شوہر کے نکاح میں رہنا جبکہ مرد کو چار عورت سے نکاح کی اجازت حاصل ہے، آزادانہ طور پر بغیر شوہر کی اجازت اور شرعی حدود کا لحاظ کئے مال حاصل کرنے کے اسباب، ملازمت یا کوئی عمل کرنے کی اجازت نہ ہونا وغیرہ جن سے یہ شک اور اعتراض ہوتا ہے کہ عورت کو اسلام میں مساویانہ حقوق حاصل نہیں، اور اسے قید و بند کی صورت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

مگر یہ اعتراض درحقیقت اسلام کے مکمل احکام پر عدم عبور اور اس کے رموز واسرار سے لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، عورت کی تخلیق، اس کی جسمانی واندرونی ساخت، اس کی فطرت وطبیعت، قوت تحمل اور اس کے خاص مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے کسی بھی نظام حیات کے رموز سے واقف شخص، ان ضمنی تفاوت وفروق کو عدم مساوات سے تعبیر نہیں کرے گا بلکہ اسے عین انصاف بلکہ فضل واحسان سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوگا، ہم نے ابتدائی سطور میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی بھی تہذیب یا قانون میں اس کے ماننے والوں کو علی الاطلاق ہر حیثیت اور اعتبار سے مساوات حاصل ہو یہ ایک غیر ممکن اور اس قانون کے ناپائیدار اور غیر مستحکم ہونے کے مرادف ہے۔ کیا کسی قانون میں ایک عام آدمی کو وہی اختیارات حاصل ہیں جو اس کے صدر مملکت کو حاصل ہیں، کیا کسی ادارہ اور آفس کے ہر ملازم اور کام کرنے والے کا منصب، اس کی تنخواہ اور اجرت عمل یکساں ہوتی ہے، اور کیا مساوات کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ عورت کی کفالت اور اس کے نفقہ سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اسے آفسوں اور اداروں میں گھسیٹنے والے عمل تولید میں اس کے وظیفہ کو انجام دیکر مساوات کا عملی نمونہ پیش کرسکیں، ہم اس خیالی اور پُرفریب ظالمانہ مساوات کی تردید میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے مشہور مفکر ''برنارڈ شا'' کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

''عورت کو جو ذمہ داری سونپی گئی ہے اس سے کوئی قوم مستغنی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس کا بدل پیش کرسکتی ہے، وہ نو مہینے تک حمل کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے پھر اسے جنتی ہے اور اس کی تربیت کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے گھر کے انتظام وانصرام میں اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں لگا دیتی ہے، اور اس خدمت پر وہ اس سے کسی معاوضہ کی طلبگار نہیں ہوتی، اسی بنا پر احمق اور جاہل قسم کے لوگ اس کے ان کاموں کو ''کام'' بھی نہیں مانتے، اور جب ''کام کرنے'' کا ذکر آتا ہے تو تذکرہ مردوں کا ہوتا ہے، حالانکہ مرد کی ساری جانفشانی روزی کمانے کے گرد گھومتی ہے اور اس کی ساری سعی وجہد کا محور تنہا ایک لقمۂ عیش کا حصول ہوتا ہے، کچھ لوگ عورتوں کو بھی اسی کام پر لگانا چاہتے ہیں، مگر یہ ان کی جہالت وحماقت ہے کیونکہ یہ عورتوں کا میدان ہے ہی نہیں۔ اس کا اصل میدان تو اس کا گھر ہے اور ازل ہی سے اس کے لیے یہ کام مقدر کردیا گیا ہے، کیونکہ سوسائٹی کو زندہ رکھنے اور اسے فروغ دینے کے لیے ناگزیر بھی تھا، سیکڑوں مرد معمولی کاموں میں اپنی زندگیاں ختم کردیتے ہیں اور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی عورتوں کی کفالت کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں، اس کے باوجود وہ مغرور ہوتے ہیں اور حقیقت تک پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے۔(۹)

عورت کی خلقت، صنفی نزاکت، فطرت وطبیعت اور نسوانی عوارض وخصوصیات کے پیش نظر خالقِ کائنات نے مرد کو اس کا نگراں ومحافظ اور کفیل بنایا ہے، اور یک گونہ فضیلت دیتے ہوئے کچھ امور میں اس کو برتری بخشی ہے جو نظام قانون اور فطرت کے عین مطابق ہے، آئندہ سطور میں ہم اس برتری اور فضیلت کی مناسب وجوہات واسباب کو مختصراً بیان کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

عورت نفقہ کی ذمہ داری سے مستغنی ہے:

اسلامی معاشرہ میں عورت خود اپنے نفقہ کی ذمہ داری سے بھی مستغنی ہے، عورت کی ہر حالت میں شریعت اسلامیہ نے اسکا نفقہ دوسروں کے ذمہ رکھا ہے، جب تک اس کی شادی نہ ہو اس کی کفالت اس کے والد کے ذمہ ہے، شادی ہونے کے بعد اس کے نفقہ کا

ذمہ دار اس کا شوہر ہوتا ہے اور اگر مطلقہ ہو کر اپنے والد کی طرف آتی ہے تو اس کا نفقہ اس کے والد کے ذمہ لوٹ آتا ہے، والد کے نہ ہونے کی صورت میں اس کی کفالت اس کی اولاد یا اس کے دوسرے رشتہ دار بھائی وغیرہ کے ذمہ آتی ہے۔ اور کسی کے نہ ہونے کی صورت میں اس کا نفقہ حکومت اور بیت المال سے پورا کیا جاتا ہے، (دیکھئے کتب فقہ) اس معنی میں مرد کو اس پر فوقیت حاصل ہے، اور اسی بنا پر نظام معاشرت کو قائم رکھنے کے لئے مردوں کو کچھ زائد حقوق حاصل ہیں جو عورتوں کو حاصل نہیں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسے کمانے کے لیے ملازمت اور دوسرے عمل کی ضرورت نہیں رہ جاتی پھر بھی وہ کوئی عمل، پیشہ یا ملازمت کرنا ہی چاہتی ہے تو شرعی حدود کا لحاظ کرتے ہوئے شوہر، والدین یا اپنے کفیل کی اجازت سے وہ یہ اعمال ادا کرسکتی ہے، اس مفہوم پر قرآن کریم کی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

"الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله بعضهم علی بعض وبما انفقوا من أموالهم، فالصالحات قانتات حفظت للغيب بما حفظ الله، والتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن فان اطعنكم فلا تبغوا عليهن سبيلا إن الله كان عليا كبيرا" (سورۂ نساء آیت:۳۴)۔

(مرد عورتوں کے نگراں ہیں اس سبب سے جو اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس سبب سے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں چنانچہ نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں، غیر موجودگی میں (ان حقوق کی) جن کی اللہ نے حفاظت کیا ہے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں، اور جن عورتوں سے تم کو سرکشی کا اندیشہ ہو تو پہلے انھیں سمجھاؤ، پھر انہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو، پھر انہیں مارو، تو اگر وہ تمہاری اطاعت کرلیں تو ان کے خلاف کارروائی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اللہ سب کے اوپر، سب سے بڑا ہے)۔

مرد کو عورت پر فضیلت کا مطلب:

قوام مبالغہ کا صیغہ ہے جو مصدر قیام سے مشتق ہے، اس کا استعمال متعدد معانی کے لئے ہوتا ہے، عربی لغت القاموس المحیط میں مذکور ہے "قام الرجل المرأة، وعليها: مانها وقام بشأنها" یعنی اس کا خرچ برداشت کیا اور اس کی کفالت کیا، لہذا "قوامون علی

النساء'' کا معنی ہوا عورتوں کے خرچ کی ذمہ داری اٹھانے والے اور انکی کفالت کرنے والے۔

کسی بھی نظام میں ایک امیر اور متبوع کا ہونا لازم ہے اسی قانون کے تحت مرد کو نگراں اور عورت کو تابع بنایا گیا ہے اور اسی قانون نظامی کے تحت مرد کو منتظم اور عورت کی ضروریات کا پورا کرنے والا بنایا گیا ہے، کسی بھی نظام میں قانون سزا بھی ایک لازمی شئ ہے جس کے تحت خاندانی نظام میں مرد کو یہ اجازت ہے کہ وہ عورت کی سرکشی کی صورت میں اسے تنبیہ کرے پہلے سمجھائے، پھر اس کا بستر الگ کرے پھر بھی اصلاح نہ ہو تو چہرہ کو بچاتے ہوئے ہلکی مار مارے، جانوروں کی طرح نہ پیٹے جیسا کہ حدیث نبوی سے اس کی وضاحت ہوتی ہے،اس مار کی اجازت کو ظلم سے تعبیر کرنا انتظامی رموز وامور سے نظر چرانا ہے۔

مرد کی اسی بالادستی اور ذمہ داری کو ایک دوسری آیت میں بھی ذکر کیا ہے، مگر انداز بیان دیکھئے کہ پہلے یہ دلنشیں کرایا کہ مردوں پر عورتوں کے بھی حقوق ہیں جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں پھر اس بالادستی کا تذکرہ کیا، اشاد ہے:

''ولهن مثل الذى عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة والله عزيز حكيم'' (سورۂ بقرہ:۲۲۸)۔

(اور ان عورتوں کے لئے اسی کے مثل حقوق ہیں جیسا کہ ان عورتوں پر ہیں اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت حاصل ہے اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے)۔

اور دونوں جگہ آیت کے اختتام پر ایک تنبیہ مذکور ہے کہ اللہ غالب ہے، حکمت والا ہے، سب سے بڑا اور سب سے اوپر ہے اس نے اپنی حکمت سے یہ نظام بنایا ہے اس کا غلط استعمال نہیں ہونا چاہئے۔

وراثت میں فرق کا سبب:

خاندانی نظام میں عورتوں اور مردوں کے مراتب کو سامنے رکھا جائے تو تقسیم وراثت میں مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق کی وجہ ظاہر ہوجاتی ہے کہ مال خرچ کرنے کی ذمہ داری مرد کی ہے، لہٰذا اسے زیادہ مال کی ضرورت ہے، کیونکہ نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ہے، مہر کی ادائیگی مرد کے ذمہ ہے، اولاد کا نفقہ مرد کے ذمہ ہے، جبکہ عورت ان تمام حقوق

سے سبکدوش اور مستغنی ہے، میں یہاں وہ مثال پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو شیخ محمد علی صابونی نے اپنی کتاب' المواریث (ص ۱۸)' میں اور قدسیہ عبد القدوس قاسمی نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہوا اس نے پسماندگان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑی اس کا ترکہ تین ہزار ڈالر تھا اسلامی شریعت کی رو سے لڑکے کو دو ہزار اور لڑکی کو ایک ہزار ڈالر میراث میں ملے، پھر اگر دونوں بھائی بہن اپنی اپنی شادی کرنا چاہیں تو فرض کیجئے لڑکے کی بیوی کا مہر دو ہزار طے پایا تو اس کا کل سرمایۂ میراث تو مہر کی نذر ہو جائے گا، اس کے علاوہ بیوی کا نان، نفقہ اور دیگر اخراجات بھی اس کے ذمہ ہوں گے، دوسری طرف اگر لڑکی کی مہر دو ہزار ڈالر طے پائے تو اس کے پاس مجموعی رقم تین ہزار ڈالر ہو جائے گی، اور خود اس کا خرچ وغیرہ ہونے والے شوہر کے ذمہ ہوگا، عورت کے مال میں اضافہ ہی ہوا اور مرد کا مال اخراجات کی نذر ہو گیا۔ (۱۰)

لہٰذا اس پر قناعت کرنی چاہئے کہ خالق کائنات نے بہت ساری حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر یہ فرق رکھا ہے، اس کا تعلق عورت کے حق مساوات سے نہیں بلکہ معاشرتی ضوابط اور مصلحتوں سے ہے۔

حق نفس اور آزادئ نسواں:

اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے اس دنیا کے نظام کو ایک مقررہ وقت تک باقی وساری رکھنے کے لیے جیسے ہر مخلوقات میں دو صنف بنائی ہے اسی طرح انسان کو بھی مذکر ومؤنث دو صنف بنایا ہے، اور فطری طور پر ایک دوسرے کی طرف میلان بھی پیدا کیا ہے۔ لیکن اس فطری میلان کے آزادانہ استعمال سے وجود میں آنے والی خرابیوں اور ہونے والی اولاد کے ضیاع اور ان کی دیکھ بھال اور تربیت نہ ہونے سے نظام کائنات کی بقاء میں خلل اور فساد سے تحفظ اور سدِّ باب کے طور پر اس نے آزادانہ اختلاط اور قربت سے منع کر دیا ہے اور اسے زنا سے تعبیر کرتے ہوئے وسائل واسباب زنا سے بھی سختی سے روکا ہے، اور زنا کو غلط طریقہ سے تعبیر کیا ہے۔

"ولاتقربوا الزنا إنه كان فاحشة وساء سبيلا" (سورۂ اسراء آیت :)۔

(اور زنا کے قریب نہ جاؤ، کیونکہ وہ کھلی بے حیائی اور برا طریقہ ہے)۔

اس فطری خواہش کی تسکین، اور توالد و تناسل کے ذریعہ نظام کائنات کی بقاء کے لیے خالق کائنات نے نکاح کا طریقہ مشروع کیا ہے، جس کے ذریعہ انسانی زندگی خوشگوار، معاشرہ پاکیزہ، عزت و ناموس محفوظ، زوجین کے درمیان مستحکم الفت و محبت، اولاد تربیت یافتہ، اور گھر آباد رہتا ہے، اس کے ذریعہ ایک دوسرے کے حقوق وابستہ ہوتے ہیں اور ان کی رعایت اور پاسداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، نیز نکاح تمام انبیاء کی سنت، صلحاء اور شرفاء کا طریقہ رہا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

”ومن آیاته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة ان في ذلك لآيات لقوم يتفكرون“ (سورۂ روم:۱۲)۔

(اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ کہ تمہارے لئے تمہارے ہی نفس سے جوڑے بنائے تا کہ تم اس کی جانب سکون حاصل کرو اور تمہارے مابین محبت وشفقت پیدا کیا، بلاشبہ اس میں ایسی قوم کے لیے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتی ہے)۔

ایک دوسری آیت جس میں یہ صراحت ہے کہ نکاح انبیا و مرسلین کا طریقہ رہا ہے، ارشاد ہے:

”ولقد أرسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لهم أزواجا وذرية الآية“ (رعد:۸۳)۔

(اور ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے اور ان کے لئے بیویاں اور اولاد بنائیں)۔

اسی لئے قرآن کریم نے نکاح کا حکم اور اس کی ترغیب دی ہے، ارشاد باری ہے:

”وأنكحوا الأيامى منكم والصالحين من عبادكم وإمائكم إن يكونوا فقراء يغنهم الله من فضله والله واسع عليم“ (سورہ نور آیت:۲۳)۔

(اور تم میں جو مجرد ہوں، اور تمہارے غلاموں اور باندیوں میں جو صالح ہوں، ان کا نکاح کردو، اگر وہ فقیر ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے مالدار کردیگا، اللہ وسعت والا علم والا ہے)۔

اسلام نہیں چاہتا کہ کوئی بھی مرد یا عورت مجرد رہے، نکاح کے قابل ہونے پر

نکاح میں جلدی کرنے کی ترغیب احادیث میں وارد ہے، چنانچہ ایک حدیث میں جن تین کام کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جلدی کرنے کا حکم دیا ہے ان میں ایک مناسب جوڑا مل جانے پر نکاح کرنا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کو ترغیب دیا ہے کہ تم میں سے جو استطاعت (نفقہ وغیرہ) رکھتا ہو اسے شادی کر لینی چاہئے، کیونکہ یہ نگاہ اور عفت کی حفاظت کرتا ہے، اور جو استطاعت نہ رکھے تو پھر وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ رکھنا اس کی شہوانی خواہشات کا توڑ ہے۔(۱۱)

اس نکاح کے نظام پر عمل نہ کرکے آزادانہ اختلاط محض جنسی تسکین کے لیے اشرف المخلوقات کا طریقہ نہیں ہے، نیز اس سے ایک تو مستحکم اور دیرینہ تعلقات برقرار نہیں رہتے، خاندانی نظام ٹوٹ جاتا ہے، اور پھر معاشرہ میں بے حیائی اور امراض عام ہوتے ہیں، جس کا مشاہدہ ہم ان ممالک میں کرسکتے ہیں جہاں اس گندی تہذیب کا رواج عام ہے۔

حکم نکاح میں تفریق:

نکاح کے باب میں بھی اسلام نے مرد وعورت کے درمیان یہ فرق رکھا ہے کہ ایک مرد کو چار عورتوں سے بیک وقت نکاح کی اجازت ہے جبکہ عورت کے لئے یہ پابندی ہے کہ وہ صرف ایک مرد کے نکاح میں رہے، لیکن یہ فرق بھی عدم مساوات کی قبیل سے نہیں ہے، بلکہ خاندانی نظم وضوابط کی قبیل سے ہے، اور یہ بھی اللہ کی طرف سے عورت پر ایک احسان ہے، کیونکہ گھریلو نظام میں مرد حاکم اور نگراں ہے اور عورت تابع ہے، اس لئے عورت کے لیے ایک مشکل درپیش ہوگی جب وہ ایک سے زیادہ متبوع اور ذمہ دار کے تابع ہو بلکہ بسا اوقات وہ ان کے درمیان معلق ہوکر رہ جائے گی جب کہ مرد کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں کی نگرانی اور کفالت کرسکے۔

نیز چونکہ عورت کھیتی ہے (نساؤکم حرث لکم) جس کے بطن سے اولاد پیدا ہوتی ہے، ایک ہی بطن پر دو یا چار دعویدار ہونے کی صورت میں معاشرہ میں روزیا تو ایک نزاع قائم رہے گا، یا پھر اولاد نگرانی اور تربیت واصلاح سے معطل ہوکر رہ جائے گی، نیز اس

صورت میں جبکہ اولاد پیدا ہو، اور اس بات کا شبہ برقرار رہے کہ نہ معلوم وہ کس مرد کے نطفہ سے ہے اور وہ کس کی اولاد ہے وہ اولاد پوری زندگی عار اور شرمندگی سے دوچار رہے گی۔
اس لئے اسلام میں یہ فرق عورتوں کے مرتبہ کو کم کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ان کی اور ان کے اولاد کی حفاظت اور رعایت کے لیے ہے اور یہ کوئی عیب نہیں کسی بھی قانون کے لیے، کہ اساسی امور میں مساوات کے ساتھ کچھ ضمنی امور میں تفریق ہو، انسان ہونے کے اعتبار سے، نفس اور ذی روح ہونے کے اعتبار سے، عزت واحترام کے اعتبار سے جو امور وابستہ ہیں اس میں اسلامی شریعت نے عورت کو مرد کے برابر حیثیت ومقام دیا ہے، اور صنف میں فرق ہونے کے لحاظ سے جو امور متعلق ہیں اس میں حسب ضرورت فرق رکھا ہے، اور صنف کے فرق اور اس کے تقاضوں اور لواحق میں فرق کو کوئی بھی قانون اور کوئی معاشرہ دور نہیں کرسکتا۔

ہم ان آیات کی تفصیل اور ذکر کے بجائے صرف سورہ طلاق کے حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں جس کی ابتدائی آیات میں بار بار اللہ تعالیٰ نے تقوی کا ذکر کیا ہے، جو اس امر کی طرف مشیر ہے کہ اللہ رب العزت کے نزدیک عورتوں کا معاملہ نہایت ہی اہم اور نازک ہے، خواہ نفقہ کا معاملہ ہو یا رضاعت کا متعدد ازواج کے درمیان عدل کا معاملہ ہو یا طلاق اور معاشرت کا تقریباً ہر ایک موقع پر تقوی کی تنبیہ کے ذریعہ ظلم وجور، ضرر رسانی یا کسی بھی کوتاہی سے احتراز کی شدید تاکید فرمائی ہے۔

اور اسی سبب سے کہ نفقہ اور کفالت کی ذمہ داری مرد کے اوپر ہے، اور اس سبب سے کہ عورت کے اندر صنفی نزاکت، انفعالیت اور جذباتیت کا غلبہ ہوتا ہے اسے طلاق دینے اور رشتہ نکاح کو ختم کرنے کا حق نہیں دیا گیا، لیکن شوہر کی طرف سے زیادتی یا حق تلفی کی صورت میں قاضی یا شرعی پنچایت کی طرف رجوع کرنے کا حق واختیار حاصل ہے۔

عزت وناموس:

اسلام میں جس طرح مردوں کی عزت اور ان کی حیثیت ہے ویسے ہی عورتوں کی آبرو اور عزت بھی بڑی قیمتی ہے جو شخص ناحق ان کی ہتک عزت کرتا ہے، ان پر تہمت لگاتا ہے تو خواہ وہ شوہر ہی کیوں نہ ہو اس کے لئے حسی ومعنوی سخت سزا ہے، معاشرہ اسلامی میں

ایسا شخص فاسق اور غیر مقبول الشہادۃ قرار پاتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

”والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا بأربعة شهداء فاجلدوهم ثمانین جلدة ولاتقبلوا لهم شهادة أبدا وأولئک هم الفاسقون“ (سورہ نور)۔

(وہ لوگ جو پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں پھر اس پر چار گواہ نہیں لاتے، تو انہیں اسی (۸۰) کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی بھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں)۔

یہ ہے وہ مقام عالی جو اسلام نے عورت کو دیا ہے کہ کسی اعلیٰ سے اعلیٰ مرد کو بھی یہ اجازت نہیں کہ کسی معمولی عورت پر بھی تہمت لگائے، کسی بھی عورت کی عزت اس قدر عالی اور قیمتی ہے کہ ناحق اس کی ہتک عزت کسی بھی مرد کو فاسق اور متہم بنا دیتی ہے۔

عورت کے خون کی عظمت:

اسی طرح سے اسلام میں عورت کا خون اور اس کی جان بھی قیمتی ہے، ناحق اس کا قتل کرنے والا قصاص میں قتل کیا جائے گا، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

”یاایها الذین آمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والأنثی بالأنثی ...... الآیة“ (سورہ بقرہ آیت:۱۷۸)۔

(اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے مقتولین میں آزاد کے بدلہ آزاد، غلام کے بدلہ غلام اور مؤنث کے بدلہ مؤنث)۔

اس آیت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ مرد عورت کو یا عورت مرد کو قتل کرے تو اس کا کیا حکم ہے اس اعتبار سے اس میں ابہام ہے کیونکہ اس آیت کے سبب نزول کے پیش نظر یہ بتانا مقصود ہے کہ قصاص قاتل سے ہی لیا جائیگا یہ زیادتی جائز نہیں کہ کسی عورت نے کسی مرد یا عورت کو قتل کیا تو اس عورت کے بجائے کسی مرد سے قصاص لیا جائے، یا کسی غلام نے غلام یا آزاد کو قتل کیا تو اس قاتل غلام کے بدلے اس کے قبیلہ کے کسی آزاد شخص سے قصاص لیا جائے، اور اس ابہام کو قرآن کی ایک دوسری آیت دور کر رہی ہے جس میں مذکور ہے۔

”وکتبنا علیهم فیها أن النفس بالنفس والعین بالعین والأذن بالأذن والسن بالسن والجروح قصاص ...... الآیة“ (سورہ مائدہ:۴۵)۔

(اور ہم نے ان پر اس میں فرض کیا کہ نفس کے بدلہ میں نفس اور آنکھ کے بدلہ میں آنکھ اور کان کے بدلہ میں کان اور دانت کے بدلہ میں دانت اور زخموں کا بدلہ لیا جانا ہے)۔

یعنی مقتول مرد ہو یا عورت قصاص اس کے قاتل سے ہی لیا جائیگا، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، چنانچہ علامہ قرطبی اپنی تفسیر میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”واجمع العلماء على قتل الرجل بالمرأة والمرأة بالرجل“ (۱۲)۔

(اور علماء نے اجماع کیا ہے عورت (مقتول) کے قصاص میں مرد (قاتل) کے قتل پر اور مرد (مقتول) کے قصاص میں عورت (قاتل) کے قتل پر)۔

اور اس کی مزید وضاحت حدیث نبوی سے ہوتی ہے کہ کسی یہودی مرد نے کسی لڑکی کا سر دو پتھروں کے درمیان کچل دیا تھا، لڑکی نے اس یہودی کی نشاندہی کیا، اس یہودی کو بلایا گیا اس نے اعتراف کیا تو اس لڑکی کے قتل کے بدلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی مرد سے قصاص لیا۔ (۱۴)

گذشتہ سطور میں ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کیا ہے کہ اسلام میں عورت کو کیا حیثیت اور حقوق حاصل ہیں، اور بعض امور میں عورت اور مرد کے درمیان جو فرق و امتیاز ہے وہ کن اسباب اور مصلحتوں کی وجہ سے ہے، اب اس بحث کے اخیر میں مزید کچھ امور کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں جو اسلامی معاشرہ میں عورت کے مقام بلند کو اور زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ:

اللہ تعالیٰ نے اگر چہ انسان کو ماں باپ دونوں کے اختلاط سے پیدا کیا ہے، مگر اس نے عورت کے مرتبہ اور اس کی قدر کو اولاد کی نگاہ میں اجاگر کرنے کے لیے ان کی خلقت کی اضافت عورتوں کی طرف کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

”والله جعل لكم من أنفسكم أزواجاً وجعل لكم من أزواجكم بنين وحفدة ورزقكم من الطيبت أفبالباطل يومنون وبنعمت الله هم يكفرون“ (سورہ نحل آیت:۷۲)۔

(اور اللہ نے تمہاری ہی جنس سے تمہاری بیویاں بنائیں اور تمہارے لئے تمہاری

بیویوں سے لڑکے اور خدمتگار پیدا کئے، اور تم کو پاکیزہ رزق عنایت کیا، کیا وہ لوگ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں)۔

حفدہ کے معنی پوتا کے علاوہ خدمتگار بھی اکثر اہل لغت سے منقول ہے، جس سے اس جانب اشارہ ملتا ہے کہ اولاد کو والدین کا منت شناس ہونا چاہئے اور ان کی خدمت کرنی چاہئے، خاص طور سے ماں جس کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔

ایک دوسری آیت میں بھی ماں کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”ووصينا الإنسان بوالديه، حملته أمه وهنا على وهن وفصاله في عامين ان أشكر لي و لوالديک إليّ المصير“ (سورۂ لقمان آیت:۱۴)۔

(اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں تاکید کر رکھا ہے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف پر تکلیف سہ کر اٹھائے رکھا، اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوا، ہم نے حکم دیا ہے کہ وہ ہمارا اور اپنے والدین کا شکر بجالائے، ہماری طرف ہی لوٹنا ہے)۔

مجموعی طور پر والدین کے بارے میں اچھے سلوک کا حکم متعدد آیات میں مذکور ہے، لیکن اس کے بعد یہاں پر خاص طور سے ماں اور اس کی مشقتوں کا ذکر اور پھر صراحۃً اپنے ساتھ والدین کا شکر بجالانے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ماں (عورت) کے مقام کو خاص اہمیت دے رہا ہے، اور اس مفہوم کی تشریح احادیث سے بھی منقول ہے جن کا ذکر اختصار کے سبب نہیں کیا جا رہا ہے، البتہ ایک حدیث کا ذکر جو مطلقا عورتوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حکم کرتی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے، ارشاد ہے:

”استوصوا بالنساء خيرا فانهن خلقن من ضلع وأعوج شئ في الضلع أعلاه فان ذهبت تقيمه كسرته وإن تركته لم يزل أعوج فاستوصوا بالنساء“(۱۴)

(عورتوں کے لیے خیر طلب کرو، کیونکہ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہیں اور پسلی میں سب سے ٹیڑھی اوپر والی ہے، لہٰذا تم اگر اسے سیدھا کرنے لگو گے تو توڑ دو گے، اور اگر چھوڑے رکھو گے تو ٹیڑھی ہی رہ جائیگی، لہٰذا ان کے لیے خیر چاہو)۔

اس حدیث میں عورت کے فطری مزاج کا بھی ذکر کیا اور پھر ان کے ساتھ حسن

معاشرت اور ان کی بعض چیزوں کو نظر انداز کرنے کی بھی ترغیب دیا ہے، اور فی الجملہ اچھے سلوک کا حکم کیا ہے۔ایک دوسری حدیث میں وارد ہے:

لا یفرک مؤمن مؤمنة ان کرہ منها خلقاً رضی منها اخر.(١٦)

مومن مرد مومنہ عورت سے نفرت نہ کرے، اگر اس کے کچھ اخلاق کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے دوسرے اخلاق سے تو راضی ہے

عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم:

ہم نے اس کا ذکر کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں کہیں عورتوں کا ذکر کیا ہے تو اکثر مقامات پر تقوی کا حکم بھی دیا ہے چنانچہ سورہ نساء کی پہلی آیت جسمیں عورت کی تخلیق کا ذکر ہے اس میں دو مرتبہ تقوی کا ذکر ہے۔سورہ 'الطلاق' میں اللہ تعالی نے طلاق سے متعلق احکام کے بیان میں دیگر وعیدوں کے ساتھ مسلسل پانچ آیتوں میں چار مرتبہ تقوی کا ذکر کیا ہے۔سورہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے

یایها النبی اذا طلقتمو النساء فطلقوهن لعدتهن واحصوا العدة واتقوا الله ربکم لا تخرجوهن من بیوتهن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشة مبینة وتلک حدود الله ومن یتعد حدود الله فقد ظلم نفسه لا تدری لعل الله یحدث بعد ذلک امرا.

اور پانچویں آیت میں ارشاد ہے:

ذلک أمر الله انزله الیکم ومن یتق الله یکفر عنه سیأته ویعظم له أجرا.

مذکورہ نصوص وآیات قرآنیہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت اور مقام کس قدر عالی، مقدس اور لائق احترام ہے، اسلامی معاشرہ میں ایک عورت بھی مرد کی طرح انسان ہے، اس کے جسم میں بھی مردوں جیسی روح ہے اس کو بھی عبادات کا وہی حق حاصل ہے جو مردوں کو، مردوں کے برابر ہی اسے اجر وثواب اور جنت ملے گی، معاشرہ میں اس کے لئے بھی حقوق ہیں مردوں کی طرح، وہ بھی مال وجائیداد اور اشیاء منقولہ وغیرہ منقولہ کی مالک ہوسکتی ہے اور اپنی ملکیت میں تصرف کا اسے پورا اختیار

ہے، مردوں کی طرح وراثت میں بھی اس کا حصہ ہے اور وہ نفس وارادہ کی مالک ہے، اس کی عزت بھی عزت ہے اور اس کا خون بھی خون ہے، جس سے تعرض کرنے والا مجرم، گنہ گار اور سزا کا مستحق ہے، اسلام نے عورت کو ماں کی عظمت، بیٹی کی شفقت، بیوی کی محبت اور بہن کی عزت بخشی ہے۔

حواشی

۱- ترجمہ کتاب بنام اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ص:۲۷۱۔
۲- ترجمہ بنام عورت اسلام کی نظر میں ص:۷۹۔
۳- برائے تفصیل دیکھئے ''عورت اسلام کی نظر میں ترجمہ کتاب ''الاسلام وقضايا المرأة المعاصرة'' اور اسلام میں عورت کا مقام از علی میاں ندوی۔
۴- الجامع لأحكام القرآن للقرطبی: ۳۲۱/۳۔
۵- ۳۲۱/۳۔
۶- الجامع لأحكام القرآن للقرطبی: ۵۲۱/۳۔
۷- عورت اسلام کی نظر میں ص: ۸۵۲۔
۸- صحیح مسلم، ۲۰۴/۹، کتاب النکاح، ح/۱۴۲۱۔
۹- از عورت اسلام کی نظر میں ص: ۳۹۲ بحوالہ مجلّہ الہلال، مارچ ۱۹۰۵ء۔
۱۰- عورت اور قرآن کریم ص: ۳۹۲۔
۱۱- مشکوۃ المصابیح ص ۲۶۷، بحوالہ صحیح بخاری، کتاب النکاح، ح ۵۰۶۶۔
۱۲- الجامع لأحكام القرآن للقرطبی: ۸۳۲/۲۔
۱۳- مشکوۃ ص: ۳۰۰، بحوالہ صحیح بخاری، کتاب الدیات ۲۳۱/۱۲ ح/۶۸۸۴۔
۱۴- متفق علیہ، مشکوۃ ص: ۸۲۔
۱۵- مشکوۃ المصابیح ص: ۲۸۰۔

مراجع

۱- القرآن الکریم

۲- الجامع لأحکام القرآن،محمد بن أحمد الأنصاری القرطبی / دار الکتاب العربی

۳- تدبر قرآن،ازمولانا امین احسن اصلاحیؒ/تاج کمپنی،ترکمان گیٹ،دہلی/ ایڈیشن دوم ۱۹۹۷ء

۴- صحیح بخاری مع فتح الباری،/ ترقیم:محمد فؤاد عبدالباقی / دار الفکر

۵- صحیح مسلم مع شرح النووی / داراحیاء التراث العربی بیروت/ طبعۃ اولی ۱۳۴۷ھ

۶- صحیح مسلم،ترقیم:محمد فؤاد عبدالباقی / دار عالم الکتب الریاض

۷- مشکوٰۃ المصابیح محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی /کتب خانہ رشیدیہ دہلی

۸- المواریث محمد علی الصابونی / عالم الکتب،بیروت

۹- القاموس المحیط،محمد بن یعقوب الفیروزابادی /دار عالم الکتب، الریاض

۱۰- اسلام اور جدید ذہن کے شبہات،ترجمہ "شبہات حول الاسلام،محمد قطب" از محمد سلیم کیانی/مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۹۵ء

۱۱- اسلام میں عورت کا مقام،از ڈاکٹر اسرار احمد /فرید بکڈپو،دلی،۲۰۰۵ء

۱۲- عورت اسلام کی نظر میں،ترجمہ "الاسلام وقضایا المرأۃ المعاصرۃ، للشیخ البہی الخولی" از جاوید احسن مجاہد فلاحی،پرنٹ سیٹ نوئیڈا

۱۳- عورت اور قرآن کریم،از قدسیہ عبدالقدوس قاسمی،/النادی العربی دار العلوم زکریا،جنوبی افریقہ،۲۰۱۲ء

عورتوں کی گواہی کا مسئلہ قرآن مجید کی روشنی میں

نسیم ظہیر اصلاحی

عورتوں کی گواہی کا مسئلہ فقہائے اسلام کے مابین ابتداہی سے بڑا مختلف فیہ رہا ہے۔ صحابۂ کرام وتابعین عظام کے یہاں بھی عورتوں کی شہادت سے متعلق مختلف ومتضاد اقوال وآراء پائے جاتے ہیں۔ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ عورتوں کی شہادت اصلاً نا قابل قبول ہے۔ اس لئے کہ جذبات وعواطف ان کے ذہن ودماغ پر غالب رہتے ہیں۔ انکا فہم اختلال کا شکار اوران کی ولایت کمزور ہوتی ہے۔

الاصل عدم قبول شهادة النساء لغلبة العاطفة عليهن و اختلال ضبط الامور و قصور الولاية على الاشياء .[1]	اصل یہ ہے کہ عورتوں کی گواہی نا قابل قبول ہے اس لئے کہ جذبات وعواطف ان پر غالب رہتے ہیں۔ ان کے فہم و ضبط میں اختلال پایا جاتا ہے اوراشیاء پر ان کی ولایت ناقص ہوتی ہے۔

تاہم مالی اورنیم مالی معاملات میں آیت مداینہ پر قیاس کر کے عورتوں کی شہادت کوقابل قبول تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن وہ مالی معاملات جن میں ان کی گواہی معتبر تسلیم کی گئی ہے ان میں بھی اختلاف ہے۔ اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ مرد کی شرکت کے بغیر عورت کی گواہی معتبر ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کن مسائل میں معتبر ہوگی اور کن میں نہیں اور گواہ عورتوں کی تعداد کیا ہوگی؟ ایک یا دو یا تین یا چار؟

اس طرح شہادت سے متعلق جتنے بھی امور ومسائل سامنے آتے ہیں ان سب میں ہمارے فقہائے کرام کے یہاں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض

معاملات میں ایک ہی عالم اور فقیہ سے مختلف اور متضاد اقوال بھی نقل کئے گئے ہیں۔

صرف دو امور ایسے ہیں جن میں سب کا اتفاق ہے۔ایک قرض کا معاملہ جس کے متعلق قرآن مجید میں صراحۃ ذکر ہے کہ دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بناؤ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلاَ يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّهَ رَبَّهُ وَلاَ يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئاً فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهاً أَوْ ضَعِيفاً أَوْ لاَ يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُواْ شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاء أَن تَضِلَّ إْحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى وَلاَ يَأْبَ الشُّهَدَاء إِذَا مَا دُعُواْ (البقرہ/۲۸۲)	اے ایمان والو! جب تم آپس میں کسی متعین وقت تک کے لئے ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور اس کو لکھے تمھارے مابین کوئی انصاف سے لکھنے والا۔ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اسے اللہ نے سکھایا ہے اسی طرح وہ دوسروں کے لیے لکھنے کے کام آئے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ جس پر حق عاید ہوتا ہے اور وہ اللہ سے جو اس کا رب ہے، ڈرے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے اور اگر وہ جس پر حق عاید ہوتا ہے نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو۔ پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو۔ ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو بطور گواہ تا کہ ان میں سے کوئی بھٹک جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ جب بلائیں جائیں تو انکار نہ کریں۔

اسی کو آیت مداینہ کہا جاتا ہے۔اس میں جو صورت مسئلہ بیان ہوئی ہے اس اس

میں عورتوں کو گواہ بنانے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ دوسرا معاملہ جس میں عورتوں کی شہادت کو بالاتفاق قابل قبول مانا گیا ہے وہ عورتوں کے مخصوص امور و مسائل ہیں، جن کا عام طور پر عورتوں ہی کو علم ہوا کرتا ہے۔ مرد یا تو ان سے بے خبر ہوتے ہیں یا ان سے اطلاع و واقفیت مرد کے لئے عموماً مشکل اور بعض حالات میں محال ہوا کرتی ہے۔

ان دو مسائل کے علاوہ ہر مسئلے اور معاملے میں عورتوں کی گواہی سے متعلق شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔[۲] اس لئے یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اسلام میں عورتوں کی شہادت کی کیا حیثیت ہے اور یہ پیچیدگی اس لئے پیدا ہوئی کہ نہ خود قرآن اس سلسلہ میں کوئی واضح اور دوٹوک ہدایت دے رہا ہے اور نہ ہی سنت نبوی سے اس بابت کوئی صاف اور فیصلہ کن رہنمائی مل رہی ہے۔

عورتوں کی شہادت کے حوالہ سے فقہ حنفی میں سب سے زیادہ توسع ہے۔ ان کے یہاں سوائے حدود و قصاص کے تمام امور و معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت جائز اور قابل قبول ہے جیسے نکاح، طلاق، عدت، رجعت، حوالہ، وقف، صلح، وکالہ، وصیہ، ہبہ، اقرار، ابراء، ولادت اور نسب وغیرہ جیسے مالی اور غیر مالی معاملات [۳]۔ احناف نے حدود و قصاص کو اس عموم سے محض ابن شہاب زہری کے ایک اثر کی بنا پر خارج کر دیا ہے۔[۴] جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

مالکیہ، شوافع اور حنابلہ جزوی اختلاف کے ساتھ تقریباً اس پر متفق ہیں کہ مالی یا نیم مالی معاملات میں سے بیع، اجارہ، ہبہ، وصیہ، رہن، کفالہ جیسے معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت معتبر ہے۔ لیکن غیر مالی معاملات یعنی نکاح، طلاق، رجعت، ایلا، ظہار، نسب اور حدود و قصاص جیسے معاملات میں عورتوں کی شہادت سرے سے غیر معتبر ہے نہ تنہا نہ مردوں کے ساتھ۔

مالی اور نیم مالی معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت کو آیت مداینہ پر قیاس کر کے ان علماء نے جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ غیر مالی معاملات میں عورتوں کی شہادت کو سرے سے خارج کر دینے کی وجہ بعض آیات، احادیث اور قیاس سے استدلال ہے۔ مثلاً رجعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے و اشھدوا ذوی عدل منکم

نکاح سے متعلق ارشاد نبوی ہے لا نکاح الا بولی و شاهدی عدل ۔حدود کے متعلق حضرت ابن شہاب زہری کی مرسل روایت ہے جرت السنة علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم و الخلیفتین من بعده ان لا تقبل شهادة النساء فی الحدود والدماء ۵۔

شوافع کہتے ہیں کہ رجعت، نکاح اور حدود کے بارے میں قرآن وسنت کی صراحت ہے کہ ان میں عورتوں کی گواہی نہیں چل سکتی چنانچہ انہی پر ہم نے دوسرے غیر مالی معاملات کو اور ایسے معاملات کو جن سے واقفیت مرد کے لئے ممکن ہے قیاس کرلیا ہے کہ ان میں عورتوں کی شہادت معتبر نہیں ہونی چاہئے۔

قالت الشافعية: فدل النص علی الرجعة و النكاح و الحدود و قسنا علیها کل مالا یقصد به المال و ما یطلع علیه الرجال ٦۔

شوافع کہتے ہیں کہ رجعت نکاح اور حدود میں عورتوں کی شہادت کے غیر معتبر ہونے پر نص دلالت کرتی ہے پس ہم نے انہی چیزوں پر قیاس کرلیا ہے غیر مالی معاملات کو اوران معاملات کو جن سے مردوں کے لئے واقفیت ممکن ہے۔

بعد کے بعض علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ معاملات میں عورتوں کی شہادت کے غیر معتبر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مذکورہ نصوص اور قرآن وسنت کے وہ دوسرے نصوص جن میں شہادتوں کا ذکر ہے ان میں شاہد کے لئے مذکر الفاظ، مذکر صیغے اور مذکر ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔خود آیت مداینہ میں جہاں عورتوں کو گواہ بنانے کا صراحۃ ذکر ہے وہاں بھی اصلاً مردوں کو ہی گواہ بنانے کا حکم ہے "وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ من رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ" (بقرہ:۲۸۲)۔ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ گواہ صرف مرد ہی بن سکتے ہیں عورتیں نہیں ۷۔البتہ بعض، استثنائی صورتوں میں آیت مداینہ کے پیش نظر ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت جائز تسلیم کی جاسکتی ہے۔

عورتوں سے مخصوص مسائل میں اگر چہ لوگوں نے تنہا عورتوں کی شہادت کو معتبر مانا ہے مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا نصاب شہادت یعنی گواہ عورتوں کی تعداد کے بارے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔حنفیہ اور حنابلہ کے یہاں ایک عورت کی شہادت کافی ہے مالکیہ

کے یہاں دو عورتوں اور بعض دوسرے علماء کے یہاں تین عورتوں اور جبکہ شوافع کے یہاں چار عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔[8]

اس سلسلہ میں احناف بعض روایات و آثار کو بنیاد بناتے ہیں۔ مالکیہ کی دلیل یہ ہے کہ جب اپنی انفرادی یعنی مردوں کے بغیر شہادت میں عورتیں مردوں کے قائم مقام ہیں تو تعداد میں بھی مردوں کے قائم مقام ہوں گی اور چونکہ مردوں کی شہادت کے لئے کم از کم دو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے عورتوں کی شہادت کے لئے بھی دو عورتوں کو ہونا چاہئے۔ **لما قمن فی انفراد هن مقام الرجال وجب ان يقمن فی العدد مقام الرجال و اكثر عدد الرجال اثنان فاقتضى ان يكون اكثر عدد النساء اثنتين**[9]۔

امام شافعیؒ جو چار عورتوں کی شہادت کے قائل ہیں، فرماتے ہیں:

لما ذكر اللـه عزو جل شهادة النساء فجعل امرأتين يقومان مقام رجل فى الموضع الذى اجاز هما الله تعالى فيه، وكان اقل ما انتهى اليه من عدد الرجال رجلين فى الشهادات التى تثبت بها الحقوق. اوشاهد اوا مرأتين، لم يجزو الله اعلم، اذا اجاز المسلمون شهادة النساء فى موضع ان يجوز منهن الااربع عدول لان ذلك معنى حكم الله۔[10]	جب اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی شہادت کا ذکر کیا تو جہاں ان کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے وہاں دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام قرار دیا اور چونکہ حقوق کی شہادت میں کم سے کم دو مرد ہونے چاہئیں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔ اس لئے جائز نہیں ہوگا (واللہ اعلم) کہ جب مسلمان علماء کسی موقع پر عورتوں کی شہادت جائز قرار دیں تو چار عادل عورتوں سے کم کی شہادت معتبر مانی جائے۔ اس لئے کہ یہی اللہ تعالیٰ کے حکم کا مفہوم ومنشا ہے۔

خواتین کی شہادت سے متعلق علماء کے مذکورہ اقوال و آراء اور فکر وخیال پر سرسری نظر ڈالنے سے بطور خاص چار باتیں بہت واضح ہو کر سامنے آتی ہیں:

ا- خواتین بالعموم جذبات سے مغلوب رہتی ہیں۔ ان کا فہم خام اور حفظ وضبط کمزور

ہوتا ہے اس لئے وہ اصلاً شہادت کی اہل نہیں ہیں۔ مالکی عالم سحنون کا قول ہے:
شهادة النساء انما جازت على وجه الضرورة [۱۱]۔

۲- قرآن وسنت میں جہاں کہیں بھی شہادت کا ذکر ہے وہاں گواہ کے لئے الفاظ، صیغے اور ضمیریں سب مذکر استعمال ہوئے ہیں اس لئے گواہ اصلاً مرد ہی بن سکتے ہیں عورتیں نہیں۔

۳- آیت مداینہ میں دو خواتین کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر کہا گیا ہے۔ اس لئے ایک عورت کی شہادت ایک مرد کی شہادت سے کم بلکہ نصف مانی جائے گی۔ اسی لئے امام شافعیؒ عورتوں سے مخصوص مسائل میں چار عورتوں کی شہادت ضروری قرار دیتے ہیں۔ لان الله عزو جل جعل عديل الشاهد الواحد امرأتين و اشترط الاثنينية [۱۲]۔

۴- استدلال کے مذکورہ تمام پہلو اجتہاد، استخراج اور استنباط کی نوعیت کے ہیں۔ صراحت اور نص قطعی کی حیثیت ان کو حاصل نہیں ہے۔ شہادۃ النساء کا یہی وہ پہلو ہے جو اس موضوع پر ہمارے لئے گفتگو کا جواز فراہم کرتا ہے کچھ اور بھی امور و نکات مذکورہ تفصیل سے سامنے آتے ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے پیش نظر محض شہادۃ النساء کی حیثیت کی تعیین ہے اور ہمارے خیال میں اول الذکر صرف تینوں امور پر گفتگو حصول مدعا کے لئے کافی ہوگی۔ اس لئے ہماری بحث ان ہی تین نکات تک محدود ہوگی۔

عورتوں کی اہلیتِ شہادت:

یہ بات کہ عورتیں شہادت کی اہل نہیں ہیں قرآنی بیان کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں شہادت اور شہداء بمعنی گواہ سے متعلق آیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گواہی کی اہلیت اور اس کے تحمل کی صلاحیت عورتوں اور مردوں دونوں کو یکساں حاصل ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر شہداء اور شہادت کے الفاظ گواہ اور گواہی کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور تمام علماء وفقہا اور اہل تفسیر ان کے عموم میں عورتوں اور مردوں کو شامل

مانتے ہیں۔ سب سے پہلے آیت مداینہ کو دیکھئے۔ جس کو عورتوں کی ناقص اہلیت شہادت یا اس کی نفی کی سب سے بڑی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا آخری حصہ یہ ہے:

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ من رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى وَلاَ يَأْبَ الشُّهَدَاءِ إِذَا مَا دُعُوا (بقرہ/۲۸۲)	اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو۔ پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو۔ ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو بطور گواہ تا کہ ان میں سے کوئی بھٹک جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ جب بلائیں جائیں تو انکار نہ کریں۔

اس آیت میں مذکور لفظ ''شهیدین'' مرد وعورت دونوں کو شامل ہے۔ اگر اس کا اطلاق صرف مردوں پر ہوتا تو آگے من رجالکم کی شاید کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ علامہ ابوبکر الجصاص کہتے ہیں:

ان اسم الشهيدين واقع في الشرع على الرجل والمرأتين ۱۳؎ یعنی شریعت میں شہیدین کا اطلاق ایک مرد اور دو عورتوں پر ہوتا ہے۔ اگر عورتوں کے اندر شہادت و گواہی کی صلاحیت نہ ہوتی تو ان کے لئے لفظ ''شہید'' (بمعنی گواہ) کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن مجید میں اس مشترک لفظ کا استعمال نہ صرف عورتوں کی اہلیت شہادت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ مرد عورت دونوں کی اہلیت شہادت میں کوئی فرق و تفاوت بھی نہیں ہے۔

اس آیت میں دو مرد دستیاب نہ ہونے کی صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بھی قطعیت کے ساتھ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ عورتوں میں بھی شہادت کی پوری اہلیت اور اس کے تحمل کی صلاحیت موجود ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کو گواہ بنانے کا حکم ہی نہ دیا جاتا۔ آیت کے اگلے ٹکڑے ممن ترضون من الشهداء میں لفظ شہداء کا تعلق جس طرح مرد گواہوں سے ہے اسی طرح خواتین گواہوں سے بھی ہے۔ اس میں مرد و خواتین دونوں یکساں طور پر شامل ہیں۔ اس

لئے کہ جن دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنانے کا پہلے حکم دیا گیا ہے انہی گواہوں کو شہداء کہا گیا ہے۔اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو شہادت و گواہی کی یکساں اہلیت حاصل ہے۔ اگر دونوں کی اہلیت وصلاحیت میں فرق و تفاوت اور کمی بیشی ہوتی، تو دونوں کی ایک ہی لفظ سے تعبیر قرآنی بلاغت کے منافی ہوتی۔ اسی سلسلۂ کلام میں آگے فرمایا گیا ''ولا یأب الشھداء اذا ما دعوا'' اس میں بھی لفظ شہداء کا تعلق مرد و خواتین دونوں سے ہے اوپر جن مردوں اور عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے انہی گواہوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب گواہی کے لئے ان کو طلب کیا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ ظاہر سی بات ہے کہ کسی کام سے انکار نہ کرنے کی ہدایت اسی کو دی جائے گی جس کے اندر اسکو انجام دینے کی قوت وصلاحیت ہوگی۔

آیت مداینہ کی بعد والی آیت کے آخر میں ہے ولا تکتموا الشھادۃ و من یکتمھا فانہ آثم قلبہ (البقرہ ۲۸۳) یہاں ضمیر مخاطب اگر چہ مذکر ہے۔لیکن چونکہ سلسلۂ کلام وہی ہے۔آیت مداینہ کے سیاق ہی میں کتمان شہادت سے منع کیا گیا ہے۔اس لئے تمام علماء نے اس حکم کو مردوں اور عورتوں دونوں سے متعلق مانا ہے۔ اور اس لئے شہادت چاہے مرد کی ہو یا عورت کی اس کا کتمان بہر حال گناہ تسلیم کیا گیا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عورت کے اندر شہادت کی اہلیت ہی نہیں ہے تو اس کو کتمان شہادت سے روکنے کا کیا مطلب ہوگا؟ رہی یہ بات کہ اگر مرد و عورت دونوں شہادت کے اہل ہیں اور دونوں کی اہلیت شہادت یکساں اور برابر ہے تو پھر ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو گواہ بنانا اور ان کے بارے میں یہ کہنا کہ کوئی ایک ضلال میں پڑ جائے تو دوسری یاد دلا دے ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخری کا کیا مطلب ہوا ؟ان دونوں باتوں سے تو عورتوں کی اہلیت شہادت پر حرف آ رہا ہے؟ تو ان دونوں امور پر گفتگو آگے آ رہی ہے۔

سورہ طلاق میں ہے: واشھدوا ذوی عدل منکم و اقیموا الشھادۃ للہ ذلکم یوعظ بہ من کان یومن باللہ والیوم الآخر (الطلاق ۲)۔

اس میں بھی لفظ شہادت کا تعلق مرد و عورت دونوں سے ہے اس لئے کہ اقامت شہادت کی نصیحت ان لوگوں کو کی جارہی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں جس

کے عموم میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی اقامت شہادت اور ادائے شہادت کی مکلّف ہیں اور ظاہری بات ہے کہ اقامت شہادت یا ادائے شہادت کا مکلّف اسی کو بنایا جائے گا جو اس کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہو۔ اس طرح اس آیت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں ہر معاملہ میں شہادت کی اہل ہیں اور مردوں کی طرح ان کی بھی شہادت بلاتأمل قابل قبول ہوگی۔

سورہ نساء میں ہے: یا ایھا الذین آمنو کونوا قوامین بالقسط شھداء لله (النساء/۱۳۵)۔

سورہ مائدہ میں ہے: یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین لله شھداء بالقسط (المائدہ/۸)

ان آیات میں اگرچہ خطاب بظاہر مردوں سے ہے مگر ان میں مذکور لفظ شھداء کا تعلق مرد وخواتین دونوں سے ہے کیونکہ قیام بالقسط کی ذمہ داری جس طرح مردوں پر عائد ہوتی ہے، اسی طرح عورتوں پر بھی یہ فریضہ عائد ہوتا ہے اور دونوں اپنے اپنے دائرہ کار کے اندر اس کے یکساں مکلّف اور پابند ہیں۔ اور معلوم ہے کہ کسی کام کا مکلّف اسی کو بنایا جاتا ہے جس کے اندر اس کے تحمل اور انجام دینے کی اہلیت وصلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی ہر معاملے میں شہادت کی اہلیت رکھتی ہیں اور ان کی شہادت ہر جگہ اور ہر معاملہ میں قابل قبول ہوگی اس لئے کہ شہداء بالقسط بالکل عام ہے۔

اس سلسلہ میں سورہ نور کی آیات لعان کا حوالہ بھی غیر مناسب نہیں ہوگا جہاں لعان کے طور پر شوہر کے کہے گئے چار اقوال کو شہادت سے تعبیر کیا گیا ہے تو بیوی کے بطور لعان کے کہے گئے اقوال کو بھی شہادت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو بھی شہادت کا اہل اور اس کی گواہی کو معتبر قرار دیتا ہے۔

ممکن ہے مذکورہ بالا آیات میں سے بعض کے بارے میں کہا جائے کہ انکا تعلق شہادت وگواہی سے نہیں ہے۔ لیکن خود امام شافعی جو عورتوں کو شہادت کا اہل نہ ماننے والوں کے سرخیل ہیں، مذکورہ تمام آیات کو شہادت وگواہی سے متعلق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اپنی

کتاب ''الام'' میں آیات لعان کے علاوہ مذکورہ تمام آیات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

والذی احفظ عن کل من سمعت من اھل العلم فی ھذہ الایات انہ فی الشاھد۔[۱۴]	وہ بات جو عام علماء سے، ان آیات کے بارے میں سن کر میں نے محفوظ کر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا تعلق شاہد اور گواہ سے ہے۔

مذکر الفاظ اور صیغوں کا استعمال:

عورتوں کی گواہی کو نا قابل قبول قرار دینے کی دوسری بڑی وجہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ بیان کی جاتی ہے کہ قرآن وسنت میں جہاں کہیں بھی شہادت کا ذکر ہے وہاں گواہی اور گواہوں کے لئے مذکر الفاظ، مذکر صیغے اور مذکر ضمیریں استعمال ہوئی ہیں مثلاً:

۱- اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ (المائدہ/۱۰۶)

۲- وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ (الطلاق/۲)

۳- وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ (النساء/۱۵)

۴- وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاء (النور/۴)

۵- لَوْلَا جَاؤُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاء (النور/۱۳)

کہا جاتا ہے کہ ان آیات میں وارد الفاظ، ذو اعدل ، ذوی عدل، اقیموا، اربعۃ منکم، باربعۃ شھداء، شھدوا، شھداء اور آیت مداینہ کے الفاظ من رجالکم اور رجلین سب مذکر ہیں اور گواہوں کے مذکر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر فقہاء کرام کی غالب ترین اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ گواہوں کا مرد ہونا ضروری ہے۔ یہاں ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ بعض فقہائے متاخرین اس استدلال کو بڑی شدت وقوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر متقدمین فقہاء کے یہاں اس استدلال کا ذکر تک نہیں ملتا۔ امام شافعیؒ کی کتاب ''الام'' میں اس کا کوئی ذکر مذکور نہیں ہے۔ جبکہ متاخرین نے تو اسے نص قطعی تک قرار دے دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نص قطعی نہیں بلکہ فقہاء متقدمین کے ایک اجتہاد واستنباط کے حق میں صرف ایک تائیدی نکتہ اور پہلو

ہے۔اس استدلال کی کمزوری جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ احکام و مسائل کے بیان و اظہار کے تعلق سے قرآن مجید کے ایک مشہور عام اسلوب پر نظر ڈال لی جائے۔

قرآن مجید کا ایک اسلوب:

قرآن مجید کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ اپنے احکام وقوانین تذکیر کے صیغے سے بیان کرتا ہے۔اور مرد وخواتین سب ان کے مخاطب اور مکلّف ہوتے ہیں الا یہ کہ کوئی دوسری صریح نص یا کوئی نہایت مضبوط قرینہ پایا جائے کہ عورتیں ان سے مستثنیٰ ہیں، تبھی عورتوں پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ورنہ مردخواتین دونوں ان میں شامل ہوتے ہیں۔احادیث نبوی کا بھی یہی اسلوب ہے کلام عرب میں بھی یہ اسلوب عام ہے۔قرآن مجید سے اس کی چند چھوٹی چھوٹی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱- يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ اسْتَعِيْنُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلوٰةِ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ. (البقرہ/۱۵۳)

اس آیت کریمہ میں آمنوا، استعینوا، صابرین سب مذکر کے صیغے اور الفاظ ہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صبر وصلوٰۃ کے ذریعہ استعانت کے حصول کا حکم مردوں کے ساتھ خاص ہے اور صابر عورتوں کو اللہ کی معیت حاصل نہیں ہوگی۔

۲- يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلواةِ فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِن كُنتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُواْ وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاء فَلَمْ تَجِدُواْ مَاءً فَتَيَمَّمُواْ صَعِيْداً طَيِّباً فَامْسَحُواْ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيْكُم مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَكِن يُرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ. (مائدہ/٦)

اس آیت میں وضو اور تیمم کے احکام بیان ہوئے ہیں وہ مرد وخواتین سب کے لئے ہیں حالانکہ الفاظ صیغے، ضمیریں سب مذکر استعمال ہوئی ہیں۔

۳- حَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّواْ وُجُوهَكُمْ شطره (البقرہ/۱۴۴)

اس میں کعبہ شریف کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہے جو مرد و خواتین سب کے لئے ہے حالانکہ اس میں استعمال صیغے اور ضمیریں سب مذکر ہیں۔

۴- يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُواْ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّهَ بِهِ عَلِيمٌ. (البقرہ/۲۱۵)

اس میں والدین، رشتہ دار، یتامی، مساکین اور مسافر پر خرچ کرنے کا حکم ہے اور الفاظ سب مذکر ہیں لیکن یہ افراد مرد ہوں یا عورت سب تعاون اور مدد کے مستحق ہیں محض الفاظ کے مذکر ہونے کے سبب ماں، رشتہ دار عورت یا یتیم، مسکین اور مسافر عورتیں اس حکم سے خارج نہیں ہوسکتیں۔

۵- إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاء وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللّهِ وَاللّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ. (البقرہ/۶۰)

زکوٰۃ حق ہے فقراء اور مساکین کا اور زکوٰۃ پر کام کرنے والوں کا اور جن کے دل کی تالیف مقصود ہے اور گردن چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور مسافر کا یہ اللہ کا مقررہ کردہ فریضہ ہے۔ اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

مذکورہ آیت میں مستحقین زکوٰۃ کا ذکر ہے کہ یہ اور یہ لوگ ہیں جن کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ مگر ان مستحقین کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ سب مذکر ہیں مثلاً فقراء، مساکین، عاملین، غارمین اور ابن السبیل یعنی مسافر وغیرہ۔ لیکن الفاظ کی تذکیر کا لحاظ کئے بغیر مذکورہ اوصاف کے حامل مرد و خواتین سبھی اس میں شامل اور سب زکوٰۃ کے حقدار ہیں۔ اگر فقہاء کرام کے مذکورہ بالا طریقۂ استدلال کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عورتوں کو زکوٰۃ کی رقم دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہیں اس لئے کہ جن مستحقین زکوٰۃ کا قرآن میں بیان ہے ان کے لئے الفاظ مذکر استعمال ہوئے ہیں۔

یہ محض چند مثالیں ہیں، قرآن مجید کے اس اسلوب کی کہ اس کے احکام وفرائین

اکثر و بیشتر مذکر کے صیغے میں آتے ہیں اور ان کا اطلاق مرد وخواتین دونوں پر ہوتا ہے ورنہ سیکڑوں ایسی مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔

البتہ بعض جگہوں پر تذکیر و تانیث کے صیغے ساتھ ساتھ آتے ہیں یا صرف تانیث کے بھی صیغے آئے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں رہی کہ مذکر کے صیغوں میں عورتیں شامل نہ تھیں بلکہ اس لئے کہ موضوع کی اہمیت اور تاکید پیش نظر تھی یا اسی حکم سے مردوں کو الگ رکھنا مقصود تھا۔

قرآن مجید کا یہ اسلوب ایسا نہیں ہے کہ مثالوں کے ذریعہ اس کو باور کرایا جائے۔ اس لئے کہ قرآن مجید سے جن کو ذرا بھی دلچسپی اور لگاؤ ہے وہ اس اسلوب سے بخوبی واقف ہیں۔ اس طویل بحث کی ضرورت صرف اس لیے پیش آئی کہ بعض فقہاء اپنے ائمہ کے ایک اجتہاد کی حمایت و تائید میں ایک ایسی بات کہہ گئے جو بدیہی طور پر غلط معلوم ہوتی ہے اور قرآن مجید کے عام اسلوب ومزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے ان آیات والفاظ پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا جو مذکورہ استدلال کی بنیاد ہیں اور جنہیں نص قطعی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے آیت وصیت کو لیتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلاَةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لاَ نَشْتَرِي بِهِ ثَمَناً وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى وَلاَ نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّهِ إِنَّا إِذاً لَّمِنَ الآثِمِينَ (المائدہ/۱۰۶)	اے ایمان والو جب تم میں سے کسی کو موت کا مرحلہ در پیش ہو وصیت کے وقت تو تمہارے درمیان دو ایسے معتبر گواہ ہونے چاہیے جو تم میں سے ہوں یا دو دوسرے تمہارے علاوہ میں سے اگر حالت سفر میں ہو۔ پھر لاحق ہو تم کو موت کی مصیبت تو ان دونوں کو نماز کے بعد روکو اگر تم کو شبہہ لاحق ہو وہ دونوں اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم نہیں لیتے قسم کے بدلے مال اگر چہ کوئی ہمارا قرابت دار بھی ہو اور ہم نہیں چھپاتے اللہ کی گواہی ورنہ ہم یقیناً گنہ گار ہوں گے۔

اس آیت کی ابتدا "یا ایھا الذین آمنوا" کے عمومی اسلوب سے ہوتی ہے جس میں مرد وخواتین دونوں شامل ہیں۔اس میں گواہوں کے لئے "اثنان ذو اعدل منکم" کے الفاظ ہیں جو مذکر ہیں اور بظاہر گواہوں کے مذکر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔اس لئے لفظ "عدل" ہے تو اصلا مذکر، مگر مذکر ومؤنث دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔"رجل عدل و امرأة عدل" دونوں استعمال ہے اور جب ایسا ہے تو لفظ "عدل" کے ساتھ "اثنان" اور "ذوا" کا مذکر استعمال اس کو مذکر کے لئے خاص نہیں کرسکتا۔اس لئے کہ جب کسی لفظ کا استعمال مذکر ومونث دونوں کے لئے ہوتا ہے تو بالعموم استعمال میں اس کے ساتھ مذکر کا سا معاملہ کیا جاتا ہے۔"منکم" میں "کم" ضمیر خطاب اگر چہ مذکر ہے مگر اس میں مذکر ومؤنث دونوں شامل ہیں۔اس لئے کہ اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جن کو یا ایھا الذین آمنوا کے الفاظ سے خطاب کرتے ہوئے کلام کا آغاز ہوا تھا۔جن میں مرد وخواتین دونوں شامل ہیں،اس کی تائید اگلے الفاظ "او اخران من غیر کم" سے بھی ہوتی ہے۔اسی طرح آیت کا آخری جملہ "لانکتم شھادة الله" بھی قابل غور ہے جو گواہوں کا قول ہے "وَلَانکتم" متکلم کا صیغہ ہے جو مذکر ومونث دونوں کے لئے ہے۔ان گواہوں کی یہ یقین دہانی کہ وہ اللہ کی شہادت چھپا نہیں سکتے دراصل حکم الٰہی ولا تکتموا الشھادة و من یکتمھا فانه آثم قلبه ۔(البقرہ/۲۸۳) کی صدائے باز گشت ہے،جس کو تمام علماء نے مرد وعورت دونوں سے متعلق مانا ہے کہ شہادت اور گواہی چاہے مرد کی ہو یا عورت کی اس کا کتمان دونوں کے لئے موجب گناہ ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "ذوا عدل منکم" کے الفاظ کے ساتھ ساتھ آیت وصیت کا پورا اندرونی ماحول بھی یہی اشارہ دے رہا ہے کہ جن دو لوگوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ مرد ہی ہوں بلکہ وہ عورتیں بھی ہوسکتی ہیں۔

دوسری آیت جسے گواہوں کے مرد ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، سورہ طلاق کی یہ آیت کریمہ ہے:

وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا. (الطلاق ۲/)

اور اپنے میں سے دو عادل گواہ بناؤ اور اللہ کے واسطے گواہی کا حق ادا کرو۔ اس کی نصیحت کی جاتی ہے ان کو جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے راستہ نکالتا ہے۔

آیت کے الفاظ ذوی عدل منکم بعینہ وہی ہیں جو آیت وصیت میں ہیں اس لئے انکا بھی وہی مفہوم ہوگا جو آیت وصیت میں ہے یعنی لفظ "عدل" میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں، لفظ "ذوی" صرف لفظی مناسبت کی وجہ سے مذکر ہے عدل کے مفہوم و معنی کے اعتبار سے نہیں۔ "منکم" سے مراد اہل ایمان ہیں یعنی مسلمان مرد اور عورت دونوں۔

اس کے فوراً بعد "واقیموا الشھادۃ للہ" کے الفاظ ہیں جو واشھدوا ذوی عدل منکم کی تخصیص کے امکان کو ختم کئے دے رہے ہیں۔ اس لئے کہ اقامت شہادت مردوں اور عورتوں دونوں کی ذمہ داری ہے۔ یہاں اصلاً مذکورہ دونوں گواہوں کو اپنا فرض ادا کرنے کی تلقین مقصود ہے۔ لیکن صرف ان گواہوں کو مخاطب بنانے کے بجائے عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے قرآن مجید اپنے عمومی اسلوب میں کہتا ہے "اقیموا الشھادۃ للہ" قرآن کا یہ اسلوب و انداز بتاتا ہے کہ جن گواہوں کے پس منظر میں ادائے شہادت کی یہ تلقین کی جارہی ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ مرد ہی ہوں بلکہ عورتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ آیت کے اگلے الفاظ "ذلکم یوعظ بہ من کان یومن باللہ والیوم الاخر ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا" کا تعلق معاملہ سے جڑے ہوئے تمام افراد سے ہے یعنی طلاق دینے والے مرد، مطلقہ عورت اور گواہ سب ان کا مصداق ہیں جن میں مرد و خواتین سبھی شامل ہیں۔ حالانکہ تمام الفاظ مذکر ہیں۔ اس طرح ذوی عدل منکم کے الفاظ و اسلوب اور پورا سلسلۂ کلام جو آیت نمبر ۱ تا ۳ پر مشتمل ہے کی اندرونی فضا یہ شہادت دے رہی ہے کہ "ذوی عدل منکم" کو صرف مردوں سے مخصوص کرنا علمی ناانصافی ہوگی۔ بار بار مذکر الفاظ اور مذکر صیغے آرہے ہیں اور ان میں شامل مذکر و مونث دونوں ہیں۔

شہادت سے متعلق تین آیات اور ہیں جن میں مستعمل الفاظ وترکیب کو شاہد و گواہ کے لازماً مرد ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔پہلی آیت سورہ نساء کی ہے:

وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ (النساء/۱۵)	تمہاری عورتوں میں سے جو کوئی بد کاری کرے تو ان پر چار گواہ لاؤ اپنوں میں سے پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھر میں بند رکھو۔

سورہ نور میں ہے:

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاء فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً (النور/۴)	جو لوگ الزام لگائیں پاکدامن عورتوں کو پھر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی کوڑے مارو۔

سورہ نور ہی میں ہے:

لَوْلَا جَاؤُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاء فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاء فَأُوْلَئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ (النور/۱۳)	کیوں نہ لائے وہ چار گواہ۔پس جب وہ گواہ نہ لاسکے تو وہی لوگ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔

ان آیات میں مستعمل الفاظ اربعة منکم، فاشهدوا، باربعة شهداء، سے استدلال کیا جاتا ہے کہ گواہ صرف مرد ہو سکتے ہیں عورتیں نہیں خاص طور سے حدود وقصاص کے معاملہ میں عورتوں کی شہادت کو مذکورہ آیات کے انہی الفاظ کے سہارے خارج کر دیا جاتا ہے کہ عورت کی شہادت، زنا اور ان جرائم میں جو موجب حد ہیں کسی صورت میں جائز نہیں، نہ تنہا نہ مردوں کی شرکت کے ساتھ۔

بلاشبہ یہ ایسی ترکیبیں ہیں جو نحوی اصول وقواعد کے مطابق گواہوں کے مرد ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔لیکن یہاں چونکہ اربعۃ سے مراد "شہداء" ہیں جیسا کہ آخر الذکر دونوں آیات میں صراحتہ یہ لفظ موجود ہے اور اس میں جیسا کہ آیت مداینہ پر گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا گیا مرد وخواتین دونوں قطعاً شامل ہیں اس لئے اس کا اطلاق مرد و خواتین دونوں پر ہوگا نہ کہ صرف مردوں پر۔اربعۃ کا مونث ہونا صرف لفظ شہداء کی بنا پر

ہے کہ "لفظ مذکر ہے نہ کہ اس کے مفہوم کی بنا پر کہ اس میں مرد و عورت دونوں داخل ہیں۔ "شھدوا" فعل بھی صرف لفظ کا لحاظ کر کے مذکر استعمال ہوا ہے نہ کہ معنی و مفہوم کا اسی طرح "منکم" کا لفظ گواہوں کے مسلمان ہونے پر دلالت کرتا ہے نہ کہ مرد ہونے پر جب کہ آیت وصیت کے ذیل میں پہلے عرض کیا گیا۔ اس لئے ان ترکیبوں کو محض نحوی قاعدے کا سہارا لے کر گواہوں کے مرد ہونے کی دلیل بنانا صحیح نہیں ہوگا۔ اور اس لیے بھی کہ اس طرح کی بعض اور ترکیبیں قرآن مجید میں ہیں جن کا اطلاق علم نحو کے مطابق صرف مردوں پر ہونا چاہئے، مگر بالاتفاق ان ترکیبوں کے ذیل میں عورتوں کو بھی شامل تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً:

مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ (المجادلہ/۷)

تین لوگوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور پانچ لوگوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں نجویٰ ثلاثۃ اور نجویٰ خمسۃ سے مراد نحوی قاعدے کے مطابق صرف مردوں کی سرگوشی ہونی چاہئے۔ جبکہ سرگوشی مردوں کی ہو یا عورتوں کی سب اس میں شامل مانی گئی ہیں۔

کفارۂ قسم کے بارے میں فرمایا گیا:

فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ (المائدہ/۸۹)

سو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا دینا ہے۔ اوسط درجہ کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ یا کپڑا پہنانا دس محتاجوں کو۔

یہاں "عشرۃ مساکین" کی ترکیب مذکر پر دلالت کرتی ہے۔ کسوتھم میں ھم ضمیر بھی مذکر ہے اس لئے ہمارے فقہاء کے مذکورہ استدلال کے مطابق کفارہ قسم کا یہ کھانا اور کپڑا صرف مرد مساکین کے لئے جائز ہونا چاہئے۔ مسکین عورتوں کے لئے نہیں۔ حالانکہ ایسی بات کسی نے نہیں کہی ہے۔ اس لئے آیات زیر بحث کی مذکورہ ترکیبوں سے یہ

نتیجہ نکالنا گواہ صرف مرد ہو سکتے ہیں عورتیں نہیں اور بطور خاص زنا یا حدود کے معاملات میں جن سے متعلق یہ آیات ہیں، عورتوں کی گواہی قابل اعتبار نہیں ہوگی، بہت کمزور استدلال کہلائے گا۔ ہاں کوئی بہت واضح قرینہ ہوتا یا کوئی صحیح مرفوع حدیث ہوتی جس میں وضاحت ہوتی کہ ان معاملات میں گواہ صرف مرد ہو سکتے ہیں عورتیں نہیں تو پھر ان آیات کی تخصیص ہو سکتی تھی۔ لیکن نہ قرآن مجید میں ایسا کوئی اشارہ ہے اور نہ ذخیرہ حدیث میں ایسی کوئی صریح حدیث موجود ہے۔ لے دے کر ابن شہاب زہریؒ کی ایک مرسل روایت ہے جس کو حدود وقصاص کے مقدمات میں عورتوں کی شہادت کے غیر معتبر ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس روایت پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

ابن شہاب زہریؒ کی روایت:

ابن شہاب زہریؒ کی وہ روایت جو حدود وقصاص کے مقدمات میں عورتوں کی شہادت کے غیر معتبر ہونے کی واحد حدیثی بنیاد ہے، اس کے الفاظ مختلف کتابوں میں مختلف ہیں۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

جرت السنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعد ان لا تقبل شهادة النساء في الحدود و الدماء۔[۱۵]

فقہ مالکی کی معروف کتاب المدونۃ الکبریٰ میں ہے اور ترتیب کے معمولی فرق کے ساتھ بعینہ یہی الفاظ ابن حزم کی "المحلی" میں بھی ہیں:

مضت السنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم و الخليفتين من بعده انه لا تجوز شهادة النساء في النكاح و الطلاق و الحدود۔ [۱۶]

کاسانی کی بدائع الصنائع اور ابوبکر الجصاص کی احکام القرآن میں ہے:

مضت السنة في رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده ان لا تجوز شهادة النساء في الحدود ولا في القصاص [۱۷]۔

ابن شہاب کی مذکورہ روایت کی بنیاد پر جس کے الفاظ میں سخت اضطراب پایا جاتا ہے، حدود وقصاص کے معاملات میں بالعموم عورتوں کی گواہی ناقابل قبول قرار دی گئی ہے۔ جبکہ نکاح

اور طلاق کے معاملات میں عورتوں کی گواہی کے تعلق سے ہمارے فقہاء کرام مختلف الرائے ہیں۔
حالانکہ ابن شہاب کا یہ اثر روایت و درایت دونوں اعتبار سے نا قابل استناد ہے مثلاً:

۱- حدیث کی معروف اور متداول کتابوں میں اس کی تخریج نہیں ہوئی ہے صرف مصنف ابن ابی شیبہ میں اس کا ذکر ہے جس کا استنادی پہلو بہت بلند نہیں ہے۔ اس میں بھی محض حدود کے الفاظ ہیں جبکہ بعض کتابوں میں نکاح و طلاق کے بھی الفاظ ہیں اور کچھ دوسری کتابوں میں نکاح و طلاق کے بجائے قصاص کا لفظ ہے۔ یہ فرق و اختلاف اوپر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مؤطا امام مالکؒ کو زہری کے فقہی آرا کا مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے۔ مگر موطا کے کسی نسخہ میں یہ روایت موجود نہیں ہے۔ امام مالک کے فقہی آرا اور ان کے دلائل کا اہم ماخذ ''المدونة الکبری'' ہے۔ اس میں بلاشبہ یہ اثر موجود ہے مگر اس کی روایت امام مالک سے نہیں ہے بلکہ سحنون جو اس کتاب کے راوی ہیں انہوں نے ابن وہب کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ بلاشبہ علامہ شوکانی [۱۸] اور بعض دوسرے علماء [۱۹] نے اس اثر کو امام مالک سے منسوب کیا ہے مگر ہمارے خیال میں ان علماء کو المدونہ کی مذکورہ روایت سے دھوکہ ہو گیا ہے۔

۲- محدثین نے اس کے رواۃ پر سخت تنقید کی ہے۔ علامہ ابن حزم ''المحلی'' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اما الخبر الذی صدرنا به من قول الزهری مضت السنة فبلية لانه منقطع من طريق اسماعيل بن عياش وهو ضعيف عن الحجاج بن ارطاة وهو هالك [۲۰]۔

مضت السنه من النبی ﷺ والی زہری کی روایت ایک آفت ہے اس لئے کہ وہ منقطع ہے اسماعیل بن عباس سے مروی ہے جو ضعیف ہیں انہوں نے حجاج بن ارطاۃ سے اس روایت کو لیا ہے اور حجاج تباہ کن ہیں۔

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

قد اخرج قول الزهری المذكور ابن ابی شیبة باسناد فيه الحجاج بن ارطاة وهو ضعيف مع كون الحديث مرسلا لا تقوم بمثله الحجة فلا يصلح لتخصيص عموم القرآن باعتبار ما دخل تحت نصه فضلا عما لم يدخل تحته بل الحق به بطريق القياس ۲۱۔

زہری کے مذکورہ اثر کو ابن ابی شیبہ نے ایک ایسی سند سے نقل کیا ہے جس میں حجاج بن ارطاۃ ہیں جو ضعیف راوی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حدیث مرسل ہے جو قابل حجت واستدلال نہیں اس لیے اس کی بنیاد پر قرآن کے کسی عمومی بیان سے اس چیز کی تخصیص نہیں ہو سکتی جو اس کی نص کے تحت داخل ہے چہ جائیکہ اس کی تخصیص جائز ہو جو اس کی نص کے تحت داخل نہ ہو بلکہ لوگوں نے محض قیاس کی بنیاد پر اس میں شامل کر دیا ہے۔

۳- بظاہر یہ روایت مرسل ہے جیسا کہ شوکانی نے کہا ہے مگر ابن حزم نے اسے منقطع قرار دیا ہے۔ یہ ممکن بھی ہے اس لئے کہ امام زہریؒ صغار تابعین میں سے ہیں اور منقطع روایت محدثین کے یہاں حجت واستدلال کے قابل نہیں ہوتی لیکن اگر اسے مرسل ہی تسلیم کر لیا جائے تو احناف اور مالکیہ کے علاوہ عام فقہاء اور جمہور محدثین کے یہاں مرسل روایات نا قابل قبول ہوتی ہیں۔ پھر ابن شہاب کی مرسل کا معاملہ تو بڑا نازک ہے محدثین بطور خاص اسے نا قابل اعتبار قرار دیتے ہیں:

قال ابن ابی حاتم فی بداية كتابه "المراسيل" كان يحي بن سعيد القطان لا يرى ارسال زهری و قتادة شيئا ويقول هو بمنزلة الريح ۲۲

ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب "المراسیل" کے شروع میں کہا ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان، زہری اور قتادہ کی مرسل روایت کو کوئی اہم اہمیت نہیں دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہ منزلۂ بادِ رہوا ہیں۔

یحییٰ بن معین اور بعض دوسرے محدثین نے بھی ارسال زہری کو نا قابل التفات قرار

دیا ہے یہاں تک کہ اسے "اثر المراسیل" تک کہا گیا ہے۔[۲۳]

۴- فقہاء و محدثین اس حدیث کو کمزور قرار دیتے ہیں جس کے راوی کا عمل یا فتویٰ اپنی ہی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہو یہاں بھی صورت حال یہی ہے۔ابن شہاب کے نزدیک قصاص کے مقدمہ میں ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت جائز ہے مصنف عبدالرزاق میں ہے قال ابن شهاب تجوز شهادة النساء على القتل اذا كان معهن راجل واحد[۲۴]۔

۵- امام زہری کے اس اثر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نکاح وطلاق اور حدود و قصاص کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی کا نا قابل قبول ہونا عہد صحابہ و تابعین سے ایک عام اور متفق علیہ معمول رہا ہے اور اسے سنت کا درجہ بھی حاصل رہا ہے۔اسی طرح متاخرین فقہاء بھی یہ تاثر دیتے ہیں کہ حدود و قصاص کے مقدمات میں فقہاء اربعہ سمیت، ان کے عہد اور ماقبل و مابعد کے جملہ فقہاء کا یہی اجماعی مسلک ہے حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔اگر ایک طرف صحابہ و تابعین کی خاصی تعداد ان معاملات میں عورتوں کی گواہی کے عدم جواز کی قائل ہے تو دوسری طرف انہی کے عہد میں حدود و قصاص اور نکاح وطلاق کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی کو تسلیم بھی کیا گیا ہے اور اس کے جواز کا فتویٰ بھی دیا گیا ہے۔ صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱- عن ابی لبید قال ان سكر انا طلق امرأته ثلاثا فشهد عليه اربع نسوة فرفع إلى عمر فاجاز شهادة النسوة و فرق بينهما.

۲- عن عطاء قال: اجاز عمر بن الخطاب شهادة النساء مع الرجال في الطلاق و النكاح.

۳- ان امرأة اوطأت صبيا فقتلته فشهد عليها اربع نسوة فاجاز علي بن ابي طالب شهادتهن.

۴- قالت هند بنت طلق: كنت في نسوة و صبي مسيحي فقامت امرأة فمرت فوطأته فقالت ام الصبي قتلته والله. فشهد عند علي

عشر نسوة وانا عاشرتهن فقضى على عليها بالدية.

۵- عن محمد بن الحنفية تجوز شهادة النساء فی الدية

۶- صح عن الشعبی قبول شهادة رجل و امرأتين فی الطلاق و جراح الخطاء.

۷- قال طاؤس: تجوز شهادة النساء فی کل شی مع الرجال الا الزنا من اجل انه لاینبغی ان ینظرن إلی ذلک.

۸- عن عطاء بن ابی رباح قال: لو شهد عندی ثمان نسوة علی امرأة بالزنا لرجمتها.

۹- عن عطاء بن ابی رباح قال: تجوز شهادة النساء مع الرجال فی کل شی وتجوز علی الزنا امرأتان و ثلاثة رجال.

۱۰- قال سفیان الثوری تقبل امرأتان مع رجل فی القصاص و فی الطلاق و النکاح.

نکاح وطلاق اور حدود وقصاص سے متعلق صحابہ وتابعین کے یہ فیصلے، رائیں اور فتوے صرف ایک کتاب "المحلی" سے نقل کئے گئے ہیں ۲۵۔ دوسری کتابوں میں تلاش وتتبع سے مزید اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ نیل الاوطار میں ہے:

وقع الخلاف فی قبول شهادة النساء فی القصاص کالمرأتین مع الرجل فحکی صاحب البحر عن الاوزاعی و الزهری ان القصاص کالاموال فیکفی فیه شهادة رجلین او رجل و امرأتین ۲۶۔	قصاص کے معاملہ میں عورتوں کی شہادت کے قابل قبول ہونے میں اختلاف ہے جیسے کہ ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں گواہ ہوں۔ چنانچہ صاحب البحر نے نقل کیا ہے کہ امام اوزاعی اور زہری کا خیال ہے کہ قصاص اموال کی طرح ہے اس لئے اس میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کافی اور معتبر ہوگی۔

علامہ ابن حزم اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا یجوزان یقبل فی الزنا اقل من اربعة رجال عدول مسلمین اومکان کل رجل امرأتان مسلمتان عدلتان. ۲۷

(جائز نہیں ہے کہ زنا کے معاملہ میں چار مسلمان عادل مردوں سے کم کی شہادت قابل قبول ہو یا ہر ایک مرد کی جگہ دو مسلمان عادل عورتوں سے کم کی شہادت قابل قبول ہو۔)

علامہ ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

کل اتفقوا علی انه تثبت الاموال بشاهد عدل ذکر و امرأتین .... واختلفوا فی قبولهما فی الحدود ...... وقال اهل الظاهر تقبل اذا کان معهن رجل و کان النساء اکثر من واحدة فی کل شئی. ۲۸۔

تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ مالی معاملات ایک عادل مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ البتہ حدود کے معاملات میں ان عورتوں کی گواہی کی قبولیت کے باب میں اختلاف ہے) .... اہل ظاہر کہتے ہیں کہ ان کی شہادت ہر چیز میں قابل قبول ہے بشرطیکہ ان کے ساتھ ایک مرد ہو اور عورتیں ایک سے زائد ہوں۔

صحابہ و تابعین اور بعد کے فقہاء مسلمین کے یہ وہ اقوال اور فیصلے ہیں جن میں نکاح و طلاق اور حدود و قصاص کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی کو جائز اور قابل قبول ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے برعکس صحابہ و تابعین کی بڑی تعداد ان مقدمات میں عورتوں کی گواہی کو غیر معتبر اور نا قابل قبول قرار دیتی ہے۔ جبکہ بعض دیگر صحابہ و تابعین سے جن میں خود امام زہری بھی شامل ہیں۔ عورتوں کی گواہی کے جواز اور عدم جواز دونوں طرح کے اقوال منقول ہیں۔ ایک ہی مسئلہ میں ان متنوع اور متضاد خیالات و آراء کا پایا جانا واضح دلیل ہے کہ کبھی یہ مسئلہ اتفاقی اور اجماعی نہیں رہا ہے اور نہ ان مقدمات میں عورتوں کی شہادت کے عدم جواز کو صدر اول کے مسلمانوں میں کبھی رائج معمول کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اس لئے ابن شہاب کا یہ کہنا

کہ ''دور رسالت اور اس کے بعد عہد شیخین سے یہ سنت جاری رہی ہے کہ عورتوں کی شہادت نکاح وطلاق اور حدود وقصاص میں جائز اور قابل قبول نہ ہو'' سخت محل نظر ہے۔ صرف اس ایک روایت کی بنیاد پر مذکورہ معاملات میں عورتوں کی شہادت کے عدم جواز کو سنت نبوی پر مبنی قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

ابن شہاب کے مذکورہ اثر پر ہماری اس گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی روایتی حیثیت بہت مخدوش ہے۔ درایت کے اعتبار سے بھی اس میں متعدد سقم پائے جاتے ہیں۔ اس لئے مسئلہ زیر بحث میں اس کو دلیل بنانا نہایت کمزور استدلال ہوگا اور اس کی بنیاد پر کسی بات کو سنت قرار دینا، اس کو رسول خدا کی طرف منسوب کرنا اور اس کی بنیاد پر قرآن مجید کے کسی عام حکم کو خاص کر دینا بڑی جرأت کی بات کہلائے گی۔

کیا عورت کی گواہی نصف ہے:

عورتوں کی گواہی کو آیت مداینہ کی بنیاد پر مرد کی گواہی کے نصف کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کا فہم خام اور حفظ وضبط کمزور ہوتا ہے اس لئے ان کی گواہی میں یک گونہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

لان فی شھادۃ النساء ضر با من الشبھۃ فان الضلال و النسیان یغلب علیھن ویقل معھن معنی الضبط و الفھم بالا نوثۃ۲۹۔

عورتوں کی شہادت غیر معتبر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی گواہی میں ایک طرح کا شبہ ہوتا ہے اس لئے کہ ضلال ونسیان ان پر غالب رہتا ہے اور عورت ہونے کی وجہ سے فہم وضبط کی صلاحیت بھی ان میں کم ہوتی ہے۔

اس خیال کی بنیاد آیت مداینہ میں ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو گواہ بنانے اور اس کے بعد والے الفاظ ان تضل احداھما فتذ کر احدٰھما الاخری ہیں۔

پہلے آیت مداینہ ملاحظہ کیجئے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلاَ يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّهَ رَبَّهُ وَلاَ يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئاً فَإن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهاً أَوْ ضَعِيفاً أَوْ لاَ يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُواْ شَهِيدَيْنِ من رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاء أَن تَضِلَّ إْحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى. (البقرہ/۲۸۲)

اے ایمان والو! جب تم آپس میں کسی متعین وقت تک کے لئے ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو..................اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو۔ پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو۔ ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو بطور گواہ تاکہ ان میں سے کوئی بھٹک جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔

اس آیت کے الفاظ واسلوب پر غور کرنے سے کم از کم تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- شہادت و گواہی کے سلسلہ میں مردوں کو عورتوں پر اولیت دی گئی ہے یعنی مرد اور عورت دونوں موجود ہوں تو گواہ مردوں کو بنایا جائے گا عورتوں کو نہیں۔ البتہ مردوں کی عدم موجودگی میں دوسرے نمبر پر ہی عورتوں کو گواہ بنایا جاسکتا ہے۔

۲- آیت میں مذکور لفظ "شہید" کا اطلاق جس طرح تنہا ایک مرد گواہ پر ہو رہا ہے۔ اسی طرح اس کا اطلاق تنہا ایک گواہ عورت پر نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ دو عورتوں کے مجموعہ پر اس کا اطلاق ہو رہا ہے یعنی ایک گواہ مرد تو لفظ شہید کا مصداق ہے لیکن تنہا ایک گواہ عورت اس کا مصداق نہیں ہے۔ بلکہ دو عورتیں مل کر لفظ شہید کا مصداق قرار پائیں گی۔

اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ جب ایک گواہ عورت نسیان و ضلال میں مبتلا ہوئے بغیر بالکل ٹھیک ٹھیک اپنا شہادتی بیان دے دے تو بھی اس کے بیان پر اکتفا نہیں کیا جائے گا بلکہ دوسری گواہ عورت کا بیان بھی عدالت کو لینا ہوگا اور دونوں بیانوں کی بنیاد پر قاضی اور جج

کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

۳- تیسری بات جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ معلوم ہوتی ہے کہ ممن ترضون من الشہداء ، میں لفظ شہداء کا مصداق صرف مرد گواہ نہیں ہیں بلکہ خواتین گواہ بھی اس کا مصداق ہیں یعنی اس میں دونوں شامل ہیں۔ اس لئے قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی لفظ ''شہداء'' بمعنی گواہ مذکور ہے ان سب کو محض لفظاً مذکر ہونے کی وجہ سے مردوں سے مخصوص نہیں مانا جاسکتا بلکہ عورتوں کو بھی اس میں شامل سمجھا جائے گا۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گواہ خواہ مرد ہوں یا عورتیں دونوں میں شہادت کی اہلیت موجود ہے اور دونوں کی اہلیت شہادت میں کوئی بنیادی فرق بھی نہیں ہے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مرد اور خواتین دونوں شہادت کے اہل ہیں اور ان کی اہلیت شہادت میں کچھ فرق بھی نہیں ہے تو شہادت کے معاملہ میں مردوں کو عورتوں پر اولیت کیوں دی گئی اور پھر دو عورتوں کی مشترکہ شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر کیوں رکھا گیا؟

مردوں کی عورتوں پر اولیت کی وجہ:

دنیا کے تمام معاشروں میں فرائض حیات اور واجبات زندگی کے حوالہ سے مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسے امور و معاملات جن کی انجام دہی میں زیادہ قوت و محنت درکار ہوتی ہے اور زحمت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے، بالعموم وہ مردوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ جبکہ عورتوں سے متعلق ذمہ داریاں بالعموم آسان اور سہل ہوتی ہیں۔ یہ فرق و امتیاز اس لئے روا رکھا گیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی جسمانی ساخت، صلاحیت کار، قوت برداشت اور طبیعت و مزاج میں بہت زیادہ اور نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ اور یہ فرق و اختلاف ایک فطری حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ قرآن مجید دین فطرت ہے۔ اس لیے وہ بھی اپنے احکام و فرامین کے نفاذ کی ذمہ داری عائد کرتے ہوئے مرد و عورت دونوں اصناف کے صنفی فرق کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے

متعدد بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عورت کے دائرہ کار کو خانگی اور گھریلو امور و معاملات تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت کی توجہ کا اصل مرکز و محور اس کا گھر اور خاندان ہو۔ جبکہ مرد کا دائرہ کار جملہ اجتماعی و سماجی امور و معاملات تک وسیع ہو۔ لیکن دائرہ کار کی یہ حد بندی کچھ ایسی لازمی بھی نہیں ہے کہ بوقت ضرورت و حاجت مرد و خواتین ایک دوسرے کی حد میں جا کر کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ بلکہ اس میں مناسب لچک اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کے تعاون کی گنجائش بھی موجود ہے۔

شہادت کے معاملہ میں بھی قرآن مجید اس فرق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک نظری طور پر اہلیت شہادت تو دونوں کو یکساں حاصل ہے۔ اور دونوں یکساں طور پر تحمل شہادت کے ذمہ دار اور مکلّف بھی ہیں۔ مگر عملی طور پر وہ دونوں میں فرق کرتا ہے۔ جس کی وجہ مرد و عورت کا صنفی اختلاف اور دائرہ کار جدا جدا ہونا ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہئے کہ بازار اور منڈی کے معاملات اور کورٹ کچہری کے مقدمات عورتوں کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔ خالص اسلامی معاشرہ میں ایک عورت کا سابقہ ان امور و معاملات سے کم ہی پڑ سکتا ہے۔ اس لئے ان کو نہ ان مسائل سے دلچسپی ہو سکتی ہے نہ ان کی نزاکتوں اور ان کے تمام پہلوؤں پر ہر وقت ان کی نظر رہ سکتی ہے۔ اسی لئے ان کو شہادت کے معاملہ میں نمبر دو پر رکھا گیا ہے۔ ان پر مردوں کو اولیت دینے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی اہلیت شہادت میں کمی ہے یا ان کے اندر کسی قسم کا نقص اور عیب پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی شہادت مشکوک ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس کی بڑی وجہ اس زحمت و مشقت اور پریشانی و دشواری سے ان کو محفوظ رکھنا ہے جو عدالت جانے آنے، شہادت کے عمل سے گزرنے، قاضی اور فریق مخالف کی جرح و بحث کا سامنا کرنے میں ان کو پیش آئے گی، جسے وہ اپنے مخصوص ماحول اور مشاغل و حالات کی بنا پر کبھی خوش دلی کے ساتھ گوارا نہیں کر سکتیں۔ اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر ان کو بھی مردوں کی طرح عدالت و شہادت کے معاملات میں پوری طرح شامل کر لیا جائے جیسا کہ عہد حاضر میں ہو رہا ہے تو اس سے ان کے اپنے فرائض منصبی میں خلل واقع ہو گا۔ گھر اور خاندان جس کی وہ اصلاً پاسبان ہیں، کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ شہادت کے

معاملہ میں عورتوں پر مردوں کو اولیت اور فوقیت دیئے جانے کا سبب عورتوں میں حفظ وضبط کی کمی یا اور کوئی نقص نہیں ہے۔ بلکہ ان کی صنفی و ذاتی مصلحت اور گھر و خاندان کی ضرورت اس کا بنیادی سبب ہیں۔اس کا ان کی اہلیت شہادت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دو عورتوں کی مشترک گواہی کی حکمت:

یہ بات کہ جس طرح تنہا ایک مرد مستقل گواہ بن سکتا ہے اسی طرح تنہا ایک عورت مستقل گواہ نہیں بن سکتی بلکہ وہ دوسری عورت کے ساتھ مل کر ہی مستقل گواہ بن سکتی ہے۔ جسکا مطلب یہ ہوا کہ ایک عورت کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر نہیں بلکہ دو عورتوں کی مشترکہ شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے، تو بلا شبہ قرآن کا یہ بیان نہایت واضح اور بہت صاف ہے۔اس لئے اس کی کوئی تاویل وتوجیہہ کر کے عملاً ایک عورت کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر اور مساوی قرار دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کی اہلیت شہادت مرد کی اہلیت شہادت سے کم یا نصف ہے۔اگر ایسا ہوتا تو کسی معاملہ میں بھی تنہا ایک عورت کی شہادت قابل قبول نہ ہوتی۔جبکہ بعض معاملات میں ایک عورت کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر تسلیم کی گئی ہے۔آیت لعان میں جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے،میاں بیوی دونوں سے چار چار شہادتوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔اگر عورت کی اہلیت شہادت مرد سے کم یا نصف ہوتی تو لعان کے معاملہ میں شوہر کی شہادت کے بالمقابل بیوی سے دگنی یعنی آٹھ شہادتوں کا مطالبہ ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے۔اسی طرح بعض حدیثوں میں بھی بعض معاملات میں صرف ایک ہی عورت کی شہادت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔۳۰۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظری طور پر مرد و عورت کی اہلیت شہادت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر چہ بعض اسباب کی بنیاد پر عملی اعتبار سے فرق ہے اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو گواہ بنانے کے حکم خداوندی کو عورت کی ناقص اہلیت شہادت کی دلیل قرار دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک آیت کریمہ کے الفاظ ان تضل احدا ھما فتذکر احداھما الاخری کا معاملہ ہے، جس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ عورتوں پر ضلال ونسیان غالب رہتا ہے اور فہم وضبط کی صلاحیت بھی ان میں کم ہوتی ہے۔اس لئے ان کی گواہی میں ایک طرح

کا شبہ ہوتا ہے۔۱۳۱؎ اسی لئے دوعورتوں کی مشترک گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دی گئی ہے۔ تو ہمارے خیال میں آیت کریمہ کے مذکورہ الفاظ سے یہ استدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ اس فقرہ کے شروع میں مذکور لفظ ''اَن'' حرف شرط نہیں بلکہ ''اَن'' مصدر یہ ہے۔ اس لئے سہو وضلال کو سابق حکم یعنی ایک مرد کی جگہ دوعورتوں کو گواہ بنانے کی علت نہیں کہا جاسکتا۔ اگر اس کو علت تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک دونوں گواہ عورتوں میں سے ہر ایک اپنی شہادتوں میں سہو وضلال سے دو چار نہ ہوں اور دوسری تذکیر کر کے اس کی اصلاح نہ کردے تب تک ان کی شہادت کا اعتبار نہ ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے دونوں گواہ عورتیں یا ان میں سے کوئی ایک بغیر بھولے بھٹکے صحیح صحیح اپنا شہادتی بیان درج کرادے اور دوسری کے لئے اصلاح وتذکیر کی نوبت نہ آئے۔ اور یہ گواہی معتبر اور قابل قبول بھی ہوگی۔ اس لئے سہو و ضلال کو حکم مذکور کی علت قرارا دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔ علت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کبھی معلول کا وجود نہ پایا جائے۔ دوسرے یہ کہ سہو ونسیان عورتوں ہی کا خاصہ نہیں ہے۔ مرد بھی برابر بھولتے بھٹکتے ہیں۔ بحیثیت انسان اس مرض کے دونوں شکار ہیں۔ اس لئے اگر اس کو دوعورتوں کی مشترک شہادت کی علت قرار دیا جائے تو پھر تنہا ایک مرد کی بھی شہادت جائز نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ دوعورتوں کی طرح دو مردوں کی مشترک شہادت ایک تسلیم کی جانی چاہیئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

دراصل یہ فقرہ ایک طرح کی سہولت وآسانی کو ظاہر کرتا ہے جو گواہی کے معاملہ میں مرد کے بالمقابل عورتوں کو دی گئی ہے۔ جسکا حاصل یہ ہے کہ دونوں گواہ عورتیں اپنے شہادتی بیان میں ایک دوسری کی مدد کریں۔ دونوں باہم مل کر ایک دوسرے کے تعاون سے اپنا شہادتی فریضہ انجام دیں۔ دونوں ایک دوسری کے بیان پر نظر رکھیں، سبقت لسانی، یا انداز بیان کی کسی کوتاہی یا اتفاقیہ سہو ونسیان کے سبب کسی کے بیان میں کوئی نقص، کمی یا ضلال پیدا ہو جائے تو دوسری اصلاح کر کے اس کے بیان کو درست کرادے اور قاضی ان دونوں کے مشترک بیان کو تسلیم کرے۔ ایک کے بیان کی کمی کو دوسرے کے بیان کی زیادتی سے پوار کرے۔ عورتوں کو یہ سہولت ان کے خاص حالات اور ماحول کی بنا پر دی گئی ہے جبکہ مرد گواہوں کو یہ رعایت حاصل نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ مذکورہ فقرہ کا منشا بس یہ ہے کہ شہادت کی

ادائیگی میں ایک عورت کو دوسری سے مدد ملے۔ اس کا بوجھ ہلکا ہو۔ اور مدد کی شکلوں میں ایک شکل یہ ہے کہ کسی وجہ سے حقیقت واقعہ کے اظہار و بیان میں کسی سے اتفاقیہ کوئی سہو یا خطا ہو جائے تو دوسری یاد دلا کر اس کی اصلاح کرا دے۔ چنانچہ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ مذکورہ حکم کی علت ضلال نہیں بلکہ تذکیر ہے:

العلة فی الحقیقة التذکیر و لکن لما کان الضلال سببا له نزل منزلته . ۳۲؎

(علت در حقیقت تذکیر ہے مگر ضلال چونکہ اس کا سبب بنتا ہے اس لئے اس کو تذکیر کے درجہ میں رکھ دیا گیا۔)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لئے بھاری ذمہ داری ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں اس کے سہارے کا بھی انتظام فرما دیا ہے" ۳۳؎۔

حاصل یہ کہ آیت مداینہ کے الفاظ ان تضل احداهما ………… میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو عورتوں کی اہلیت شہادت کی نفی کرتی ہو یا ان کی شہادت میں کسی طرح کا شبہ پیدا کرتی ہو۔ بلکہ اس سے اس حکمت و مصلحت کا اظہار ہوتا ہے جس کی بنا پر دو عورتوں کو ایک مستقل گواہ قرار دیا گیا ہے۔

خلاصۂ بحث:

گذشتہ بحث و تفصیل سے حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱- قرآن مجید میں شہادت، شہید اور شہداء جیسے الفاظ کے مواقع استعمال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح شہادت کی مکمل طور پر اہل ہیں۔ مرد و خواتین دونوں کی اہلیت شہادت میں کوئی فرق و اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے اصولی طور پر ہر وہ معاملہ جس میں مرد کی شہادت جائز اور معتبر ہے اس میں عورت کی شہادت بھی جائز اور معتبر ہونی چاہئے۔ البتہ عملی طور پر

قرآن کا نظریہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بھاری ذمہ داری کو مرد ہی اٹھائیں۔ عورتوں پر یہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ الا یہ کہ ضرورت شدیدہ اس کی متقاضی ہو اور ان کے حصہ لئے بغیر وہ ضرورت پوری نہ ہوسکتی ہے۔

۲۔ حدود و قصاص میں بھی عورتوں کی شہادت جائز اور معتبر ہونی چاہئے۔ ابن شہاب کا وہ اثر جو اس معاملہ میں واحد حدیثی بنیاد ہے، وہ اس قابل نہیں ہے کہ اتنے اہم معاملہ میں اس کو بنیاد بنایا جائے۔ احناف کے لئے اس سے استدلال اس لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ نکاح و طلاق میں عورتوں کی گواہی کے جواز کے قائل ہیں، جبکہ ابن شہاب کے اثر میں حدود و قصاص کے ساتھ ساتھ نکاح و طلاق میں بھی عورتوں کی شہادت کو ناقابل قبول کہا گیا ہے۔

۳۔ ہر وہ معاملہ جس میں مردوں کی شہادت جائز ہے اگر اس میں عورتوں کو گواہ بنانے کی ضرورت پڑ جائے تو اولاً ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے گا اور دونوں کی مشترکہ گواہی ایک مستقل گواہی تسلیم ہوگی۔ لیکن اگر مرد سرے سے موجود ہی نہ ہوں یا وقوعہ کے وقت صرف عورتیں ہی موجود تھیں تو چار عورتوں کی گواہی ضروری ہوگی۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ طلاق کے ایک معاملہ میں چار عورتوں کی گواہی پر تفریق کا فیصلہ صادر فرمایا۔ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل خطا کے ایک مقدمہ میں چار عورتوں کی شہادت پر ادائے دیت کا فیصلہ سنایا۔

۴۔ جن معاملات میں چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً زنا، تو وہاں بھی ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنیں گی۔ اس طرح تین مرد دو عورتیں، دو مرد چار عورتیں، ایک مرد چھ عورتیں یا صرف آٹھ عورتیں گواہ بنائی جائیں گی۔

۵۔ قرآن مجید کا دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر قرار دینا عملی اعتبار سے ہے نہ کہ نظری اعتبار سے۔ نظری اعتبار سے قرآن مجید عورتوں اور مردوں کی شہادت یا اہلیت شہادت میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ بلکہ دونوں کے لئے اس کو مساوات اور برابری کے ساتھ تسلیم کرتا ہے۔ البتہ عملاً مساوات کا نہیں بلکہ تفریق کا قائل ہے۔ قرآن کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادت کی جو ذمہ داری

ایک مرد پر پڑتی ہے وہ دو عورتوں میں بٹ کر نصف نصف ہو جائے۔تا کہ ان کا بوجھ ہلکا رہے اور ایک کو دوسرے سے اس ذمہ داری کی ادائیگی میں مدد ملے۔عورتوں کو یہ سہولت ان کے مخصوص حالات و مشاغل کی بنا پر دی گئی ہے نہ کہ ان کی اہلیت شہادت میں کسی کمی اور نقص کی وجہ سے۔

مذکورہ نقطۂ نظر کی حیثیت محض ایک حاصل مطالعہ اور طالب علمانہ رائے و خیال کی ہے نہ کہ کسی حتمی فیصلہ اور فتویٰ کی۔فقہائے اسلام کی تغلیط و تردید ہرگز اس کا منشا نہیں ہے۔ اس سے ہر صاحب علم کو اختلاف و اتفاق کا حق ہے۔راقم نے جو کچھ پڑھا اور سمجھا اسکا خلاصہ من و عن سپرد قلم کر دیا۔اب خطا و صواب کا فیصلہ اہل علم کریں گے۔ان اصبت فمن الله و ان اخطأت فمنی و من الشیطان۔

حواشی و مراجع

۱- وھبہ الزحیلی ،الفقه الاسلامی و ادلته،دارالفکر،دمشق،الطبع الثالث،۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء،۷/۵۷۰

۲- اس محیرالعقول اختلاف وتضاد کے لئے دیکھئے ابو محمد بن حزم کی کتاب "المحلی" کتاب الشھادات ،لجنۃ احیاء التراث العربی،دارالجیل ،بیروت،بدون تاریخ،۹/۳۹۳ و مابعد

۳- الفقه الاسلامی و ادلته،۶/۵۷۰۔

۴- ابوبکر الجصاص،احکام القرآن ،زکریا بکڈپو،دیوبند،بدون تاریخ،۱/۶۰۹

۵- الفقه الاسلامی وا دلته،۶/۵۷۰

۶- حوالہ سابق

۷- ابواسحاق شیرازی،المھذب فی الفقه الشافعی،قاہرہ،۲/۳۳۳

۸- الموسوعة الفقهية، وزارت اوقاف کویت، طبع اول ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء، ۲۶/۲۲۹،
الفقه الاسلامی و ادلته، ۶/۵۷۲
۹- الموسوعة الفقهيه، ۲۶/ ۲۲۸-۲۲۹
۱۰- محمد بن ادریس الشافعی، "الام"، بیت الافکار الاولیه، ریاض بدون تاریخ، ص ۱۴۰۳
۱۱- الامام مالک، المدونة الکبریٰ، دار الکتب العربیة، بیروت، ۱۹۹۴ء، ۴/ ۶۵
۱۲- ابن رشد، بداية المجتهد و نهاية المقتصد، دار المعرفه بیروت، طبع رابع، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء، ۲/ ۴۶۵
۱۳- احکام القرآن للجصاص، ۱/ ۲۰۹
۱۴- "الام"، باب ما يجب على المرء من القيام بشهادته، ص ۱۴۰۷
۱۵- عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ، مصنف ابن ابی شیبه، کتاب الحدود، باب شهادة النساء فی الحدود، مکتبہ امدادیہ ملتان، ۶/ ۵۴۴، السرخسی: المبسوط، مطبعۃ السعادۃ، مصر، بدون تاریخ، ۱۶/ ۱۱۳-۱۱۴
۱۶- ابن حزم اندلسی، المحلی، ۹/ ۳۹۷، المدونة الکبریٰ، ۴/ ۲۵
۱۷- احکام القرآن للجصاص، ۱/ ۲۰۹؛ کاسانی، بدائع الصنائع، ۶/ ۲۷۹
۱۸- علامہ شوکانی، نیل الاوطار، کتاب الدماء، باب ثبوت، القتل بشاهدین، ۶/ ۳۱۰
۱۹- الموسوعۃ الفقہیہ، ۲۶/ ۲۲۷
۲۰- المحلی، ۹/ ۴۰۳
۲۱- نیل الاوطار، کتاب الدماء باب ثبوت القتل بشاهدين، ۶/ ۳۱۰-۳۱۱
۲۲- حسن مظفر رزن الموصل: القول الفصل فی العمل بحديث المرسل، باب مذاهب العلماء فی قبول الحديث المرسل و العمل ورده، جامعہ اسلامیہ مدینہ، ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء، ص ۳۸
۲۳- مذکورہ اقوال کے لیے دیکھیے: السیوطی، تدریب الراوی، تحقیق و تعلیق: دکتور احمد عمر ہاشم، قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، بدون تاریخ، ۱/ ۶۹

۲۴- مصنف عبد الرزاق ، باب هل تجوز شهادة النساء مع الرجال، تحقیق: مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، طبع اول، ۱۹۷۲ء، ۸/ ۳۳۱، (حدیث نمبر ۱۵۴۱۵)، نیل الاوطار، ۶/ ۳۱۰

۲۵- ۱ لمحلی، ۹/ ۳۹۷-۳۹۸

۲۶- نیل الاوطار، ۶/ ۳۱۰، کتاب الدماء، باب ثبوت القتل بشاهدین

۲۷- المحلی، ۹/ ۳۹۵

۲۸- بدایة المجتهد و نهایته المقتصد، ۲/ ۴۶۵

۲۹- شمس الائمہ السرخسی ، کتاب المبسوط، باب الشهادات، ۱۶/ ۱۱۴

۳۰- مصنف عبدالرزاق، کتاب الشهادات، باب هل تجوز شهادة النساء مع الرجال، المحلی، کتاب الشهادة

۳۱- السرخی، المسبوط، باب الشهادات، ۱۶/ ۱۱۴

۳۲- ناصرالدین البیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل (تفسیر بیضاوی)، دارالجیل ، بیروت، بدون تاریخ، ص ۶۵ (متعلقہ آیت)

۳۳- امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، تاج کمپنی، دہلی، طبع اول، ۱۹۸۹ء، ۱/ ۶۴۱

قرآن میں فوز وفلاح اور خسران کا تصوّر

محمد رفیع الدین فاروقی

۱۔ تصور دنیا دارالعمل اور دارالامتحان:

زندگی کا کوئی نقشہ اس وقت تک صحیح نہیں بن سکتا جب تک خالق کائنات کا صحیح تصور اور کائنات میں انسان کی صحیح پوزیشن کا تعین نہ ہو جائے۔ مشرکانہ تصور حیات رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ اس دنیا کو کئی خدامل کر چلاتے ہیں ان کے اپنے اپنے کام ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا ایک دارالجزا ہے۔ یہاں لوگوں کو ان کے کرموں کا پھل مختلف شکلوں میں ملتا رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دنیا دارالعذاب ہے۔ اس سے نروان یعنی نجات پانے کے لیے انسان کو تیاگ اور رہبانیت کا راستہ اپنانا چاہیے۔ مادہ پرست سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا ایک حادثہ کی وجہ سے وجود میں آ گئی ہے اور خود بخود چل رہی ہے۔ اس کا کوئی خالق ہے نہ مالک ہے۔ اس کی تدبیر وانتظام خود بخود فطرت کائنات میں ہے۔ ان کے نزدیک دنیا ایک عیش کدہ ہے۔ فلسفیوں کی باتیں تو محض قیاسیات ہیں۔ یہ مختلف قسم کے تصورات وحی و رسالت کی بنیاد سے محروم ہیں۔

ان مختلف تصورات کے درمیان قرآن کائنات کے خالق اور اس میں انسان کی پوزیشن کا ایک واضح تصور دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ کائنات جس میں نظام شمسی اور قمری ہے جس میں لاکھوں کہکشائیں ہیں خود بخود وجود میں نہیں آ گئیں اور نہ یہ کسی اچانک حادثہ کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ اس کا ایک اور صرف ایک خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس کا مدّبر ہے۔ اس نے اپنی اتھاہ کائنات کے ایک گوشے میں جسے دنیا کہتے ہیں انسان کو بسایا۔ اسے زندگی کا سارا سامان مہیا کیا۔ اسے علم، عقل، ارادہ، قدرت، کلام، عطا کر کے اپنا خلیفہ بنایا۔

اسے بحر و بر کی مخلوقات پر فضیلت دی اور کائنات کی بے شمار چیزوں کو اس کے لئے مسخر کیا۔ خلیفہ خود مختار اور غیر ذمّہ دار نہیں ہوتا بلکہ وہ خدا کا نائب ہوتا ہے۔اس کا کام اپنے مالک کے احکام کو پورا کرنا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔قرآن کے مطابق انسان (خلیفہ) کے لیے یہ دنیا دار العمل اور دار الامتحان ہے۔وہ یہاں نیکی یا بدی کے راستے کو اپنانے کے لیے مجبور نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے ارادے اور عمل میں بالکل آزاد ہے، چاہے بندگی کی راہ اختیار کرے یا سرکشی کی:

اَلَّـذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ،......جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔(الملک/۲)

اِنَّاخَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْہِ فَجَعَلْنٰہُ سَمِیْعًام بَصِیْرًا O اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا O،......ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔اللہ نے اسے راستہ دکھایا خواہ شکر کرنے ولا بنے یا کفر کرنے والا۔(الدھر/۳-۴)

مہلت عمل یا مدّت امتحان کے ختم پر یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے اپنے خالق کے احکام و ہدایات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو استوار کیا یا شتر بے مہار کی طرح خود مختار اور غیر ذمّہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر من چاہی زندگی گزاری ہے۔پہلی صورت میں وہ اپنے خالق و پروردگار کو راضی کر کے اس کے انعامات کا مستحق قرار پائے گا۔ایسا شخص کامیاب و کامران ہوگا۔ بصورت دیگر خدا کو جس نے ناراض کیا ہوگا وہ اپنے امتحان میں ناکام اور نامراد ہوگا۔اور سزا کے طور پر جہنم رسید کیا جائے گا۔دو مختلف طرز عمل کے دو مختلف انجام ہوتے ہیں۔فطرت اور عقل اسی کی متقاضی ہے۔

اَمْ نَـجْـعَـلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَـجْـعَـلُ الْـمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ O کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اور ان کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟۔(ص/ ۲۸)

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ، سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ O کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کردیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہوجائے؟ بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں (الجاثیہ/۲۱)

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ O مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ O کیا ہم فرمانبرداروں کا حال مجرموں جیسا کردیں؟ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے، یہ کیسے حکم لگاتے ہو؟۔(القلم/۳۵-۳۶)

۲- امتحان کا نتیجہ کامیابی یا ناکامی

ہر امتحان وآزمائش کا نتیجہ کامیابی یا ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔دنیا میں مختلف لوگوں کا کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے جس کے حاصل ہوجانے کو وہ بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔عموماً مال ودولت، جائیداد، ٹائیٹلس، عیش وآرام،عہدے ومنصب وغیرہ کے حاصل ہوجانے کو بڑی کامیابی سمجھا جاتا ہے۔لیکن قرآن کی نظر میں دنیا وما فیھا اور ہفت اقلیم کی بادشاہی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔کیونکہ یہ سب حیات چندروزہ کے سامان ہیں۔جو ہنگامی اور وقتی ہیں۔جو جلد یا بدیر فنا ہونے والے ہیں۔قرآن کی نظر میں حقیقی فوز وفلاح آخرت کی دائمی کامیابی ہے اور حقیقی خسران آخرت کی ابدی ناکامی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ، وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ، وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ O ......آخرکار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کردیا جائے۔رہی یہ دنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔(ال عمران/۱۸۵)

لَا يَسْتَوِيْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ، اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ O ...... دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں

ہو سکتے۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔(الحشر/۵۹)

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی O وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا O فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی O وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ O وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی O فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی O ......جس نے حق سے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی۔اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تھا جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔ (النازعات/۳۷-۴۱)

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ O وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ O ......یقیناً نیک لوگ مزے میں ہوں گے اور بے شک بدکار جہنم میں جائیں گے۔(انفطار/۱۳-۱۴)

۳- فوز وفلاح کے شرائط-ایمان اور عمل صالح:

آخرت کی ابدی کامیابی کے لیے قرآن صرف دو شرطیں پیش کرتا ہے۔یعنی ایمان اور عمل صالح۔ یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ان کا باہمی تعلق بیج اور درخت کا سا ہے۔جس طرح بغیر بیج کے درخت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جو بیج میں ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔اگر بیج اچھا ہو تو درخت بھی توانا ہوگا اور بیج ناقص ہو تو اس سے نکلنے والا درخت بھی بودا اور ناپائیدار ہوتا ہے۔پس اگر ایمان کامل ہو اور یقین کی دولت سے مالا مال ہو تو اس سے اعمال صالح اور بہترین اخلاق وکردار کا صدور ہوگا۔قرآن میں بیسیوں مقامات پر ایمان اور عمل صالح کو کامیابی کی لازمی شرائط کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔کہیں بھی صرف ایمان کو یا صرف نیک عمل کو کامیابی کے لیے کافی نہیں کہا گیا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ، ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْکَبِیْرُ O جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ان کے لیے جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ ہے بڑی کامیابی۔ (بروج/۱۱)

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ O ......جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں

فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔......(القصص/ ٦٧)

وَالْعَصْرِ O اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ O اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، ......زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے،......(العصر/۱-۳) [مزید دیکھئے البقرہ ٦٢، المائدہ ٦٩، کہف ۸۸، مریم ٦۰، الفرقان ۷۰، القصص ٦٢، السبا ۳۸، مومن ۴۰، التغابن ۹، العنکبوت ۹، النساء ۱۲۴،]

اس طرح متعدد آیات میں کامیابی کے لیے ایمان کے ساتھ عمل صالح کو اور عمل صالح کے ساتھ ایمان کو لازم وملزوم قرار دیا گیا۔ اب ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ قرآن میں ایمان اور عمل صالح کی کیا تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

فلاح آخرت کی شرط اوّل ایمان:

قرآن میں ہر جگہ ایمان کی تفصیل نہیں دی گئی۔ لیکن قرآن کی اصطلاح میں ایمان سے مراد پانچ باتوں پر ایمان لانا ہے۔ (۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالملائکہ (۳) ایمان بالکتب (۴) ایمان بالرسل (۵) ایمان بالآخرت۔ اگر ان پانچ چیزوں کا اختصار کیا جائے تو وہ توحید، رسالت اور آخرت سے موسوم ہو جاتے ہیں۔ اس کا اجمالی ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے۔ اس میں سے ہر جز اپنی جگہ اہم ہے اور کسی کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس لئے تجدید ایمان کی بات ہے:

یٰٓاَ یُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ، وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا O ......اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخر سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔، (النسآء 4 :136) (مزید دیکھئے البقرہ آیات ۱ تا ۵، ۱۷۷، ۲۸۵)

(۱) ایمان باللہ: اللہ کو ایک جاننا اور ایک ماننا جیسا کہ وہ اپنے اسماء اور صفات اور کمالات میں ہے۔ اور اس کی ذات، صفات، حقوق اور اختیارات میں کسی کو شریک وسہیم نہ سمجھنا۔

(۲) ایمان بالملائکہ: ملائکہ ایک غیر مرئی مخلوق ہے۔ ان کی فطرت میں اطاعت ہے۔ اللہ کے کسی حکم سے وہ سرتابی نہیں کرتے۔ اللہ ان سے امور کائنات کی تدبیر وانتظام میں خدمت لیتا ہے۔

(۳) ایمان بالکتب: اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے مختلف زمانوں اور زبانوں میں پیغمبروں پر صحیفے اور کتابیں نازل کی ہیں۔ قرآن میں ابراہیم علیہ السلام پر صحیفوں، موسیٰؑ پر تورات، داوٗدؑ پر زبور اور عیسیٰؑ پر انجیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے نازل کرنے کا ذکر ہے۔

(۴) ایمان بالرسل: انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ انسانوں ہی میں سے کسی (بشر) کو منتخب کر کے اپنا نبی ورسول مقرر کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے سامنے اللہ کے احکام کی تشریح وتوضیح اپنے قول سے پیش کریں۔ ان کی زندگی اپنی قوم کے لیے نمونہ ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ تقویٰ اور اطاعت اختیار کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے پیغامبری کے کام میں بے لوث ہوتے ہیں۔

(۵) ایمان بالآخرت: آخرت پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ یہ دنیا آزمائش کے لیے ہے۔ یہاں انسان کو ارادے کی آزادی اور عمل کا اختیار دے کر مختصر سی مدت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ مدت امتحان کے بعد موت واقع ہوجاتی ہے۔ اور ایک دن قیامت برپا ہوجائے گی۔ موجودہ نظام درہم برہم ہوکر نیا نظام قائم ہوگا۔ وہاں انسان کو اس کے کارنامہ حیات کا حساب دینا ہوگا۔ اگر اس نے اپنی زندگی میں اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کی ہوگی تو اللہ راضی ہوگا اور اس کو انعام کے طور پر جنت سے سرفراز کیا جائے گا۔ بصورت دیگر اس کو عذابِ جہنم سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اسلام کا نظریہ حیات اس کی ایمانیات ہیں۔ جو لوگ اس نظریہ کو تسلیم کر لیتے ہیں ان کے رنگ و نسل، اور علاقے اور زبان کے فرق کے باوجود ایک "خیر امت" بن جاتے ہیں۔ ایمان کا اثر ان کی سوچ و فکر پر، ان کے آداب پر، آرٹ اور کلچر پر، ان کی صنعت اور تعمیرات پر، ان کے ظروف اور لباس پر، ان کے نشست و برخواست پر غرض یہ کہ پوری زندگی میں ایمان کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے باہمی ربط و تعلق سے اسلامی معاشرت اور اسلامی تہذیب و تمدن وجود میں آتا ہے۔ یہ چیز ان میں اخوت اور عالمگیر یکسانیت پیدا کرتی ہے۔

فلاح آخرت کی شرط دوم-عمل صالح:

"عمل صالح" قرآن کی ایک جامع اصطلاح ہے اس سے مراد وہ سارے نیک کام ہیں جن کے کرنے کا حکم اللہ اور رسول نے دیا ہے۔ اس کا دائرہ انفرادی تزکیہ نفس و عبادات اور اخلاقیات سے لے کر معاشرتی، معاشی اور سیاسی نوعیت کے سارے اجتماعی خیر و صلاح کے کام ہیں۔ کسی عمل کے عمل صالح ہونے کے لیے ضروری ہے اس کی تہہ میں ایمان ہو۔ ورنہ جو عمل بظاہر نیک اور بھلا ہو، وہ آخرت کے اجر سے محروم ہوگا۔ اس کی مثال امتحان کے اس جوابی پرچے کی سی ہے جس پر رول نمبر اور جوابات درج ہوتے ہیں۔ کوئی کتنے ہی اچھے جواب لکھے لیکن اگر اس نے اس پر رول نمبر نہیں لکھا تو وہ پرچہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح چاہے کوئی غیر مسلم اپنے عمل میں کتنا ہی نیک ہو لیکن آخرت کے اعتبار سے وہ بے فیض ہے۔ اس کا اجر اس کے لئے سراب ہو جائے گا۔ قرآن میں فوز و فلاح کے لئے جن اعمال صالحہ کو جوڑا گیا ہے، وہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہیں۔

فلاح پانے والوں کی اساسی خصوصیات:

قرآن مجید کی ابتدا ہی فلاح کے تصور سے ہوئی ہے۔

الٓمّٓ O ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ، هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ O الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ O وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ O اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى

مِّنْ رَّبِّهِمْ ، وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O ...... ا-ل-م- یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیز گاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں اُن سب پر ایمان لاتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (البقرہ/۱-۵)

اللہ اور رسول کی اطاعت:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِذَا دُعُوْآ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ O...... ایمان والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول ان کے مقدمے میں فیصلہ کرے تو کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔ (النور/۵۱-۵۲)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا O يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ، وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا O...... اے ایمان لانے والو، اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ (الاحزاب/۷۰-۷۱)

اللہ اور رسول کی اطاعت ہر اطاعت پر مقدم ہوگی۔ اس کے بعد، امراء، والدین، شوہر، اساتذہ وغیرہ کی اطاعت ہوگی۔ اس سلسلے میں حدیث کے مطابق قائدہ کلیہ یہ ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں۔

تزکیہ نفس:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی O ......فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ (اعلیٰ/۸۷)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O ......اللہ سے ڈرتے رہو، شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔ (البقرہ/۱۸۹)

وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَO ...... اے مومنو، تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ (النور/۳۱)۔

تزکیہ نفس، دراصل باطنی اصلاح اور ظاہری تصفیہ اخلاق کا نام ہے۔ باطن میں انسان اپنے نفس کو ایمان کے بارے میں تشکیک وتذبذب سے، کبر وغرور سے، کینہ وحسد سے، بغض وعداوت سے، نفاق اور شح نفس سے پاک کرے۔ اور اس کو توبہ استغفار سے، اللہ کے ذکر سے، اس پر توکل واعتماد سے، امید اور خوف سے، تقویٰ اور احسان سے، اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے، نوافل کی کثرت اور کتاب اللہ میں استغراق سے اللہ کا تقرب حاصل کرے۔ اسی طرح ظاہر میں اس تزکیہ نفس کا اثر اس کے پورے اخلاق اور سیرت پر پڑے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو اخلاق رذیلہ سے بچائے رکھے اور اخلاق فاضلہ کو پروان چڑھائے۔

عبادات اور اخلاق:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ. الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ. إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِيْنَ. فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ. أُولَئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ. الَّذِيْنَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ.

یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو: اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغویات سے دور رہتے ہیں، زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی

حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں اوران عورتوں کے جوان کی ملک یمین میں ہوں کہ ان پر محفوظ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں، البتہ جواس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں، اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔یہی لوگ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔(المومنون 23:11-1)

حقوق العباد:

فَـاٰتِ ذَاالْـقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ، ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O ......پس رشتہ دار کو اس کا حق دو، اور مسکین و مسافر کو اس کا حق ۔ یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں،اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔(الروم 30: 38)

حقوق العباد میں والدین کے حقوق، زوجین کے حقوق، اولاد کے حقوق، یتیموں کے حقوق، خادموں کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، فقیروں، مسکینوں محتاجوں اور بے سہاروں کے حقوق، مسافروں کے حقوق سب شامل ہوں گے۔اس طرح سے یہ دائرہ بلا کسی رنگ ونسل، علاقہ وزبان تمام انسانوں تک پھیل جاتا ہے۔

شیطانی کاموں سے پرہیز:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O ...... اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ (المائدہ/۹۰)

ہر وہ کام جو کتاب وسنت کی تعلیمات سے ٹکراتا ہو۔وہ ایک شیطانی کام ہے، امور جاہلیت میں سے ہوگا۔اس طرح اس آیت میں بیان کئے گئے کاموں کے علاوہ تمام گناہ کے کام عمل شیطان میں شمار کئے جائیں گے۔خمر سے مراد تمام نشہ آور چیزیں ہیں۔اور میسر میں لاٹری، سٹہ دھوکہ کے کاروبار سب شامل ہوں گے۔ازلام میں نہ صرف بتوں کے استھان ہیں

بلکہ اس میں غیر اللہ کے تمام آستانے شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ فحاشی و بے حیائی، عمل قوم لوط، زنا اور تمام فسق و فجور والے کام اعمال شیطان میں شمار کئے جائیں گے۔

اخلاقیات:

يَآ يُّهَا الَّذِينَ امَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O ...... اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔(ال عمران/۲۰۰)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ، وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O ...... جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو، اور سنو اور اطاعت کرو، اور اپنے مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ جو لوگ اپنی دل کی تنگی سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔(التغابن/۶۴)

اخلاقیات میں جو فضائل ہیں انہیں اختیار کرنا جیسے صداقت، امانت، ایفائے عہد، عدل، تعاون، تواصی بالحق، تواصی بالصبر عفو و درگزر وغیرہ۔ اور جو اخلاقی برائیاں ہیں ان سے اجتناب کرنا مثلاً جھوٹ، خیانت، بدعہدی، تکبر، غیبت، چغلی، پیٹھ پیچھے برائیاں کرنا، حسد، بغض و کینہ، شح نفس، ریاکاری، دورخا پن وغیرہ۔

تمام اعمال خیر:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ امَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O ...... اے لوگو جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو، اسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔ (الحج/۷۷)

"اعمال خیر" ایسے جامع الفاظ ہیں جس میں تمام، قولی اور عملی بھلائیاں اور خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ یعنی انسان کو فلاح پانے کے لیے حتی الامکان اپنے ظاہر سے باطن تک نیکی اور بھلائی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

معاش-اکل حلال کی تلاش:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O ......پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو۔ شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہوجائے۔ (الجمعہ/۱۰)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔ (آل عمران/۱۳۰)

قرآن کی معاشی تعلیمات میں کمانے اور خرچ کے متعلق یہ احکام ہیں کہ باطل طریقوں سے مال حاصل نہ کیا جائے جیسے سود، رشوت، تطفیف، یتیموں کا اور وراثت کا مال کھا جانا۔ جوا، قحبہ گری، فحاشی، خیانت، بت فروشی، و بت گری، جادو وغیرہ۔ اسی طرح سے جائز کمائی ہوئی دولت کا اسراف، فضول خرچی اور ریا کاری منع ہے۔

اللہ کے راستے کی جدوجہد:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ، وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ، وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ، وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ O ......حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ (التوبہ/۱۱۱)

اس آیت میں ایمان لانے کو معاہدہ بیع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور پھر اس کے

مطابق اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی جدوجہد کو فی سبیل اللہ کی جدوجہد کہا گیا۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے جان و مال سے جدوجہد کی جائے۔ایسے لوگوں سے جنت کا وعدہ ہے۔جو بڑی کامیابی ہے۔

دعوت اسلامی:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O ......تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہییں، جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔جو لوگ یہ کام کریں وہی فلاح پائیں گے۔(ال عمران/۱۰۴)

قرآن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام مسلم معاشرے میں ہر سطح پر لازمی قرار دیا گیا ہے۔اسلامی حکومت کے حکام اور امراء، علماء اور مشائخ، والدین اور اساتذہ، اور جماعت اور تحریکات کو بلکہ خیر امت کے ہر فرد کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا کام کرنا چاہئے۔

آخرت میں فوز وفلاح اور نجات حاصل کرنے کے لئے ایمان اور عمل صالح کی شرائط کو پورا کرنا لازمی ہے۔ایمان دل کی گہرائی اور یقین کے ساتھ ہو۔اور عمل صالح کا دائرہ انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔قرآن اس سے اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً کا تقاضا کرتا ہے۔ہر حال میں اللہ کی پرستش، بندگی وغلامی اور اطاعت وفرمابرداری ہو۔

دنیا اور آخرت کے اچھے وعدے:

قرآن میں ہر جگہ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ اختیار کرنے والوں کو ہی دنیا اور آخرت کے انعامات کا مژدہ سنایا گیا ہے۔دنیا میں ان سے خلافت اور تمکنت فی الارض اور پاکیزہ زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔اور آخرت میں جنت کی لازوال نعمتوں کی بشارتیں ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا، يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا، ......

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا، پس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ (النور/ ۵۵)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً، وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝، ...... جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا کی زندگی میں بھی پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔ (النحل/ ۹۷)

ان دونوں آیات میں ایمان اور عمل صالح اختیار کرنے والوں کے لئے دنیا میں بھی خلافت ارضی (ریاستِ اسلامی) اور پاکیزہ و صالح معاشرہ کی طرف واضح الفاظ میں وعدہ کیا گیا ہے۔

آخرت کی جو بے شمار نعمتیں ہیں وہ بھی اِنہیں اہل ایمان اور عمل صالح اختیار کرنے والوں کے لیے ہیں۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، ...... اے پیغمبر جو ایمان لائیں اور اپنے عمل درست کرلیں، انہیں خوشخبری دیدو کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ (البقرہ / ۲۵)

قرآن میں خسران کا تصور:

جس طرح فلاح کے تصور میں دنیا اور آخرت کا تصور شامل ہے، اسی طرح خسران کے مفہوم میں بھی آخرت کے خسران کے ساتھ دنیا کے نقصانات بھی شامل ہیں۔

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ، ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ۝ (الحج/ ۱۱) مثلاً قرآن میں شراب، جوئے اور زنا کو منع کیا گیا ہے۔ اس کا اخروی نقصان (گناہ) تو ہوگا ہی لیکن

اس کے ساتھ دنیا میں بھی صحت کی خرابی، روپے کا زیاں اور خاندانی پریشانی سے دوچار ہونا یقینی ہے۔ اسی پر قرآن کی دیگر اخلاقی تعلیمات، معاشرتی، معاشی اور سیاسی احکام کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ آج دنیا میں جو خونریزیاں، تباہ کاریاں، فتنہ وفساد برپا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان نے وحی ورسالت کے سرچشمہ ہدایت کو فراموش کر دیا اور خود ہی اپنا قانون ساز ہوگیا۔ بحر و بر میں اس نے اپنی تباہی کے سامان جمع کر رکھے ہیں۔ ہر ملک دفاع کے نام پر اپنی زمینی، فضائی اور بحری بیڑوں کی طاقت میں اضافہ کر رہا ہے۔ بلکہ اب اکثر ممالک میں اٹامک نیوکلیر، بائیلوجکل ہتھیاروں کی دوڑ ہو رہی ہے۔ اور طاقتور کمزور کو کھائے جا رہا ہے۔ ظلم و جبر اور استعماریت کی نئی نئی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں۔ انصاف کے علمبردار خود ہی سفاک اور ظالم بنے ہوئے ہیں۔ جس سے امن عالم کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ O ...... خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آئیں۔ (الروم / ۴۱)

خسران کی اصل جڑ:

قرآن کے مطابق غیر اسلامی زندگی سے آخرت کا خسران یقینی ہے۔ یعنی جن کا نظریہ حیات اور طرز زندگی خدا فراموشی اور آخرت فراموشی پر مبنی ہو وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔ غیر اسلامی نظام زندگی سے مراد کسی بھی قسم کا خود ساختہ مذہب اور کوئی بھی رائج الوقت نظام (سوشلزم، کمیونزم، سرمایہ دارانہ جمہوریت، بادشاہی) ہوسکتا ہے۔ قرآن میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا گیا کہ خدا کے نزدیک غیر اسلام ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ، وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ O...... جو بھی اسلام (اللہ کی فرمانبرداری) کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔ (ال عمران / ۸۵)

خسران کی وجوہات:

قرآن ہمارے سامنے ان وجوہات کو کھول کر بیان کرتا ہے جس سے انسان خسران سے دوچار ہوتا ہے:

(۱) خدافراموشی اور خودفراموشی: خسران کی اصل وجہ خدافراموشی ہے جو خودفراموشی کا نتیجہ ہے۔ جب کوئی اپنے خالق، مالک، حاکم اور پروردگار کو بھول جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت اور اوقات کو بھی بھول جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے وجود کو اتفاقی پیدائش یا حادثہ کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا میں پائے جانے والے جانوروں میں ایک جانور سمجھتا ہے۔ جس کا مقصد زندگی کھانے پینے، آرام کرنے اور نسل کی افزائش کے علاوہ کچھ نہیں۔ الا یہ کہ وہ ایک حیوان ناطق ہے، علم اور عقل بھی رکھتا ہے لیکن اس کی سوچ جانوروں کی سطح سے بلند نہیں ہے۔ وہ ڈارون کے فلسفہ "تنازع للبقا" کو شوشل فلاسفی میں تبدیل کر کے طاقتور کو ہی جینے کا حقدار سمجھتا ہے۔ اسی فلسفہ نے دنیا میں رنگ، نسل، قوم، علاقہ کی بنیاد پر عالمگیر تباہ کاریاں مچائی ہیں۔ جیسا کہ جنگ عظیم دوم میں اور دیگر جنگوں میں دیکھا گیا۔ یہ سب نتیجہ ہیں خدافراموشی اور خودفراموشی کا۔ چنانچہ اللہ نے اس سے خبردار کیا ہے کہ یہ بہت برا انجام والا راستہ ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ O......اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا یہی لوگ فاسق ہیں۔(الحشر 59 : 19)

(۲) آسمانی ہدایت سے بے پروائی: خسران کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کسی ایسے ذریعہ ہدایت ورہنمائی کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا جو فوق الفطری ہو، جو وحی اور الہام پر مبنی ہو۔ وہ کہتا ہے جب اس نے خدا کو دیکھا ہی نہیں تو پھر اس کی بھیجی ہوئی ہدایات کو ماننا کیا معنی؟۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ کے تجربات، موجودہ مشاہدات سے عقل کی روشنی میں اپنا راستہ خود بنا لے گا۔ لیکن وہ گھڑی کے رقاصہ کی طرح

افراط وتفریط میں ڈولتا رہتا ہے۔ اوراعتدال اور توسط اور سلامتی کی راہ کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔ (یہ فکر ہیگل کے فلسفہ تاریخ کے مطابق کام کر رہی ہے۔) وہ اپنے ظن اور قیاس سے خودساختہ قوانین کی وادیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔

وَمَا قَدَرُ وااللّٰهِ حَقَّ قَدْرِہٖۤ اِذْ قَالُوْ ا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْ ءٍ، ...... O ان لوگوں نے اللہ کا بہت غلط اندازہ لگایا جب کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔ (انعام/۹۱)

وَقَالَ الَّـذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَاالْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْه، ......

O اور جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز نہ اس قرآن کو مانیں گے، نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے۔.......... (سبا /۳۱)

قَالُوْا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ O انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ تم جس دین کی طرف بلانے کے لیے بھیجے گئے ہو ہم اس کے کافر ہیں۔ (الزخرف/۲۴)

قَالُوْا مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْ ءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ O بستی والوں نے کہا" تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان، اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے، تم محض جھوٹ بولتے ہو"۔ (یٰسین/ ۳۵)

مابعد طبعی الٰہیات کے بارے میں جدید دور کا انسان کچھ نہیں سننا چاہتا۔ اس کے لیے وہی حق ہے جو محسوس ہوتا ہے۔ جو محسوسات اور مادہ سے بالاتر ہے اور جو چیز اس کے مشاہدے اور تجربہ گاہ کی گرفت میں نہیں آتیں وہ اس کو نہیں مانتا۔

(۳) انسان کا اپنے آپ کو غیر مسئول سمجھنا: خسران کی تیسری وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسری مخلوقات کی طرح آزاد اور خود مختار اور غیر مسئول سمجھنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنے کاموں کا کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ وہ اپنے قوانین کو بنانے، لوگوں کے حقوق متعین کرنے اور معاملات کو طے کرنے میں بالکل آزاد اور خود مختار ہے:

وَقَالُوْا مَاهِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ، وَمَالَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ، اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ O......یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔(الجاثیہ 45 : 24)

فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌO ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا، ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ O ......پھر منکرین کہنے لگے "یہ تو عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟) یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے۔(ق/۲)

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ O اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ O...... بعید بالکل بعید ہے، یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے ۔ زندگی کچھ نہیں ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے اور ہم ہرگز اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ (المومنون/۳۶-۳۷)

انسان کی یہ فکر اس کو اشرف المخلوقات کے بلند مقام سے گرا کر جانوروں کی سطح پر لے آتی ہے بلکہ اس سے بھی نیچے گرا دیتی ہے۔ (التین 5) پھر اس کی زندگی کا مقصد سوائے اچھا کھانے اور ہوائے نفس کی تکمیل کے کچھ اور نہیں ہوتا۔

(۴) انسان کا خواہشات کا بندہ ہو جانا: خسران کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات کا بندہ بن جاتا ہے۔ دنیا کو وہ عیش کدہ سمجھتا ہے اور عیش وعشرت کا حصول ہی اس کا مقصد زندگی قرار پایا ہے۔ اس کے لئے وہ کوئی خارجی اخلاقی پابندیوں اور حدود کو تسلیم نہیں کرتا۔ کسی ایسے حلال اور حرام کے قانون کو نہیں مانتا جو اس کی آزادی اور خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ الا یہ کہ کسی ہیئت اجتماعیہ نے اس پر کوئی سول (Civil) پابندی عائد کی ہو۔ کیونکہ اس کو اسی سوسائٹی میں رہنا ہے جہاں اس کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ جیسے بلدیہ ،ٹرافک اور ٹیکس کے ضوابط و قانون کو تو مان لیتا ہے لیکن شراب نوشی اور زنانہ کرنے کی پابندیوں کو قبول نہیں کرتا۔

اَفَرَأيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَ خَتَمَ عَلٰى

سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً، فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ، اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ O...... پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ ۔اللہ کے بعد اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے۔(الجاثیہ /۲۳)

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ، اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًاO اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَ هُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ، اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا O...... کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔(الفرقان/۴۳-۴۴)

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَO اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنے خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔(القصص/۵۰)

(۵) انسان کا مادہ پرست ہوجانا: خسران کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ انسان مادہ پرست بن جاتا ہے۔ دنیا ومافیھا ہی اس کا مقصود بن جاتا ہے۔اور اس کے حصول میں حریص بن جاتا ہے۔ان کے علم کا مصدر ومبلغ بھی یہی ہوتا ہے۔آج دنیا کی بڑی سے بڑی تعلیم گاہوں میں جو فلسفہ،علوم عمران اور سائنس پڑھائے جاتے ہیں اس میں انسانیت ، اخلاقیات اور روحانیت اور انسان کے مقصد زندگی کا درس نہیں ہوتا۔ بلکہ ان تعلیم گاہوں میں انسان کو ایک معاشی وسماجی حیوان سمجھ کر اس کی خواہشات کی تکمیل کے لیے علوم وفنون سکھائے جاتے ہیں۔اسی وجہ سے آج ممالک آپس میں انسانوں کا سا سلوک نہیں کرتے بلکہ رنگ،نسل،علاقہ اور معاشی مفادات کی بنیاد پر آپس میں جانوروں سے بدتر سلوک کرتے ہیں۔قرآن نے اس مادہ پرست ذہنیت کی مختلف طریقوں سے مذمت کی ہے:

وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا O ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ، ......جنہیں سوائے دنیا کی زندگی کے کچھ مطلوب نہیں ہے۔ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔(النجم/۲۹-۳۰)

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ، وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ O ......لوگ دیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں۔ (الروم/ ۷)

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ O ...... یہ لوگ دنیا کی زندگی میں مگن ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔(الرعد/ ۲۶)

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ Oحَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ O......تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔(التکاثر /۱-۲)

وَاِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ O......اور انسان مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے۔......(العادیات/ ۸)

خلاصہ مضمون یہ ہے کہ قرآن کے مطابق یہ دنیا دارالامتحان ہے۔اس امتحان میں وہی لوگ فوز و فلاح سے ہمکنار ہوں گے جو ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کریں گے۔اللہ رب العزت انہیں دنیا میں بھی خلافت ارضی سے سرفراز فرمائے گا اور آخرت میں بھی وہ جنت کی بے شمار نعمتوں سے متمتع ہوں گے۔اور جو اللہ کی فرمانبرداری والی روش (اسلام) کو چھوڑ دیں گے وہ خسران سے دو چار ہونے والے ہیں۔......قرآن کے فوز و فلاح اور خسران کا تصور......دنیا اور آخرت دونوں پر حاوی ہے۔

تزکیہ نفس۔قرآنی تصور و عمل

محمد یٰسین مظہر صدیقی

تزکیہ ایک بنیادی کار رسالت اور مقصود نبوت ہے۔سورۂ بقرہ: ۱۵۱ میں اس کا واضح ذکر کلام الٰہی میں آیا ہے:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ.(البقرہ ۲/ ۱۵۱)

(اسی طرح) جیسے ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول تمہیں میں سے بھیجا۔ جو تمہارے روبرو ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں اس کی تعلیم دیتا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے۔

حافظ ابن کثیر دمشقیؒ نے دوسرے مفسرین و شارحین کی ماخذ آیت کریمہ کی تفسیر و تشریح میں اللہ تعالیٰ کے بعثت محمدی کے انعام کو بیان کیا ہے۔ رسول اکرم حضرت محمد ﷺ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کی تلاوت فرماتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔ تزکیہ کی تشریح یہ ہے کہ ان کو رذائلِ اخلاق سے پاک کرتے اور نفوس (انسانی) کی گندگی دور کرتے اور جاہلیت کے کاموں سے محفوظ کرتے، تاریکیوں سے نکالتے، ان کو کتاب یعنی قرآن کریم سکھاتے، حکمت یعنی سنت کی تعلیم دیتے اور ان کو جاہلیت سے محفوظ کر کے صاحب علم بناتے ہیں۔ آیت کریمہ کا آخری جملہ تعلیم نبوی کی ایک خاص جہت واضح کرتا ہے کہ آپ ﷺ تم کو وہ علوم سکھاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔ ان تمام بنیادی مقاصد نبوت اور کارہائے رسالت (۱) میں تزکیہ ایک ہے مگر وہ اپنے خاص مفہوم کی ہمہ گیری کے سبب بہت وسیع ہے۔

حافظ موصوف کے علاوہ دوسرے مفسرین اور شارحین نے مذکورہ آیت کریمہ یا دوسری آیات تزکیہ کی تفسیر میں صرف عموم پر نظر رکھی ہے(۲) جیسے حکمت کو صرف سنت تک محدود کر دیا ہے حالانکہ حکمت قرآنی آیات اور ان کے نظام ربانی میں ملکہ تامہ کا وسیع تر مفہوم رکھتی ہے(۳) تمام تشریحاتِ مفسرین کو تمام آیاتِ تعلیم و تزکیہ کے وسیع ترین مناظر اور ہمہ گیر پیش منظر میں پڑھنے اور تجزیہ کرنے سے صحیح معانی کا ادراک ہوتا ہے۔ حافظ موصوف نے اپنی تفسیر میں صرف ایک اور آیت کریمہ:"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْن " (آل عمران:۱۶۴) نقل کی ہے۔انہوں نے بہر حال رسالت محمدی کی برکت اور نبوت احمدی کی میمنت کے نتیجہ میں صحابہ کرام کے انقلاب حال کو خوب بیان کیا ہے، وہ جاہلیت کی سفاہت و بے علمی سے ترقی کر کے اولیاء کے حال اور علماء کے مقام تک جا پہونچے اور لوگوں میں علم کے لحاظ سے سب سے عمیق، دلوں کے اعتبار سے پاکیزہ ترین، تکلف (بناوٹ) میں سب سے قلیل اور لہجہ کے لحاظ سے صادق ترین بن گئے:"فانتقلوا ببركة رسالته و يمن سفارته إلى حال الاولياء، و سجايا العلماء، فصاروا اعمق الناس علما، و ابرهم قلوبا، و اقلهم تكلفا، و اصدقهم لهجة ......"(۴)۔

آیات تزکیہ کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کار نبوت تمام انبیاء کرام کا طرۂ رسالت رہا تھا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرۂ امتیاز خاص تھا کہ وہ دعائے ابراہیم علیہ السلام میں بھی شامل تھا۔ (سورۂ بقرہ:۱۲۹) میں اس کا ذکر ہے اس سے قبل کی آیت کریمہ:۱۲۸ میں تعمیر کعبہ میں حضرات ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کی شراکت اور دعا کا خاص بیان ملتا ہے۔ اس سے اور نظام آیات قرآنی کے مجموعی تناظر سے واضح ہوتا ہے کہ دوسری دعاؤں کے علاوہ ذریت میں ایک رسول کی بعثت کی دعا بھی ان دونوں جلیل القدر کی مشترکہ دعا تھی:" رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ "عام خیالِ مفسرین اور مشہور تعبیرِ شارحین اسے صرف"دعوۃ ابراہیم" علیہ السلام قرار دیتی ہیں جیسا کہ حافظ ابن کثیر وغیرہ نے کیا ہے بلاشبہ وہ اصلاً دعائے ابراہیمی تھی اور حدیث صحیح بھی اسی کی تصدیق کرتی ہے جیسے کہ وہ آپ ﷺ کو بشارت عیسی علیہ السلام بتاتی ہے لیکن تمام آیات قرآنی اور ان کی تفسیروں اور تمام تر

احادیث نبوی اور ان کی تشریحوں کا تجزیہ کیا جائے تو وہ وسیع ترین ثابت ہوتی ہیں۔ تمام انبیائے کرام نے اپنے پروردگار رب العزت سے عہد کیا تھا کہ اپنے معاصر رسولوں کی تصدیق اور آنے والوں کی بشارت دیا کریں گے۔ انہوں نے اپنے وعدے وفا کیے اور سب کے سب نے اپنے جانشینوں کی بشارت دی جن میں رسول آخر الزماں ﷺ کی بشارت خاص تھی۔ نظام قرآن کے اعتبار سے سورۂ بقرہ: ۱۲۸ میں دونوں معماران کعبہ علیہما السلام کی دعا میں یہ التجا بھی شامل ہے کہ ہم دونوں کو اے ہمارے پروردگار اپنا مسلم بنا اور ہماری ذریت سے ایک مسلم امت برپا کر اور ہمارے مناسک ہم کو سکھا دے اور ہم پر توجہ عالی فرما: ''رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَکَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّکَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ''۔اسی کے معابعد دعائے ابراہیمی واسمٰعیلی علیہما السلام کا بقیہ حصہ آتا ہے کہ ہمارے رب! ان میں ایک رسول مبعوث فرما......۔حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ اور بعض دوسرے محققین نے یہ حقیقت کبریٰ پالی تھی کہ وہ دین حنفی ابراہیمی اسماعیلی کا احیاء اور ذریت براہیمی و اسمٰعیلی میں رسول اکرم ﷺ کی بعثت کی دونوں کی مشترکہ دعا تھی اور تعمیر کعبہ اور احیاء حج میں بھی وہ جاری ساری تھی اسماعیلی ذریت براہیمی اور حنفیت براہیمی و اسماعیلی کی وضاحت خانہ کعبہ کے خاص حوالے سے مزید واضح ہوجاتی ہے اور وہ یہ حقیقت بھی اجاگر وروشن کردیتی ہے کہ اس رسول مبعوث ﷺ کا نسلی تعلق ذریت ابراہیمی کی اسماعیلی شاخ سے ہوگا۔(۵)

خاص تزکیہ کو ایک خاص کار رسالت بنانے کی متعدد دوسری آیات کریمہ ہیں:

''لَقَدْ مَنَّ اللّهُ عَلَى الْمُؤمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُواْ مِن قَبْلُ لَفِي ضَلالٍ مُّبِينٍ ''۔(سورہ آل عمران:۱۶۴)

درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا جو اُس کی آیات انہیں سناتا ہے، اُن کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

''هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ''۔ (جمعہ:۲)

وہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسول خود اُنہی میں سے اٹھایا، جو اُنہیں اُس کی آیات سناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالاں کہ اِس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

نکتہ دانِ کلام الٰہی نے نظم قرآنی کی ایک خاص بلاغت کا سراغ لگایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مختلف آیات کریمہ میں تصریف قرآنی کے قاعدے سے کارہائے رسالت اور مقاصد بعثت کی ترتیب اپنی خاص حکمتوں سے تبدیل کی ہے:

- سورہ بقرہ:۱۵۱، میں تلاوت آیات کے بعد تزکیہ کا ذکر ہے۔
- سورہ بقرہ:۱۲۹، میں تعلیم کتاب وحکمت کے بعد تزکیہ کو بیان فرمایا ہے۔
- سورہ آل عمران:۱۶۴، اور سورہ جمعہ:۲ دونوں میں تلاوت آیات کے بعد تزکیہ لایا گیا ہے۔

بیشتر آیات کریمہ میں بلکہ مذکورہ بالا تمام ہی آیاتِ کریمہ میں تلاوت قرآن کے بعد ہی تزکیہ لایا گیا ہے اور وہ یہ بتاتا ہے کہ تلاوت آیات کریمہ تزکیہ کا اولین اور کارگر ترین نسخہ ہے۔ بلاشبہ کلام الٰہی کی ایک عظیم تاثیر ہے اور وہ دوسرے کاموں کے علاوہ تزکیہ کا کام بھی کرتی ہے۔ (۶) تلاوت کلامِ الٰہی اور خاص زبانِ نبوی سے ہو تو اس کی تاثیر کا عالم کیا ہو گیا۔ آواز کی لہروں سے سماعت کے پردوں سے ٹکرا کر جب کلام الٰہی اپنے الفاظ و معانی کے ساتھ اندرون میں اترتے تھے تو سامعین کے قلوب بدل جاتے، چہرے رنگ بدلتے اور جسم وروح میں وہ ہلچل پیدا ہوتی جو تصدیق قلبی کے ساتھ تطہیر نفس کرتی تھی۔ (۷)۔

ان تمام آیات تزکیہ میں نفس کا لاحقہ شامل نہیں ہے جیسا کہ متعدد دوسری آیات کریمہ میں ہے اور ان کا ذکر آتا ہے نظم قرآنی اور بلاغت ربانی کے ساتھ حکمت الٰہی یہ بتاتی ہے کہ یہ عام تزکیہ کا ذکراذکار ہے جسے جامع تزکیہ کہا جاسکتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا کار تزکیہ جامع ترین تھا اور وہ تمام انبیائے کرام کے تزکیہ اور اس کے تجارب کا آخر عطری مجموعہ

ہے۔ بعض شارحین قرآن کریم نے اور خاص کر ان کے محققین و مفکرین نے خوب نکتہ نکالا ہے کہ جسمانی تطہیر بغیر روحانی تزکیہ کب ممکن نہیں (۸) بلکہ ظاہری طہارت روح و نفس کی طہارت تک لے جاتی ہے اور اندرون کا تزکیہ بیرون پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ جسم و بدن، قالب وظاہر اور بیرون و مادہ نجاستِ محض یا نجس خالص نہیں ہیں۔ انسان جسم و روح اور نفس و قالب کا پیکر ہے اور دونوں کا تعلق وارتباط لازمی ہے لہٰذا دونوں کا تزکیہ بھی ضروری ہے (۹)۔ قرآن مجید کے ''نفس'' حدیث وطریقت کے ''نسمہ'' اور عام زبان و بیان کے ''قلب'' کا ارتباط موضوع بحث رہا ہے اور آج بھی ہے۔ (۱۰)

قرآنی تزکیہ میں اور خاص نبوی کارِ تطہیر میں نفس و بدن کی ثنویت اور دوئی نہیں پائی جاتی جو اہل طریقت نے پیدا کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی تطہیر اور ظاہری تزکیہ روحانی طہارت اور بالیدگی اور نفس کی پاکی و تزکیہ کا اولین زینہ ہے اور وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جسم و بدن اور قالب اور اس کے تمام تر تقاضے نفس کے تزکیہ اور روحانی پاکیزگی اور بالیدگی میں کسی طرح رکاوٹ نہیں ہیں، قرآن و حدیث اور کتاب و سنت اور تمام دوسرے منابع تزکیہ و تطہیر ثابت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی اول اول جسمانی تطہیر کی گئی، بچپن میں شق صدر کے عظیم معجزہ میں اسی جسمانی تطہیر اور نفس محمدی کی پاکی و تزکیہ کا ایک خاص تکوینی طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ سینہ مبارک چاک کر کے قلب طاہر کو آب زمزم سے دھو کر مطہر بنایا گیا اور ظاہری پارۂ گوشت سے خون کی وہ پھٹکی نکال پھینکی گئی جو صرف شیطان کا حصہ تھی اور جسمانی طہارت و تزکیہ کے بعد سینہ مبارک سل دیا گیا اور سلائی کے نشانات خیاط کی سوئی دھاگے کے مانند نظر آتے تھے (۱۱)۔ دوسرے جسمانی اور ظاہری اسباب طہارت و تزکیہ میں خاص توفیق الٰہی کا انتظام کیا گیا کہ ساری زندگی مراسم شرک کے شائبے سے محفوظ رہے۔ بعد نبوت اور اس کے قبل بھی انسان کے ساتھ لگا ہوا مستقل شیطان آپ ﷺ کے تابع ہو گیا اور صرف خیر کی طرف رہنمائی کرتا تھا (۱۲)۔

نفس انسانی اور اس کے تزکیہ کی آیات کریمہ ایک دوسری جہت طہارت و تزکیہ کو واضح و بیان کرتی ہیں، خالص نفس سے متعلق آیات کریمہ میں سے بیشتر انسان کے جسم و

جان اور ظاہر و باطن دونوں کو مراد لیتی ہیں اور حقائق بیان کرتی ہیں۔
جیسے: سورہ بقرہ: ۱۲۳، ۲۳۳، ۲۸۱: ''وَاتَّقُوا يَوْماً لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئاً وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ''، وَ لَاتُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا / ثُمَّ تَوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ ..... ''وغیرہ۔ سورہ آل عمران: ۲۵، ۳۰، ۱۴۵، ۱۶۱، ۱۸۵، سورہ نساء، مائدہ، انعام، اعراف، یونس، ہود، رعد، ابراہیم، نحل، اسراء وغیرہ کی بہت سی آیات کریمہ اسی قبیل کی ہیں۔

دوسری آیات کریمہ وہ ہیں جو جسم انسانی کے اندرون میں واقع نفس اور اس کی کارگذاری دکھاتی ہیں جیسے سورۂ یوسف: ۵۳: ''وَمَا أُبَرِّءُ نَفْسِىْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىَ''۔ یا اسی سورہ کی دوسری آیت: ۶۸۔
سورہ قیامہ: ۲: ''وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ''، سورہ فجر: ۲۷: ''يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ . ارْجِعِىْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً''۔
سورہ نازعات: ۴۰: ''وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى'' اور سب سے زیادہ سورہ شمس: ۷: ''وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا. فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا'' وغیرہ (۱۳)

اول الذکر زمرۂ آیاتِ نفس میں مراد جسم و روح پر مبنی کل انسان ہے اور اسی وجہ سے اس کے حقائق آئے ہیں جیسے ایک نفس سے نوع انسانی کی تخلیق، انسانی ظاہر و باطن کی بساط بھر تکلیف شرعی، وقت مقررہ پر ہر نفس کی موت، نفس انسانی کی بعد الموت بعثت، اس کے تمام اعمال کے پشتارہ کی روز حساب پیشی، زندگی مستعار میں قتلِ نفس اور اس کی دیت و قصاص کے احکام، ہر نفس کی اپنی ذمہ داری، ہر نفس کو خشیت الٰہی اور تقویٰ کی نصیحت اور احکام الٰہی کی پیروی وغیرہ۔ مؤخر الذکر آیات نفس کے دروبست سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں وہ اندرونی نفس مراد ہے جو ظاہری قالب کے اندر موجود ہوتا ہے اس کی تین معروف اقسام بیان کی گئی ہیں: نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ، یہ تینوں مختلف اوقات میں اپنی کارگذاری دکھاتی ہیں اور ہر نفسِ اندرونی میں ہوتی ہیں، امارہ میں فجور کا ہجوم ہوتا ہے، لوامہ میں تقویٰ کا اور مطمئنہ میں خشیت و اتباع کے نتیجہ میں انعام الٰہی کا (۱۴)۔

تزکیۂ نفس سے اول الذکر عمومی طور سے اور ثانی الذکر خصوصی طور سے مراد لی جاتی ہیں جیسا کہ آیات کریمہ بیان کرتی ہیں۔ سورہ شمس: ۷، میں اسی نفس اندرونی میں فجور (گناہ وشر) اور تقویٰ (خیر وخشیت) ودیعت کی گئی ہے پس جو جو شخص اپنے فجور پر قابو پالیتا ہے اور نفس کو ہوائے نفس سے بچالیتا ہے وہ دنیا میں سعادت اور آخرت میں جنت پالیتا ہے۔ جو شخص اپنے نفس کے فجور کو اپنے اوپر حاکم بنالیتا ہے اور اس کی تابعداری کرتا ہے وہ دونوں جہانوں کی شقاوتوں کا مورد بن جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ان دونوں کو قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ سے تعبیر کرکے ان پر بہت عمدہ اور محققانہ بحث کی ہے جو کتاب وسنت سے مستند ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اسی کو تسویہ نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی تخلیق مستقیم مراد ہے کہ اس نے نفس انسانی میں دونوں قوتیں ضرور رکھی ہیں مگر اس کو ان کی کارگذاریوں سے بھی آگاہ کردیا ہے اور اصلاً وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے سیدھی فطرت (فطرۃ قومیہ) پر پیدا کیا گیا ہے۔ اسی کو دوسری آیت کریمہ میں فطرت اللہ پر تمام انسانوں کو پیدا کرنے سے تعبیر کیا ہے اور وہ ایسی فطرۃ اللہ جس کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں آتی: ''فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ'' سورہ روم: ۳۰، حدیث صحیح میں اسی کی دوسری تعبیر وتشریح یوں آئی ہے: ''کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ اوینصرانہ او یمجسانہ......'' حافظ ابن حجر اور ابن کثیر وغیرہ نے ان پر بحث کی ہے۔ (۱۵)

نفس کے تزکیہ کی وضاحت سورۂ شمس کی اگلی آیت کریمہ: ۹-۱۰ میں آئی ہے: ''قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا-وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا'' جس نے اپنے نفس کو پاک بنایا اور اس کا تزکیہ کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گناہ وشر اور فجور سے گندا کردیا وہ ناکام رہا۔ حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ نے ان دونوں بلکہ چاروں آیات کریمہ کی تشریح کی ہے اور اس میں مختلف دوسری آیات کریمہ کے علاوہ مختلف احادیث نبویہ کا ذکر کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق دنی اور رذائل سے ملوث کرنا نفس کو گندا کرنا ہے اور ان سے بچاکر فضائلِ اخلاق سے آراستہ کرنا اس کا تزکیہ ہے، اسی کو تطہیر نفس بھی کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ: ۱۰۳ میں ایک خاص تناظر میں فرمایا گیا ہے۔ اس پر بحث آگے ایک دوسرے معنی ومضمون

کے حوالہ سے آتی ہے۔قلوب انسانی کی تطہیر کا پیرایہ اسی تزکیہ نفس کے لئے مختلف آیات کریمہ میں اختیار کیا گیا ہے۔(مائدہ:۴۱،احزاب:۳۳،۵۳، نیز بقرہ:۲۳۲ وغیرہ۔تزکیہ نفس کے مخالف تلویثِ نفس ہے اور اس کا سبب ہوائے نفس کی پیروی بتایا گیا ہے جیسا اوپر سورہ نازعات:۴۰ میں آیا ہے۔اسی ہوائے نفس سے انکار واستکبار اور دوسرے رذائل آتے ہیں:بقرہ:۸۷،مائدہ:۷۰،نجم۲۳،نساء:۱۳۵وغیرہ۔

اسی ہوائے نفس سے نطق نبوی کی محفوظیت اور کلام الٰہی کی طہارت کا ذکر سورہ نجم:۳ میں کیا گیا ہے:''وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى – إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ''رسول اکرم ﷺ اور آپ کے واسطے سے تمام امت مسلمہ اور دوسرے انسانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کے درمیان حق وانصاف سے فیصلہ کریں اور اپنی ہوائے نفس کی پیروی نہ کریں کہ وہ سبیل اللہ سے بھٹکا دیتی ہے: سورہ ص:۲۶،سورہ نساء: ۱۳۵، میں ہوائے نفس کو عدل و انصاف کی راہ کا روڑا اقرار دیا گیا ہے اور اس سے اجتناب کی سخت تاکید کی گئی ہے یہ ہوائے نفس صرف فجور نفس یا خواہشِ نفس کی حکمرانی اور سلطانی ہے جو نفس کو حق کے جادہ سے ہٹا کر گمراہی پر ڈال دیتی ہے۔(۱۷)۔

تزکیہ نفس بھی دراصل فضل الٰہی اور رحمت ربانی ہے اور اسی کے سبب ہر شخص کا نفس پاکیزہ بنتا ہے جیسا کہ سورہ نور:۲۱، میں ہے،لیکن اس کے ساتھ وہ فضل الٰہی اور رحمت ربانی انسانی طلب وکاوش کے اسباب سے بھی باندھ دیا گیا ہے۔تزکیہ نفس کی رحمت وفضل الٰہی سے وابستگی بلکہ عطائے کلی کی آیات کریمہ:نساء:۴۹،نور:۲۱،وغیرہ کا مطالعہ اسی تناظر میں کرنا ضروری ہے اور ان کے ساتھ خود انسان کی اپنی طہارت وتزکیہ کا زعم وغیرہ بھی سامنے رکھنا لازمی ہے کہ تمام انسانی کاوشیں اور اسباب تزکیہ بیکار ہیں جب تک فضل الٰہی شامل نہ ہو لہٰذا اپنے نفس کی طہارت وتزکیہ کا دعویٰ ہرگز نہ کرو۔سورہ نجم:۳۲ میں ہے:'' فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى ''اور سورہ نساء:۴۹ میں ایسے تزکیہ نفوس کے دعویداروں کی پول کھولی گئی ہے اور حقیقت بیان کی گئی ہے:''أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ''اردو شعر میں اس دعوئے تزکیہ کا خاکہ اڑایا گیا ہے:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

تزکیہ وطہارت نفس کا دعویٰ دراصل ایک اور غلط رجحان کی طرف لے جاتا ہے اور وہ ہے فخر وناز اور عجب وکبر جو رذائل قبیحہ ہیں، ان میں تعدیہ پایا جاتا ہے کہ انسان صرف اپنے ہی کو پاک ومنزہ نہیں سمجھتا بلکہ دوسروں کو غیر منزہ اور غیر مزکیٰ جانتا اور قرار دیتا ہے۔ اس سے تحقیر وتذلیل کا رویہ پیدا ہوتا ہے جو تمام دعوے دارانِ تزکیہ کے ہاں انفرادی، مسلکی اور طبقاتی طور سے پایا جاتا ہے۔(۱۸)۔

حصولِ تزکیہ نفس کے اعمال:

جامع تزکیۂ نفس کا قرآنی نسخہ صرف دو لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے: ایمان خالص اور عمل صالح۔ ایمان کے بنا کوئی عمل صالح جناب الٰہی میں مقبول نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ایمان وعقیدۂ خالص کے بغیر عمل غیر اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق ''مرضاتِ رب'' کی چاہت ہی سے عمل صالح بنتا ہے اور وہ ایمان خالص کے عقیدہ سے پوری طرح مربوط، ہے سورۂ عصر میں انسان کو خسارے سے بچانے کے لئے ایمان اور عمل صالح کے نسخے تجویز کردیے گئے ہیں اور عمل صالح کا کلیہ بتایا گیا ہے۔ وہ ہے حق اور صبر کی ایک دوسرے کو وصیت و پاسداری کرنے کا۔ دوسری ایات کریمہ میں عمل صالح کی مزید تفصیلات ملتی ہیں اور ان کا مختصر ذکر بھی طولانی ہے۔ لہٰذا صرف ان آیات کریمہ کا خاص مختصر حوالہ دیا جارہا ہے جن میں تزکیہ وطہارت کا ذکر آیا ہے۔ وہ بھی بہت ہیں۔ صرف منتخب عناوین کے تحت ان کا ایک اشاریہ پیش کردیا جاتا ہے۔

کتاب الٰہی سے وابستگی:

گذشتہ آیات کریمہ میں بیان آچکا ہے کہ تلاوت قرآن کریم کار رسالت بھی تھا اور نسخۂ تزکیہ بھی۔ اسی وجہ سے رسول اکرم ﷺ کو ایک نابینا صحابی کو نصیحت وتذکیر کی طرف متوجہ کیا گیا کہ وہ شاید تزکیہ پاتے، سورۂ عبس: ۳، یہ خالص عملی تزکیہ بھی ہے، تلاوت نماز میں ہو تو دو آتشہ اور نماز کے باہر ہو تو آتشہ خالص، فہم کے ساتھ ہو تو سہ آتشہ اور جسم و جان

کی طہارت کا باعث، حفظ آیات کریمہ یا قرآن مجید کو یاد کرنا بھی تزکیہ نفس ظاہر و باہر کا باعث ہے۔ وہ زبان ظاہر کے ساتھ نفس ناطقہ میں پیوست ہو جاتی ہے، اصلاً کتاب الٰہی کی تلاوت و حفظ ذکر الٰہی کی عظیم ترین اور جامع ترین صورت ہے اور ذکر الٰہی سے اطمینان قلب ملتا ہے جو تزکیہ کا انعام ہے قرآن مجید کو اسی باعث ذکر قرار دیا گیا: آل عمران: ۵۸: ''ذَلِکَ نَتْلُوهُ عَلَيْکَ مِنَ الآيَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِيمِ'' اعراف: ۶۳، یوسف: ۱۰۴، وغیرہ ذکر الٰہی کی دوسری صورتوں میں لسانی ذکر اور قلبی ذکر دونوں شامل ہیں اور متعدد آیات کریمہ میں صبح و شام اور ہر وقت ذکر الٰہی کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کریمہ میں سے متعدد میں ایسے اذکار و تسبیحات اور ادعیہ (دعاؤں) کا ایک جہان تزکیہ موجود ہے۔ قرآن مجید میں انبیاء کرام کے قصے اسی ذکر الٰہی کی ایک صورت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر کر کے ان کی افادیت تزکیہ کو اجاگر کیا ہے؟ رسول اکرم ﷺ پر درود و سلام بھی بھیجنا دراصل ذکر الٰہی کی ایک خاص الخاص صورت ہے کہ درود و صلوٰۃ و سلام بھیجنے والا اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کا ہم زبان ہو جاتا ہے یہ ہم زبانی اسے تلاوت قرآن میں بھی ملتی ہے اور اسی سے تزکیہ ظاہر و باطن نصیب ہوتا ہے۔ (۲۰)۔

نماز (صلوٰۃ):

ذکر الٰہی کی جامع ترین صورت نماز (صلوٰۃ) ہے جو خاص اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو سکھائی اور اس کی تاکید کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم الٰہی ہوا کہ صرف میری عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو: ''فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي''۔ طٰہٰ: ۱۴۔ اور یہ صرف ایک رسول مکرم علیہ السلام کا معاملہ نہ تھا بلکہ تمام انبیائے کرام کو ذکر الٰہی کی اس خاص صورت کی پاسداری کا عام حکم تھا۔ سورہ شمس کی مذکورہ آیات کریمہ کے علاوہ خاص سورہ اعلیٰ کی ایات کریمہ: ۱۵=۱۶ تزکیہ صلوٰۃ سے وابستہ کرتی ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى- وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى. ان آیات کریمہ میں تزکیہ کو ذکر نام الٰہی سے جوڑا گیا جو عام ہے اور اس کی خاص صورت نماز و صلوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ وہی نماز تو ہے جو نمازی کو بیہودہ چیزوں اور ناپسندیدہ اعمال سے محفوظ کرتی ہیں اور

وہی تو تزکیہ نفس وجان وظاہر کی دوسری منفی صورت ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَر ۔یہ رذائل اخلاق سے بچانے کا ایک کارگر نسخہ ہے اور اسی کے سبب تزکیہ جسم وجاں ملتا ہے۔(۲۱)۔

زکوٰۃ وانفاق:

تزکیہ ظاہر وباطن کا دوسرا عمل ہے۔عبادات میں صلوٰۃ ونماز کے ساتھ زکوٰۃ وصدقہ لازم وملزوم بن کے آتے ہیں: سورہ لیل:۱۸: اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ۔میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ نہ صرف جسم و مال کو زکوٰۃ دینے سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے بلکہ نفس کو تزکیہ کی دولت ملتی ہے۔نماز وصلوٰۃ کی طرح بلکہ تمام دوسری عبادات کی طرح زکوٰۃ وصدقات اور انفاق سے دوطرح کے انعامات ملتے ہیں: مثبت طور سے خیرات وحسنات کرنے اور مرضات رب حاصل کرنے کا انعام تزکیہ نفس و مال کی صورت میں ملتا ہے اور منفی طور سے بخل، کنجوسی، دنائت وحرص وہوس اور ان جیسی دوسری برائیوں یا رذائل سے بھی انسان کو تحفظ ملتا ہے۔

پھر زکوٰۃ وصدقہ اور انفاق کا ایک انفرادی تزکیہ ہے جو صاحب مال کو خرچ کر کے ملتا ہے اور دوسرا اجتماعی ومعاشرتی کہ اس مال زکوٰۃ وصدقات سے امت اسلامی کے طبقات کی کفالت ہوتی ہے اور وہ اجتماعی تزکیہ کی طرف لے جاتی ہے۔اسی کو صبر وحق کی تواصی بھی کہا گیا ہے۔

صوم (روزہ):

صیام خواہ فرض ہوں یا مسنون ومندوب کا بنیادی مقصد تو انسان اور روزہ دار کی اطاعت الٰہی ہے اور ان کا نتیجہ تقویٰ اور طہارت کا حصول ہے۔یہی تقویٰ اور خشیت الٰہی اور طہارت و پاکیزگی کا حصول تو تزکیہ نفس ہے۔سورہ بقرہ:۱۸۳: میں ارشاد الٰہی ہے: ''یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِن قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُونَ ''۔اسی تقویٰ وخشیت کے حصول جامع کے لئے رسول اکرم ﷺ باوجود اپنی نفسی طہارت وتزکیہ کے کثرت سے نفل روزے رکھا کرتے تھے روزہ وصوم کا نسخہ خواہشات نفس کو روکنے اور پامال کرنے کا ایک کارگر نسخہ تھا لہٰذا آپ ﷺ نے کنواروں کو جو شادی

کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں کثرت سے روزے رکھنے کا حکم دیا تھا۔کیونکہ وہ جنسی خواہش یا بوالہوسی کو کچل کر تزکیہ نفس کرتا ہے۔قرآن مجید نے مختلف جنایات (گناہوں اور انحرافوں) کا کفارہ بھی روزہ کو اسی سبب سے قرار دیا ہے کہ وہ ان کے اثر بد کو دور کر دیتا ہے۔

سورہ بقرہ:۱۹۶:''فَصِيَامُ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ''،سورہ نساء:۹۲:''فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ''سورہ مائدہ:۸۹''فَصِيَامُ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ''وغیرہ(۲۳)۔

حج وعمرہ وطواف بیت اللہ:

عبادات میں بیت اللہ الحرام سے متعلق تمام مناسک ذکر الٰہی کی عاشقانہ صورتیں ہیں اور جامع وکامل ترین بھی۔ان میں سالانہ حج یا زندگی بھر میں صرف ایک بار،استطاعت وفراغت کے حال میں عمرہ اور بیت اللہ کے لئے جانا نہ اور طواف اہم ترین ہیں قرآنی آیات کریمہ اور احادیث نبویہ کے مطابق حج وعمرہ اللہ تعالیٰ کے لئے پورا کرنے اور اس میں تقویٰ کا زادراہ لے جانے اور فسوق وجدال اور گناہ سے احتراز کرنے کا حکم ہے اور طواف بیت اللہ کی فضلیت واجر کا بھی بیان ہے۔ان تمام مناسک کی ادائی سے تقویٰ ملتا ہے اور وہ تزکیہ جسم وجاں اور تطہیر قلب ونفس کا باعث بنتا ہے اسی لئے حدیث صحیح کے مطابق حج کے بعد ایک حاجی نامولود بچے کی طرح معصوم ہوجاتا ہے حج وعمرہ میں جانی اور مالی دونوں عبادتوں کے سبب تزکیہ نفس کا امکان زیادہ ہے اور تمام دوسری عبادات کی وجہ سے بھی تزکیہ بڑھ جاتا ہے تمام ارکان اسلام اور فرائض کا مقصود تقرب الٰہی کا حصول ہے اور اسی سے تزکیہ نفس وجاں نصیب ہوتا ہے جیسا کہ آیات واحادیث میں ہے(۲۴)۔

فرائض ونوافل سے تقرب الٰہی:

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے متعدد کتب ومباحث میں فرائض کے ذریعہ تقرب اور نوافل کے واسطہ سے تقرب کے حصول پر محققانہ بحث کی ہے اور قرآن وحدیث سے اس کو مستند ومدلل کیا ہے۔اس میں طریقت واحسان کے حقائق بھی ہیں۔ان کی بحث کا اصل نکتہ یہ ہے کہ تقرب بالفرائض کا جو درجہ ومقام ہے وہ تقرب بالنوافل کا

نہیں ہے کہ مؤخر الذکر لازمی نہیں ہے۔

فرائض و واجبات میں اتباع امرالٰہی کا عنصر ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ آیات و احادیث اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ (۲۵)۔ سورہ توبہ:۹۹ میں صدقات خاص کر زکوٰۃ کو تقرب الٰہی کے حصول کی خاطر ادا کرنے کو ''قربت'' سے تعبیر کیا گیا ہے جو رحمت الٰہی کا باعث ہے ''أَلا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ...... وَيَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللَّهِ''، یہ صرف ایک مثال ہے۔ حضرت شاہؒ نے متعدد کتب میں اس موضوع پر کلام کیا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ اور ہمعات وغیرہ میں زیادہ زور قرآنی ایات و احادیث نبوی کی تشریحات پر ہے۔ الخیر الکثیر وغیرہ میں صوفیانہ اور عارفانہ رنگ کی بحث کی ہے اور وہ فلسفیانہ بھی بن گیا ہے۔ مثلاً الخیر الکثیر میں قرب فرائض و قرب نوافل کے علاوہ ایک اور قسم قرب وجود کا ذکر بھی کیا ہے۔ عارفانہ بحث و مباحثہ کے بعد بہر حال وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''ان تینوں اقسام میں فضیلت کلیہ قرب فرائض کو حاصل ہے۔ یہ خصوصاً مقام نبوت اس کا منتہائے کمال ہے۔'' پھر اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

گناہوں سے احتراز:

جس طرح احکام و اوامر الٰہی تزکیہ ظاہر و باطن کے لئے ضروری ہیں، اسی طرح نواہی و ممنوعات بھی لازمی ہیں۔ اصلاً اوامر اور نواہی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں: ایک مثبت ہے جو فضائل اخلاق سے آراستہ کرتے ہیں اور دوسرے منفی جو رذائل اخلاق سے بچاتے ہیں اور فضائل سے پیراستہ کرنے کا باعث بنتے ہیں اسی لئے ان دونوں کا حکم لازم و ملزوم کی طرح قرآن میں آتا ہے۔ گناہ (مآثم) اور نواہی دراصل ظاہر نفس کے تزکیہ کے لئے تجویز کیے گئے ہیں اور اس ظاہری تزکیہ سے تزکیہ باطن ملتا ہے احکام اور نواہی دونوں کا تعلق صرف عبادات سے نہیں ہے بلکہ معاملات سے ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ معاملات سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ گناہوں کا بلاشبہ تعلق و رشتہ قلب و نفس کی خباثت و گندگی سے ہے کہ فکری اور نفسانی لحاظ سے ان کی ترغیب کی لہر ادھر ہی سے اٹھتی ہے، اس لئے قرآن مجید میں متعدد نفسی بیماریوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ نفس و باطن کی گندگی یا فجور کے عناصر ہوتے

ہیں ظن وتخمین حسد اور جلن اور اسی طرح کی بیماریاں قلب و باطن میں ہوتی ہیں اور وہ تاثیر کرتی ہیں تو اعضاء و جوارح ان کی تعمیل کرتے ہیں۔ان کی وجہ سے قرآن مجید نے قلب کو گناہ کار قرار دیا ہے:'' وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ '' بقرہ: ۲۸۳۔آیت کریمہ میں کتمان شہادت قلب کا کام بتا کر اسی کو گناہ گار قرار دیا ہے اور اس گنہگاری باطن سے ظاہری گناہ گار بھی بن جاتا ہے۔گناہ واثم پر اصرار اللہ تعالیٰ کے تقوی کی راہ میں روڑا بن جاتا ہے جو قرآنی تعبیر کے مطابق گناہ کی عزت ہے اور وہ باعث وبال ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ (بقرہ:۲۰۶)۔

قرآن مجید نے اثم و گناہ کی دو قسمیں کی ہیں: ایک ''کبائر الاثم'' ہیں جو گناہ کبیرہ کہلاتے ہیں اور دوسرے معمولی درجے کے جن کو لمم کو خوبصورت تعبیر عطا کی گئی ہے۔سورہ نجم: ۳۲ ہے:''الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم ''نیز شوریٰ:۳۷ وغیرہ۔

ظاہری مآثم یا اعضاء و جوارح کے ذریعہ سرزد ہونے والے گناہوں کا باطن و نفس پر یہ اثر ہوتا ہے کہ حدیث صحیح کے مطابق قلب پر سیاہ نقطے لگنے لگتے ہیں اور مسلسل گناہوں کے ارتکاب سے قلب پورا کا پورا سیاہ ہو جاتا ہے اور یہ قلبی سیاہی ظاہری سیاہ کاریوں سے آتی ہے۔(۲۶)۔

گناہ صغیرہ یا لمم سے بچنے کی بھی تاکید کتاب وسنت میں آئی ہے کیونکہ وہ اعضاء و جوارح کی شکست وریخت کے علاوہ قلب ونفس پر ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان سے گریز واجتناب تزکیہ نفس وظاہر لاتا ہے جیسے نگاہوں کا پست رکھنا، بدنظری سے بچانا، اسبال ازار سے بچنا وغیرہ۔بعض آیات کریمہ میں لفظ ازکیٰ استعمال کیا گیا ہے یعنی وہ تمہارے تزکیہ کے لئے بہترین ہے جیسے سورہ نور: ۳۰ میں شرمگاہ کی حفاظت کے لیے آیا ہے۔آداب معاشرت میں کسی گھر میں داخلہ کی اجازت نہ ملے اور واپس جانے کو کہا جائے تو واپس ہو جانے کو ''ازکیٰ'' قرار دیا گیا ہے: سورہ نور: ۲۸۔

شہادت حق:

ہر صاحب ایمان کے ایمان یعنی نفس کے تزکیہ کی شہادت یہ ہے کہ وہ حق کی

شہادت انفرادی اور اجتماعی طور سے دے۔ عدل و انصاف اجتماعی کی یہ سب سے بڑی کسوٹی ہے اور وہ تمام معاملات ظاہری کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس میں قول حق بھی شامل ہے جسے قرآن مجید نے قول سدید بھی کہا ہے اور قول حق بھی۔ اسے دوسری آیات کریمہ میں قول عدل بھی قرار دیا گیا ہے اور لازم کیا گیا ہے کہ ہر حال میں قول حق اور قول عدل کہا جائے گا اور اسی کو شہادت حق سے بھی تعبیر کیا گیا اور اس کو چھپانے کو گناہ بتایا گیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ میں گذر چکا ہے۔ ان آیات کریمہ میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ایمان والوں کو عدل وانصاف کا قوام بنایا گیا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے گواہ و شاہد۔ اسی کو دوسری آیت کریمہ میں تبدیل کر شہادت الٰہی کا قوام اور عدل و انصاف کا شاہد کہا گیا ہے سورہ نساء: ۱۳۵ اور سورہ مائدہ: ۸ کی آیات کریمہ میں اس لازمی و ایمانی شہادت حق اور قوامیت عدل کا انتہائی سخت مرحلہ قرار دیا گیا ہے کہ خواہ تمہارے اپنے نفوس کے خلاف ہو یا تمہارے، والدین، اعزہ و اقرباء اور بزرگوں کے خلاف جائے قول حق اور شہادت حق لازمی ہے اور اس کو برملا اور برمحل کہنا بھی ناگزیر ہے کہ مداہنت و رعائت سے آہستہ کہنا یا بےمحل کہنا حق و شہادت کا خون کرنا ہے۔ وضح بات ہے کہ جن کے قلوب و نفوس تزکیہ کی دولت سے آباد ہوں اور جن کی زبانیں صداقت سے آراستہ ان کے لئے یہ قول حق و شہادت حق بہت آسان ہے اور جن کے نفوس میں کمزوری خباثت اور گندگی ہے ان کے لئے مشکل ان آیات کریمہ میں اصولی طور سے تمام معاملات آگئے ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ وہ صرف عدالت و دربار قاضی میں شہادت حق کا معاملہ نہیں ہے جیسا کہ بعض شارحین و مفسرین نے بنا دیا ہے بلکہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام میدانوں کا احاطہ ہے۔

آیات کریمہ میں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ ......سورۂ نساء: ۱۳۵۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ......سورۂ مائدہ: ۸۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى ......انعام: ۱۵۲،

وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ......نساء: ۵۸۔

عدل اور قسط سے متعلق آیات کریمہ میں صحیح ترازو، صحیح ناپ تول وغیرہ کا واضح حکم

ہے: انعام: ۱۵۴، رحمٰن: ۹ وغیرہ۔ سورہ حدید: ۲۵، میں نزول کتاب و میزان کا مقصود ہی یہ بتایا ہے کہ لوگ عدل و انصاف کریں۔ اسی طرح عدل سے متعلق متعدد آیات ہیں جن میں ہر شخص، طبقہ اور قوم کے ساتھ عدل و انصاف کرنے کی بات کہی گئی ہے حتیٰ کہ دشمنوں کے ساتھ بھی۔ یہ ایمان کی کسوٹی بھی ہے اور تزکیہ کی میزان بھی رسول اکرم ﷺ اور امت مرحومہ عدل و انصاف برپا کرنے کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں: شوریٰ: ۱۵، مائدہ: ۸، انعام: ۱۵۲ وغیرہ۔ (۲۷)۔

تنقید و تجزیہ:

قرآن مجید میں تزکیہ کے تصور اور اس کے حصول کے اعمال کا مطالعہ سنت و سیرت سے کاٹ کر نہیں کیا جا سکتا قرآن پاک کلام الٰہی ہے تو حدیث و سنت بھی وحی الٰہی ہیں اور سیرت نبوی میں تزکیہ نفس کا تصور و عمل بطور نصاب ملتا ہے۔ اسی نفس کے تزکیہ کا نصاب نبوی خیر القرون میں روبہ عمل لایا گیا تو صحابہ کرام جیسے پاکیزہ، مزکیٰ و مطہر افراد و طبقات پیدا ہوئے ان جیسے نفوس قدسیہ بعد کے خیر القرون میں بھی نہ پروان چڑھ سکے کیونکہ وہ صحبت و تربیت نبوی کے فیضان سے بالواسطہ مستفید تھے بعد کے ادوار میں خارجی عناصر اور داخلی عوامل کے سبب تزکیہ اور خاص تزکیہ نفس کا نصاب شخصی تجربات پر مرتب ہوتا گیا۔

کتاب و سنت پر مبنی نبوی تزکیہ ہمہ جہت و ہمہ گیر ہی نہیں بلکہ فطرت انسانی کی لازمی رعایت پر استوار تھا۔ وہ ظاہر و باطن، جسم و روح، قالب و نفس، قلب و دماغ یعنی پورے انسان کی تعلیم و تربیت کر کے کلی تجزیہ و تزکیہ کرتا ہے، ظاہر یا جسم و بدن کو تزکیہ نفس و باطن کی راہ میں حائل نہیں سمجھتا بلکہ تزکیہ جسم کو تزکیہ نفس کا ایک مؤثر ذریعہ قرار دیتا ہے تمام عبادات۔ فرض و نفل۔ اعضاء و جوارح کے اسلام و بندگی کے ذریعہ باطن و قلب اور نفس کا تزکیہ کرنے کی صورتیں ہیں ایمان و اعتقاد اور ایقان و یقین کی دولت نفس سے نفس کا تزکیہ شروع ہوتا ہے اور وہ ظاہر اور بدن کے تزکیہ تک لے جاتا ہے۔

سورہ زمر: ۲۳ کی آیت کریمہ ان دونوں ظاہر و باطن کے تغافل اور ان کے تزکیہ قلوب کی انتہائی خوبصورت مثال پیش کرتی ہے" اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا

مُّتَشَابِهاً مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ"۔

اللہ نے اتاری بہتر بات، کتاب آپس میں ملتی، دہرائی ہوئی، بال کھڑے ہوتے ہیں کھال پر ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کی یاد پر...... شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں "ملتی دہرائی ہوئی" کی تشریح خوب کی ہے، خوبی میں کوئی آیت کم نہیں...... ایک مدعا کئی طرح تقریر کیا۔" شاہ ولی اللہ نے اسے "بعض او مانند دیگرست آیات دوتو" سے تعبیر کیا ہے تلاوت وسماعت وقراءت قرآن مجید کے نتیجہ میں ظاہر بدن کی جلد اور اس کے رونگٹے خشیت الٰہی سے ایمان والوں کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر جلد آیات رحمت سے نرم پڑ جاتی ہیں اور اندرون جسم قلوب اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تزکیہ ظاہر و باطن ہے۔ تمام عبادات واذکار اور ادعیہ میں یہی اثرات جسم وقلب پر مرتب ہوتے ہیں اور اس کے لیے اخلاص واحسان اور تعدیل کی شرط رکھی گئی ہے۔

تزکیہ قرآنی وحدیثی ہمہ جہت و ہمہ گیر یوں ہے کہ وہ انسانی طرز حیات کی تمام اطراف وجوانب اور جہالت کا احاطہ کرتا ہے، ایمان والوں کے جسم وقلب کو کسی ایک جگہ، مقام یا کام تک محدود نہیں کرتا۔ عبادات میں اسی وجہ سے ایک حصہ گھر اور بازار کا بھی رکھا گیا ہے اخلاق ومعاملات میں تزکیہ کا نصاب اسے مسجد، گھر، بازار، دیر وحرم اور ایسے ہی دوسرے جغرافیائی مقامات سے بالا کر کے ہر مقام پر مواد دیتا ہے وہ قول وعمل اور کارکردگی کی حدبندیوں سے بھی اسے آزاد کر کے کامل زندگی کے تمام میدانوں میں تزکیہ وطہارت کا عملی طریقہ سکھاتا ہے اس کا نصاب وعمل مومنانہ زندگی کا نصاب وعمل ہے۔ اور صرف انفرادی تزکیہ پر بس نہیں کرتا بلکہ اجتماعی وملی تزکیہ کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ افراد وطبقات سب کے سب اپنی اپنی جگہ پوری ملت اور معاشرہ اسلام کے تزکیہ کے ذمہ دار ہیں تو ملت و اجماع افراد وطبقات کے تزکیہ سے خیر امت، امت وسط اور عدل وانصاف کے شہداء و علمبردار اور اللہ رب العالمین کے گواہ وقوام پیدا ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ وہ انسان پر اس کے نفس، اہل وعیال اور دوسرے انسانوں کا حق واجب کر کے انسانی فطرت کی رعایت

کرتا ہے۔اس کا نتیجہ ہے کہ مومن کا ہر کار دنیا اخلاق سے کار دین بن جاتا ہے اور باعث اجر وثواب ہو جاتا ہے کہ وہ دین کے تقاضے اور قرآن وحدیث کے مطالبے پورا کرتا ہے۔

شخصی تجربات ونصابات تجزیہ وتزکیہ میں افراط وتفریط در آئی۔ظاہر بدن وجسم کا تزکیہ بھلا دیا گیا،صرف تزکیہ نفس یاد رہا۔اس نے شریعت اور کتاب وسنت کے ہمہ جہت تزکیہ کو ایک محدود دائرہ میں مقید کر دیا۔شخص،مرشد،خانقاہ ومقام کی قیدیں لگا دیں۔ذکر ومراقبہ اور عبادات میں مبالغہ کیا اور تشدد وافراط کی وہ راہ اپنائی جس سے رسول اکرم ﷺ نے روکا تھا اور جو انسانی فطرت کے خلاف فقر وفاقہ،زہد وتوکل،صبر وشکر اور دوسرے تمام طرق تزکیہ کے معانی و مفاہیم بدل کر رہبانیت وترک معاشرت کی غیر اسلامی روش اپنائی۔ان کی تفریط کی جہت اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ ملت کی اجتماعیت اور امت کی اجماعی کارکردگی کو ختم کر کے صرف شخصی تزکیہ کا محدود تصور دیا۔دوسری طرف خالص اصلاح پسندوں کے طبقات وداعی اپنی تفریط لے کر تزکیہ کے میدان میں آئے اور صرف فرائض وواجبات تک محدود ہو گئے،وہ کتاب وسنت کے بیان کردہ اور پسندیدہ اعمال واشغال خیر،اوراد وظائف اور دعاؤں اور دوسرے نوافل کی تخفیف کرنے لگے علماء وفقہاء اور مشائخ وصوفیہ کے ان دونوں افراط وتفریط پر مبنی نصابات تزکیہ شخصی احوال وتجربات پر مبنی ہیں اور یک رخ ہیں۔ان سے جزوی تجزیہ تو ہوتا ہے اور جزوی تزکیہ بھی مگر وہ کلی تزکیہ جسے عبادات میں احسان اور اخلاق ومعاملات میں عدل واخلاص کہا گیا ہے نہیں حاصل ہوتا ہے۔قرآن کریم کا تصور وعمل تزکیہ انسان خالص اور ملت اجماعی پیدا کرتا ہے اور وہی مطلوب ہے مگر آج وہی مفقود بھی ہے۔

تعلیقات وحواشی

(۱) عبدالماجد دریابادی،تفسیر قرآن،تفسیر ماجدی،مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ،۱۹۹۵ء، ۱/۲۵۰-۲۵۲،سورہ بقرہ آیت کریمہ ۱۲۹ کے حاشیہ بلکہ حواشی میں مولانا موصوف نے ''رسول اعظم ﷺ کے جملہ فرائض کمال ایجاز کے ساتھ

چند فقروں میں" بیان کر دیئے ہیں اور ان کا حوالہ آیت کریمہ: ۱۵۱ میں مراجعت کے لئے دیا ہے۔ اول الذکر حواشی میں رسول اکرم ﷺ کی چار حیثیتوں کا ذکر کیا ہے: تلاوت آیات کے حوالے سے مبلغ اعظم کی، تعلیم کتاب کی وجہ سے معلم اعظم کی، حکمت کی تعلیم کی بنا پر مرشد اعظم کی اور تزکیہ کے سبب مصلح اعظم کی یہ تشریحات اپنی جگہ درست ہیں لیکن جامع نہیں۔ دوسرے ان پر ان کی فکر طریقت کا غلبہ بھی ہے۔ ان تمام فرائض رسالت پر جامع بحث باقی ہیں مولانا دریابادی نے جلالین، مدارک، جصاص، قرطبی، طبری، روح المعانی وغیرہ کے علاوہ جدید تحقیقات اور تورات وانجیل کے حوالے بھی دئے ہیں۔

(۲) مثلاً دریابادی نے "یزکیھم" کی تشریح اپنے حاشیہ ۴۶۷ میں لکھی ہے: "تزکیہ سے مراد دلوں کی صفائی ہے، رسول کا کام محض الفاظ اور احکام ظاہر کی تشریح تک محدود نہیں رہے گا بلکہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اور نیتوں کے اخلاص کے بھی فرائض انجام دیں گے، گویا رسول کی یہ چوتھی حیثیت مصلح اعظم کی ہوئی"۔ حاشیہ: ۵۵۹ میں مزکی کی حیثیت بتا کر سابق آیت کے حواشی کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

(۳) مولانا دریابادی نے حکمت کی تشریح میں حاشیہ ۴۶۷ کے تحت لکھا ہے کہ: "رسول تعلیم محض کتاب ہی کی نہ دیں گے بلکہ حکمت و دانائی کی تلقین بھی امت کو کریں گے، احکام و مسائل، دین کے قاعدے اور آداب عوام و خاص سب کو سکھائیں گے اور خواص کی رہنمائی اسرار و رموز میں بھی کریں گے گویا رسول کی تیسری حیثیت مرشد اعظم کی ہوئی۔ رنگ تصوف کے علاوہ محدودیت بھی ہے حکمت قرآنی آیات کریمہ میں وسیع ترین معانی و جہات کو محیط ہے اور ان پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں، وہ ایک الگ تحقیق کا موضوع ہے آیات حکم ہیں (۲۰، محمد فواد عبد الباقی کے مطابق): بقرہ: ۱۲۹، ۱۵۱، ۲۳۱، ۲۵۱، ۲۶۹، ۱۸۸، آل عمران: ۴۸، ۸۱، ۱۶۴، نساء: ۵۴، ۱۱۳، مائدہ: ۱۱۰، نحل: ۱۲۵، اسراء: ۳۹، لقمان: ۱۲، احزاب: ۳۴، ص: ۲۰، زخرف: ۶۳، قمر: ۵، جمعہ: ۲، ان میں اہم ترین ہے: سورہ بقرہ: ۲۹۹، یؤتی الحکمة من یشاء و من یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا۔

مولانا اشرف علی تھانوی، بیان القرآن، تاج پبلشرز دہلی ۱۹۹۴، ۱/ ۰۷ و مابعد نے حکمت کا ترجمہ خوش فہمی کیا ہے جو سراسر ناقص ہے اور اسی طرح فائدہ میں خوش فہمی (کا سلیقہ حاصل کرنے) کی تعلیم" ملی حکمت کی ترجمانی و تشریح نہیں کرتا۔ بعد میں ان کو اصطلاحی "اجتہاد اور تفقہ" سے خاص کر کے فقہاء و مجتہدین تک محدود کر دیا ہے اور وہ ان کی فقہی بلاغت کی ایک نشانی ہے حکمت کی نہیں۔

(۴) حافظ ابن کثیر دمشقی، تفسیر القرآن العظیم، المکتبہ العصریۃ بیروت ۲۰۰۹، ۱/ ۱۷۰-۱۷۱، وماقبل ومابعد، حافظ موصوف کی عربی عبارت بلاغت کے ساتھ تزکیہ کے معانی بھی کسی قدر بتاتی ہے۔

(۵) شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، مکتبہ سلفیہ اشاعت لاہور (مبنی بر طباعت مکتبہ رشیدیہ دہلی، ۱۹۵۲،) ۱/ ۱۲۴ "فاعلم انہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث بالملۃ الحنفیۃ الاسما علیۃ" مضمون خاکسار جاہلی عہد میں حنیفیت معارف اعظم گڑھ اکتوبر نومبر ۲۰۰۳، ۲۴۵ و مابعد، مولانا تھانویؒ نے اپنے فائدہ آیت کریمہ: ۱۲۹، میں حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کی مشترکہ دعا قرار دیا ہے۔ اس سے مراد بھی صرف آپ ہوئے کیونکہ یہ دعا دونوں صاحبوں نے کی ہے تو وہی جماعت مراد ہو سکتی جو دونوں کی اولاد میں ہوں......"۔

متعدد دوسرے مفسرین نے صرف "دعوۃ ابراہیم" ہی پر اکتفا کیا ہے، ان میں حافظ ابن کثیر اور دریابادی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مزید بحث کے لئے مضمون خاکسار، ملت حنیفیہ حواشی فتح الرحمٰن میں" معارف اعظم گڑھ، فروری ۲۰۰۴ء، ۸۵ و مابعد: حضرت شاہؒ نے ان حواشی میں ملت حنیفی ابراہیمی اسماعیلی کی تعریف کی ہے اور مختلف آیات کریمہ سے اس پر استدلال کیا ہے۔

(۶) تلاوت آیات کا محدود لفظی مفہوم حافظ ابن کثیر، تھانوی اور دریابادی وغیرہ کے ہاں ملتا ہے اور بعض نے اسے تبلیغ تک وسیع کیا ہے تلاوت آیات کریمہ کی توسیع اور تاثیر پر بحث کسی نے نہیں کی اور نہ ہی اسے سیرت نبوی کے واقعات سے مربوط کر کے اس کے معانی بتائے۔

(۷) سیرت نبوی میں رسول اکرم ﷺ کے اکابر قریش و عرب کے سامنے تلاوت آیات کریمہ کے واقعات اماماں سیرت وحدیث نے بیان کئے ہیں۔ان میں سردار قریش عتبہ بن ربیعہ عبشمی (عبد شمسی) کا واقعہ تلاوت قرآن کی تاثیر و جہات کو بتاتا ہے کہ وہ ان کو سن کر نہ صرف مبہوت رہ گئے، بلکہ ان کا چہرہ فق ہوگیا اور دل کی دنیا ڈانواڈول ہوگئی۔اس کے ظاہری آثار ان کے چہرے پر پیدا ہوئے اور ان کو دیکھ کر اکابر قریش نے ایک معنی خیز جملہ کہا تھا کہ عتبہ اس چہرے کے ساتھ نہیں واپس آرہے جس کے ساتھ گئے تھے۔

ایسے دوسرے واقعات بھی ہیں: ملاحظہ ہو: ابن اسحٰق/ابن ہشام بحوالہ امام سہیلی، الروض الانف المکتبۃ العلمیۃ بیروت ۲۰۰۹، ۲/ ۴۵-۴۷، و مابعد: اکابر قریش میں ابوجہل مخزومی، ابوسفیان بن حرب اموی، ابی (اخنس) بن شریق ثقفی نے تلاوت نبوی مسلسل تین راتوں تک چھپ کر سنی تھی اور متاثر ہوئے۔قراءت ابی بکر صدیق عنہ کو قریش عورتوں اور بچوں کے سننے اور تاثر لینے کا واقعہ ان کی جوار ابن الدغنہ میں ملتا ہے۔۲/ ۸۱ و مابعد۔

(۸) مثلاً سورہ مدثر: ۴ کی آیت کریمہ ’’وثیابک فطہر‘‘ کی تشریح وتفسیر جامع انداز میں ابن کثیر نے کی ہی اور متعدد معانی بتائے ہیں مولانا شبیر احمد عثمانی نے یہ خاص نکتہ اپنی تشریح میں پیش کیا ہے۔ممکن ہے کہ دوسروں کے ہاں بھی موجود ہو۔

(۹) تزکیہ نفس میں صرف روحانی تزکیہ کا ذکر بالعموم کیا جاتا ہے جیسا کہ دریابادی وغیرہ نے کیا ہے۔

(۱۰) اس بحث کے لئے شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ مذکورہ بالا ۱/ ۱۹ و مابعد ملاحظہ ہو۔باب حقیقۃ الروح میں بدن، نسمہ روح ہوائی اور روح الٰہی کے ارتباط ولزوم اور تفاعل پر ان کی بحث صوفیانہ اور فلسفیانہ ضرور ہے مگر وہ آیات واحادیث سے بھی مستند ہے یہ موضوع ان کی تحریروں میں عام طور سے اور حجۃ کے مختلف ابواب میں خاص طور سے کسی نہ کسی پس منظر وتناظر میں ضرور آتا ہے۔

(۱۱) صحیح مسلم، باب الاسراء، ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، باب علامات النبوۃ قبل الاسلام، شاہ ولی اللہ دہلوی حجۃ اللہ البالغہ، ۲/ ۱۵۴۔

شق صدر پر بحث کے لئے اور مآخذ کی روایات اور علماء کے افکار کے لئے ذیل

میں مذکور مقالہ خاکسار بعثت سے قبل عصمت نبوی میں صفحات: ۱۷-۱۸ اور اس کے حاشیہ: ۱۷ ملاحظہ ہوں۔

(۱۲) ابن اسحاق/ابن ہشام مذکورہ بالا ۱/۲۹۰-۲۹۳ نیز مابعد۔
بحث کے لئے مقالہ خاکسار ''بعثت سے قبل عصمت نبوی''، جہات الاسلام، لاہور جلد ا، شمارہ ۲، جنوری-جون ۲۰۰۸، ۳۵-۵۰۔
شاہ ولی اللہ، الخیر الکثیر، اردو ترجمہ عبدالرحیم پشاوری، غلام رسول سورتی پبلشرز بمبئی غیر مؤرخہ ۱۶۳، و مابعد: چھٹا خزانہ، ہمارے رسول اکرم ﷺ کے کمالات میں لکھا ہے کہ ''رسول خدا ﷺ بعثت سے پہلے حکیم معصوم اور قطب باطنی تھے......''۔ پھر اس کی تفصیل کی ہے اور اس میں آیت کریمہ **یعلمهم الکتب والحکمة** وغیرہ سے بھی استناد کیا ہے۔

(۱۳) مذکورہ بالا آیات نفس کی تشریح وتفسیر مختلف کتب تفسیر میں ملاحظہ ہو۔

(۱۴) تھانوی، بیان القرآن، سورہ یوسف ۵۳ کے فائدہ و حاشیہ میں نفس کی صرف دو قسمیں کی ہیں: امارہ اور مطمئنہ: ''سو امارہ اگر توبہ کرلے تو اس کی مغفرت فرمائی جاتی ہے اور مرتبہ توبہ میں وہ لوامہ کہلاتا ہے اور جو مطمئنہ ہے وہ کمال اس کا لازم ذات نہیں بلکہ عنایت ورحمت کا اثر ہے پس امارہ کے لوامہ ہونے پر عفو کا ظہور ہوتا ہے اور مطمئنہ میں رحیم کا......''۔ مولانا موصوف کی یہ تشریح قابل بحث ہے۔
مولانا دریابادی نے سورہ یوسف کی مذکورہ آیت کریمہ حاشیہ ۱۰۶، میں اپنے مرشد تھانوی کی تشریح کو اپنی زبان میں بیان کردیا ہے۔ یہ بھی ایک اہم تحقیق طلب بحث ہے۔ مولانا تھانوی اور دوسرے اکابر نے نفس مطمئنہ کو جس طرح صرف انعام الٰہی تک محدود کردیا ہے اور اسے تیسری قسم نہیں سمجھا وہ صحیح نہیں ہے۔ نفس لوامہ بھی مرتبہ توبہ میں امارہ کے آجانے سے انعام و رحمت الٰہی ہی ہے۔ نفس مطمئنہ ایمان خالص وعمل صالح کے کمال کے بعد نصیب ہوتا ہے جیسے سیدنا محمد ﷺ کو عطا ہوا تھا یا دوسرے انبیاء کرام واولیاء وصدیقین وشہداء صالحین کو۔

(۱۵) شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، مذکورہ بالا ۱/۱۸-۱۹: باب حقیقۃ الروح کے علاوہ مختلف ابواب میں یہ بحث آئی ہے۔ ابن کثیرؒ اور ابن حجرؒ کی تفسیر ان کی تفسیر

القرآن اور فتح الباری ۸/۲۱۳ بقرہ وسورہ شمس کی تشریح میں ملاحظہ ہو نیز دوسری کتب تفسیر میں بھی۔

(۱٦) مذکورہ بالا

(۱۷) آیات مذکورہ بالا کی تفسیر کتب تفسیر مذکورہ بالا میں۔

سورہ نجم:۳-۴ میں رسول اکرم ﷺ کے نفس/ ہویٰ کا جو ذکر آیا ہے وہ اپ کے پاک ومنزہ نفس کا ہے، ہوائے نفس کا قطعی نہیں ان ایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ وحی الٰہی اندرون نفس محمدی سے نہیں نکلتی بلکہ وہ خارج سے فرشتہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے جس کا مشاہدہ وتجربہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ کلام الٰہی ہے جو خاص طور سے قلب محمدی پر یا نفس محمدی پر القا کیا جاتا ہے۔ بحث کے لئے ملاحظہ ہو: کتاب خاکسار وحی حدیث، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی ۲۰۰۴ء، اولین ابواب خاص طور سے۔

(۱۸) آیات مذکورہ کی تفاسیر کے علاوہ بحث کے لئے ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، اعظم گڑھ ۱۹۸۲ء، ٦/۴۵۰، ومابعد خاص کر ابواب فضائل ورذائل اخلاق۔

(۱۹) سورہ العصر کی تفسیر ابن کثیر میں ملاحظہ ہو۔

(۲۰) شاہ ولی اللہ، مذکورہ بالا، ۱/ ٦۸ ومابعد: باب تعظیم شعائر اللہ میں یہ مختصر بحث بعد کی فصول میں مفصل کی گئی ہے۔ مثلاً ۱/ ٦۷، تلاوت وسماعت قرآن مجید پر مختصر مگر عمدہ بحث ہے۔ اس کے علاوہ متعدد دوسرے مقامات ومباحث میں کتاب اللہ سے وابستگی پر ان کی قیمتی بحثیں ملتی ہیں۔

(۲۱) آیت کریمہ سورہ اعلیٰ کی تفسیر کتب تفسیر میں ہے اور ان کے علاوہ نماز کے اسرار ورموز اور کار تزکیہ پر بحث کے لئے شاہ ولی اللہ، مذکورہ بالا ۱/ ۷۲-۷۳ اور مابعد: باب اسرار الصلاۃ۔

(۲۲) شاہ ولی اللہ، مذکورہ بالا، ۱/ ۷۳-۷۴: باب اسرار الزکوٰۃ۔

(۲۳) ایضاً، ۱/ ۷۴-۷۵، باب اسرار الصوم۔

(۲۴) ایضاً، ۱/ ۷۵-۷٦ باب اسرار الحج۔

(۲۵) حجۃ اللہ البالغہ، ۲/ ۱۸-۲۰ و مابعد میں عبادات اور ان کے اوقات کے اسرار پر عمدہ بحث ہے جس میں فرائض ونوافل شامل ہیں ا/ ۵۰-۵۱ باب حقیقۃ السعادۃ میں فرماتے ہیں: أن السعادۃ الحقیقۃ لا تقنص الا با لعبادات ......"۔ الخیر الکثیر اردو ترجمہ عبدالرحیم پشاوری، غلام رسول سورتی پبلشرز بمبئی غیر مؤرخہ، ۱۲۶، ۱۳۴ و مابعد۔

(۲۶) آیات کریمہ کی تفسیر کتب تفسیر جیسے ابن کثیر، تھانوی، دریابادی وغیرہ میں ملتی ہے اور "اثم" سے متعلق آیات کریمہ میں بھی۔ دقیق بحث کے لئے، شاہ ولی اللہ، مذکورہ بالا، باب مبحث البر والاثم ا/ ۵۸ مابعد۔

(۲۷) بحث کے لئے مقالہ خاکسار۔

اجمیر، مارچ ۸-۱۰، مارچ ۲۰۱۳ء، (بہ اہتمام جامعہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیر) برائے سمینار بعنوان قرآن مجید عہد جدید میں: مسائل وامکانات، نیز تفسیر آیات کی خاطر کتب تفسیر۔

تزکیۂ نفس کا صحیح تصور۔قرآن مجید کی روشنی میں

نعیم الدین اصلاحی

تزکیہ نبی ﷺ کے مقاصد بعثت میں ایک نہایت اہم مقصد ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں آپ ﷺ کی بعثت کی غرض یہی بتائی گئی کہ آپ ﷺ لوگوں کا تزکیہ کریں۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کی بعثت کا مقصد بھی یہی بتایا گیا ہے۔

اذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى. فَقُلْ هَل لَّكَ إِلَى أَن تَزَكَّى

(النازعات:۱۷-۱۸)

فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہوگیا اور اس سے کہو کہ کیا ترے اندر تزکیہ کی رغبت ہے؟

نیز قرآن مجید کی تعلیم سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آخرت میں انسان کی فلاح و نجات کا تعلق تزکیہ نفس ہی پر ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا. وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (الشمس:۹-۱۰)

اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ نا کام ہوا جس نے اس کی گندگیوں پر پردہ ڈالا۔

اس موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تصنیف تزکیہ نفس ہے، مولانا اس موضوع سے متعلق آیات پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”اوپر کے مباحث سے بہت سی باتیں واضح ہوئیں، ایک یہ کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور تمام انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود ہے۔ دین میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے، وہ اہمیت دوسری کسی بھی چیز کو حاصل نہیں ہے۔ دوسری ساری چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ چیزیں غایت و مقصد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی

سرگرمیاں، خواہ ظاہر میں کتنے ہی مختلف پہلو رکھتی ہوں، باطن میں ان کا ہدف انسان اور انسانی معاشرے کے تزکیے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔"(۱)

تزکیہ کا معنی:

مصباح المنیر میں ہے: الزکاء: بالمد النماء والزیادہ . یقال زکا الزرع۔ الزکاء کے معنی نشوونما اور زیادتی اور کثرت کے ہیں۔

امام شوکانی اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اصل الزکاۃ النمو الزیادۃ ومنہ زکا الزرع اذا کثر.(۲)

مولانا سید حامد علی صاحب اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"تزکیہ" ایک اسلامی اصطلاح ہے جس کے منفی معنی یہ ہیں: ان تمام گندگیوں، گمراہیوں اور برائیوں سے پاک کرنا جو خدا کو ناپسند ہیں اور اس کے مثبت معنی ہیں: ان جذبات، افکار اور اعمال واخلاق کو پروان چڑھانا جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں۔(۳)

تزکیہ کا مفہوم مختلف تفاسیر کی روشنی میں

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سورہ بقرہ آیت ۱۲۹ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسی طرح اب تزکیہ پر غور کیجیے، تزکیہ کا عمل ظاہر ہے تعلیم سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور وسیع الاطراف ہے۔ اوپر یہ واضح کر آئے ہیں کہ اس لفظ میں پاک صاف کرنے اور نشوونما دینے دونوں کا مفہوم شامل ہے، یہ بہ یک وقت علمی بھی ہے اور عملی بھی، ظاہری بھی ہے باطنی بھی، مادی اور جسمانی بھی ہے اور عقلی اور روحانی بھی۔ نیز یہ انفرادی بھی ہے اور سماجی اور اجتماعی بھی۔(۴)

مولانا صدرالدین اصلاحی اس کی توضیح میں لکھتے ہیں:

اس طرح گویا تزکیہ پہلی تین کا حاصل اور مدعا ٹھہرا۔ اب اگر تزکیہ کا کوئی ناقص تصور سامنے رکھ لیا جائے یا اس کی تدریجی ترتیب کو الٹ دیا جائے یا اس کی بعض ابتدائی باتوں کو غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا جائے تو نتیجہ کبھی حسب دل خواہ نہیں نکل سکتا اور یہ طریقہ بھی صحیح قرآنی طریقۂ تزکیہ نہیں ہوگا۔(۵)

سورہ بقرہ آیت ۱۵۲ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیم کی دعا میں نبیؐ کی صفات اس ترتیب سے بیان کی گئی تھیں ''جو آیتیں پڑھ کر سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور دونوں کا تزکیہ کرے'' مگر اس جگہ یہ ترتیب قدرے بدلی ہوئی یعنی 'تزکیہ' کا ذکر یہاں ''کتب اور حکمت'' سے پہلے ہی کیا گیا ہے۔ اس کی خاص معنوی وجہ ہے۔ 'تزکیہ' تعلیم و کتاب و حکمت پر بلحاظ معنی مقدم بلکہ اس کا اصل مقصود ہے اور وہ اس کا ذریعہ ہے مگر وجود کے اعتبار سے تعلیم و کتاب و حکمت 'تزکیہ' پر مقدم ہے، ان ہی دونوں حقیقتوں کو بتانے کے لیے ترتیب میں یہ تغیر کیا گیا ہے۔(۶)

مولانا مودودیؒ نے سورہ بقرہ آیت ۱۲۹ کی تفسیر میں 'تزکیہ' کے باب میں اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

زندگی سنوارنے میں، خیالات، اخلاق، عادت، معاشرت، تمدن، سیاست، غرض ہر چیز کو سنوارنا شامل ہے۔(۷)

سورہ جمعہ آیت ۲ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وہ لوگوں کی زندگیاں سنوار رہے ہیں، ان کے اخلاق اور عادات اور معاملات کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر رہے ہیں اور ان کو اعلیٰ درجے کے فضائل سے آراستہ کر رہے ہیں۔ یہ وہی کام ہے جو اس سے پہلے تمام انبیاء کرتے رہے ہیں۔(۸)

علامہ شبیر احمد عثمانی سورہ آل عمران آیت ۱۶۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

تزکیہ نفوس اور مراتب شرک و معصیت سے ان کو پاک کرنا اور دلوں کو مانجھ کر صیقل بنانا۔(۹)

عربی مفسرین کی رائیں:

تزکیہ نفس کے سلسلے میں عربی زبان کے کچھ معروف مفسرین کے آراء پیش کیے جا رہے ہیں تا کہ تزکیہ نفس کا صحیح قرآنی تصور نکھر کر سامنے آجائے۔

مشہور مفسر حضرت علامہ ابن کثیر سورہ بقرہ آیت ۱۲۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قال علی بن ابی طلحة عن ابن عباس یعنی طاعة الله و الاخلاص

تزکیہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس میں اخلاص کا نام ہے۔(۱۰)

سورہ بقرہ آیت ۱۵۱ میں 'تزکیہ' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یزکیهم ای یطهرهم من رذائل الاخلاق و دنس النفوس و افعال الجاهلية ويخرجهم من الظلمات الى النور (۱۱)

یعنی وہ پاک کرے اخلاق کی پستیوں اور نفس کی گندگیوں اور جاہلیت کے کاموں سے اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔

سورہ آل عمران آیت ۱۶۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یزکیهم ای یأمرهم بالمعروف وینهاهم عن المنکر لتزکوا نفوسهم وتطهر من اللدنس والخبث الذی کانوا متلبسین به فی حال شرکهم وجاهلیتهم (۱۲)

اور ان کا تزکیہ کرے یعنی ان کو معروف کا حکم دے اور منکرات سے روکے تاکہ ان کے نفوس کا ارتقاء ہو اور اس گندگی اور خباثت سے دور ہو جائیں جس میں حالت شرک اور جاہلیت میں لت پت تھے۔

سورہ جمعہ آیت ۲ کی تفسیر میں تلاوت آیات تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ نفس کے سلسلے میں ایک جامع گفتگو فرمائی لکھتے ہیں:

عرب جو دین حنیف کے پیرو تھے اور اہل کتاب جو دین حق کے امین تھے جب انھوں نے دین حق کو چھوڑ دیا اور اللہ کی کتابوں میں تحریف کر ڈالی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ایک عظیم شریعت دے کر دنیا میں بھیجا جو ساری انسانیت کے لیے ایک کامل اور جامع شریعت تھی جس میں دنیا اور آخرت کے تمام معاملات میں مکمل رہنمائی تھی اور جس میں انسان کو ان امور کی طرف دعوت دی گئی تھی جو انھیں جنت سے ہم کنار کرنے والے ہوں اور دوزخ سے دور رکھنے کا ذریعہ بنیں اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچائیں اور اس میں ان تمام ہی شکوک و شبہات اور اضطراب و بے چینی کا علاج بھی ہے جو انسان کو اس کی زندگی میں پیش آسکتے ہیں۔

وذالک أن العرب کانوا قدیما متمسکین بدین ابراهیم الخلیل فبدلوه و غیروه وخالفوه و استبدلوا بالتوحید شرکا وبالیقین شکّا و ابتدعوا أشیاء لم یاذن بها اللّٰه و کذلک أهل الکتاب فبدّلوا کتبهم وحرّفوها وغیّروها وأوّلوها،

فبعث الله محمداً—صلوات الله وسلامه عليه—بشرع عظيم كامل شامل لجميع الخلق فيه هدايتهم والبيان لجميع ما يحتاجون اليه من أمر معاشهم ومعادهم والدعوة لهم ما يقربهم الى الجنة ورضا الله عنهم والنهى عما يقربهم الى النار وسخط الله حاكم فاصل لجميع الشبهات الشكوك والريب. (۱۳)

جدید عربی مفسرین میں علامہ رشید رضا مصری ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

يزكيم اى يطهر نفوسهم من الاخلاق الذميمة وينزع منها تلك العادات الرديئة ويعودها الاعمال الحسنة التى تطبع فى النفوس ملكات الخير ويبغض اليها الاعمال القبيحة التى تقربها بالشر (۱۴)

تزکیہ یہ ہے کہ پست اخلاق سے ان کو پاک کرے، قبیح اور بری عادات کا قلعہ قمع کرے، پاکیزہ اور عمدہ خصلتوں کا ان کو عادی بنائے جن سے دلوں میں خیر اور بھلائی کا ملکہ نشوونما پائے اور ان برے اعمال سے دلوں میں نفرت بیٹھائے جو شر وفساد کو دل سے قریب کرتے ہیں۔

آگے سورہ بقرہ آیت ۱۵۲ کی تفسیر میں تزکیہ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

اى يطهر نفوسكم من الاخلاق السافلة والرذائل الممفوتة ويخلقها بالاخلاق الحميدة فيه من حسن الاسوة لا بالقهر والسطوة وخص المفسر (الجلال)الزكية بالتطهير من الشرك قال ا لاستاذ الامام: وهذا لايصح فان الاسلام كما جاء بالتوحيد الماحى للشرك جاء بالتهذيب المطهرمن سفساف الاخلاق وقبائح العادات والمعاصى التى كانت فاشية فى العرب فقد كانوا يئدون بناتهم —يدفنونهن —ويقتلون اولادهم للتخلص من النفقة عليهم وذالك نهاية القسوة والشح وكانوا يسفكون الدماء فيما بينهم لاهون سبب يثير حميتهم الجاهلية لما اعتادوه من البغى فى الثارات ومن شن الغارات ونهب بعضهم بعضاً، وكان عندهم من التسفل أن احدهم يتزوج زوج ابيه حتى تفتدى منه الى غيرذالك وقد زكاهم النبى من ذالك كله باقتدائهم بأخلاقه العظيمة فى عباداته الكاملة وآدابه العالية وجمعهم بعد تلك الفرقة

وألف الله بينهم على يديه حتى صاروا كرجل واحد وجعلت شريعته ذمتهم واحدة يسعى بها أدناهم فاذا اعطى مولى أو رقيق لهم أمانا لأى انسان محارب كان ذالك كتأمين أمير المومنين له، فأى تزكية أعلى من هذه التزكية (۱۵)

یعنی انسانی نفوس کو پست اخلاق اور نہایت ناپسندیدہ صفات سے پاک وصاف کرتا ہے اور اچھے اخلاق اور عمدہ سیرتوں کے ذریعہ اوصاف حمیدہ کو پروان چڑھاتا ہے نہ کہ زور اور جبر کے ذریعہ۔ امام جلال الدین سیوطی تزکیہ کا مفہوم صرف شرک کی آلائشوں سے پاکی تک محدود رکھتے ہیں لیکن استاد امام عبدہ کا خیال ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اسلام جس طرح ایسی توحید کا علم بردار ہے جو شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے، اسی طرح ایک ایسی تہذیب کی بھی نمائندگی کرتا ہے جو اخلاقی پستی اور بری عادات واطوار کے خلاف بھی اعلان جنگ کرتا ہے اور ان ساری معصیتوں کے خلاف آواز بلند کرتا ہے جو جاہلی تہذیب وتمدن کا حصہ تھیں۔ وہ زندہ بچیوں کو درگور کرتے، بھوک مری کے خوف سے بچوں کو مار ڈالتے، جو نہایت پست درجے کی قساوت ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر ایسی طویل جنگ چھڑ جاتی جس کی وجہ سے لوٹ مار، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا، ان کی اخلاقی پستی کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنی سوتیلی ماؤں کو بھی باپ کے مرنے کے بعد اپنی نکاح میں لے لیتے۔ ان سب برائیوں سے نبی ﷺ نے ان کا اپنے بلند اخلاق، جامع عبادات اور عظیم الشان آداب کے ذریعہ تزکیہ کیا۔ افتراق کی جگہ الفت پیدا کی اور ان کو اجتماعیت کی مضبوط لڑی میں پرو دیا۔ اگر ان کا ایک معمولی غلام بھی کسی محارب اور دشمن سے معاہدہ کر لیتا تو پوری جماعت اس کی پابندی کرتی، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی تزکیہ کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

سورہ آل عمران آیت ۶۴ کی تفسیر میں علامہ لکھتے ہیں:

اقول أن المراد بالتزكية تربية النفوس وأنه ﷺ كان مربيا و معلما و أراد بقوله ان العقائد أساس الملكات ان من لم يتزك عقله و يتطهر من خرافات الوثنية وجميع العقائد الباطلة لا تتزكى نفسه بالتخلى عن الاخلاق الذمية والتحلى بالملكات الفاضلة..... تزكية النفس لاتتم الا بتزكية العقل و لاتتم تزكية العقل الا بالتوحيد الخالص(۱۶)

امام شوکانی سورہ بقرہ آیت ۱۲۹ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یطھرھم من الشرک و سائر المعاصی (۱۷)

فلاح و کامیابی کا قرآنی تصور:

مولانا مودودیؒ سورہ الاعلیٰ آیت ۱۴ قد افلح من تزکی کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

پاکیزگی سے مراد ہے کہ کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانا۔ برے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق اختیار کرنا اور برے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال کرنا، فلاح سے مراد دنیوی خوشحالی نہیں ہے بلکہ حقیقی کامیابی ہے۔ خواہ دنیا کی خوشحالی اس کے ہاتھ میسر ہو یا نہ ہو۔ (۱۸)

سورہ شمس آیت ۹ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا، ابھارنا اور نشو و نما دینا، سیاق و سباق سے اس کا صاف مطلب یہ ہے جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اس کو ابھار کر تقویٰ کی بلندی پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائی کو نشو و نما دے وہ فلاح پائے گا، اس کے مقابلے میں دساھا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا مصدر تدسیہ ہے کے معنی دبانے، چھپانے، اغوا کرنے اور گمراہ کر دینے کے ہیں۔ سیاق و سباق سے اس کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شخص نامراد ہو گا جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے رجحانات ابھارنے اور نشو و نما دینے کے بجائے ان کو دبا دے۔ (۱۹)

سورۃ اللیل آیت ۱۸ کی تشریح میں فرماتے ہیں:

یہاں مقصود دو انتہائی متضاد کرداروں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کر کے ان کا انتہائی متضاد انجام بیان کرنا ہے، ایک وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو جھٹلا دے اور اطاعت کی راہ سے منہ پھیرے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو نہ صرف ایمان لائے بلکہ انتہائی خلوص کے ساتھ کسی ریاکاری اور نام و نمود کی طلب کے بغیر اس کے لیے اپنا مال راہِ خدا میں صرف کرے کہ وہ اللہ کے پاس پاکیزہ انسان قرار پانے کا خواہاں ہے۔ (۲۰)

تزکیہ کا معنی بہت وسیع ہے:

مولانا امین احسن اصلاحی سورہ نازعات کی آیت 'ماتزکی' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

یہ لفظ یہاں وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی خودسری، انانیت اور ظلم و جور سے

پاک زندگی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بندے کی ہوتی ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی رہا ہے۔ یہ کام انھوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی آیات کے ذریعہ انجام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے: **هو الذی بعث فی الامیین......**

مولانا مودودی نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے:

یہاں پاکیزگی (تزکی) اختیار کرنے کا مطلب عقیدے اور اخلاق اور اعمال کی پاکیزگی اختیار کرنا، یا دوسرے الفاظ میں اسلام قبول کر لینا ہے۔ ابن زید کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں تزکی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد اسلام قبول کرنا ہی ہے۔ (۲۱)

اسی وجہ سے قرآن مجید سورۂ بقرہ اور دوسری سورتوں میں جب شرعی قوانین بیان کرتا اور انسانی معاشرت اور تمدن کے اصول و احکام واضح کرتا ہے تو آخر میں بالعموم ان کے مصالح کی طرف لفظ تزکیہ اور طہارت کے ذریعہ اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ، طلاق کے بعد رجوع کے سلسلے میں ارشاد ہے:

ذالکم ازکی لکم و اطهر

اس آیت کی تشریح میں مولانا صدر الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

یہاں خوب تر اور پاکیزہ تر جن الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ ازکی اور اطہر کے الفاظ ہیں جو در اصل ایک ہی حقیقت (یعنی نفس انسانی کے صحیح اخلاقی نشو ونما) کے دو مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پہلا مثبت پہلو کی، دوسرا منفی پہلو کی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرد اور عورت جو کل تک رشتۂ ازدواج میں منسلک تھے اور باہم جدا ہو گئے، اگر اس عارضی جدائی کے بعد پھر یہ رشتہ برقرار رکھنے کے خواہش مند ہوں تو ان کو ایسا کرنے دینا ان دونوں کے اخلاقی مصالح کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے اور اگر انہیں زبردستی اس سے باز رکھا گیا تو یہ چیز ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ دونوں ایک مدت تک گھل مل کر رہ چکے ہیں، ایک کے لیے دوسرے کے دل میں جگہ بن چکی ہے، ایک نے دوسرے کو برسوں اپنے سکون خاطر کا سرچشمہ پایا ہے۔ اس لیے اتفاقی کشیدگی نے اگر دونوں کو جذبات کی رو میں بہا کر علیحدہ کرا دیا تو اس کا مطلب یہ لازماً نہیں ہو سکتا کہ الفت اور یگانگی کی وجہ سے

سارے جذبات معدوم ہو چکے ہوں جو ابھی کل تک ان کے دلوں میں گہری جڑیں چھوڑے ہوئے تھے چنانچہ ان کا از سر نو تجدید تعلق پر راضی ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ علیحدگی کا فیصلہ وقتی اشتعال یا جذباتی جلد بازی کا نتیجہ تھا۔ دل ظاہری پردوں کے پیچھے ملے ہوئے تھے اور ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو رفاقت سے زبردستی باز رکھنا، دراصل ان کو شیطان کی گھات میں لا بٹھانے کے ہم معنی ہے اور اگر ان کی خواہش پوری ہو جانے دی گئی تو ان کے صنفی اور ازدواجی دونوں طرح کے اخلاق نہ یہ کہ صرف محفوظ ہو جائیں گے بلکہ اسی تصور تزکیہ کے موافق وہ مزید نشو و نما اور حسن کمال کی منزلیں بھی طے کرتے جائیں گے۔(۲۲)

تزکیہ نفس کے ذرائع:

تزکیۂ نفس کے ذرائع میں صدقہ ایک اہم ذریعہ ہے۔ غزوۂ تبوک سے جو لوگ بغیر عذر کے پیچھے رہ گئے اور اخلاص کے باوجود اس انتہائی اہم مہم میں شریک نہیں ہو سکے تھے ان کی مخلصانہ توبہ کی قبولیت کے لیے صدقہ اور خیرات پر انھیں ابھارا گیا ہے اور پیارے نبی ﷺ کو حکم دیا گیا ہے:

خذمن اموالهم صدقة تطهرهم و تزكيهم بها

اے نبی ﷺ! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور نیکی کی راہ (التوبہ: ۱۰۳) میں انھیں بڑھاؤ۔

مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے سورہ توبہ حاشیہ ۹۹ کے آخر میں فرماتے ہیں:

اس سلسلے میں ایک اور مفید نکتے پر بھی نگاہ رہنی چاہیے کہ جو ان آیات میں ارشاد ہے، وہ یہ ہے کہ گناہوں کی تلافی کے لیے زبان اور قلب کی توجہ کے ساتھ عملی توبہ بھی ہونی چاہیے اور توبہ کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں خیرات کرے۔ اس طرح وہ گندگی جو نفس میں پرورش پا رہی تھی اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صدور ہوا تھا وہ دور ہو جاتی ہے اور خیر کی طرف پلٹنے کی استعداد بڑھتی ہے۔ گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا، اپنے گرنے کو خود محسوس کرے پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لیے نہایت بری جائے قرار سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہے پھر اس کا صدقہ و خیرات اور دوسری نیکیوں

سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔(۲۳)

مولانا امین احسن اصلاحی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہاں تطہیر اور تزکیہ کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔قرآن میں ان دونوں کے مواقع استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ تطہیر میں غالب پہلو ظاہری اور باطنی نجاستوں اور رذائل سے پاک کرنے کا ہے اور تزکیہ میں رذائل سے پاک کرنے کے ساتھ ساتھ صلاحیتوں اور خوبیوں کو نشوونما دینے اور فضائل اخلاق سے آراستہ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔

اس ٹکڑے سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ نفاق کی بیماری کا سب سے زیادہ مؤثر علاج اللہ کی راہ میں انفاق ہے کہ یہ بیماری اصلاً محبت دنیا سے پیدا ہوتی ہے جو ان تمام رذائل کے پیدا ہونے کا سبب ہے جن کے مجموعے کا نام نفاق ہے۔انفاق سے اس بیماری کی جڑ کٹتی ہے اور جب اس کی جڑ کٹ جاتی ہے تو ایک طرف رذائل مضمحل ہو جاتے ہیں دوسری طرف مکارم وفضائل پروان چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ اللہ اور رسول پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ اصل احسان اللہ اور رسول کا ہے کہ ان کے انفاق کو قبول فرماتے ہیں، اس لئے کہ اس سے جو تطہیر اور تزکیہ حاصل ہوتا ہے اس کے محتاج اللہ اور رسول نہیں ہیں بلکہ وہی لوگ ہیں جن کو انفاق کی دعوت دی جاتی ہے۔(۲۴)

اختلاط مردوزن سے اجتناب بھی تزکیہ نفس کا ذریعہ ہے

قرآن سورہ احزاب میں حجاب کے ضمن میں فرماتا ہے: ذالکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن (۲۵) اس آیت کریمہ میں نبی ﷺ اور عام مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ غیر مردوں کے ساتھ پردے کا اہتمام کریں۔

یہ آیت اترنے کے بعد ازواج مطہرات کے گھروں پر پردے لٹک گئے اور چونکہ نبی ﷺ کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا اس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر پردے لٹک گئے۔(۲۶)

اس آیت کریمہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے تصور تطہیر وتزکیہ کے لحاظ سے مخلوط مجالس مخلوط تعلیمی اداروں اور دفاتر وغیرہ میں اختلاط مردوزن بالکل ہی مناسب نہیں ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ ایک دفع دخل مقدر ہے، مطلب یہ ہے کہ بظاہر یہ بات ایک غیر ضروری تکلف محسوس ہوتی ہے کہ کسی کو ان سے ایک گلاس پانی مانگنے کی بھی ضرورت پیش آجائے تو اس کے لیے پردے کا اہتمام کرے لیکن یہ کوئی تکلف نہیں بلکہ دل کو آفات سے محفوظ رکھنے کی ایک نہایت ضروری تدبیر ہے۔ انسان کا دل جس نے بنایا ہے وہ اس کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ کن کن مخفی راستوں سے یہ دل برے اثرات قبول کرتا ہے اور دل ہی وہ چیز ہے جس پر انسان کی تمام اخلاقی صحت کا انحصار ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن کو اپنے دل کی صحت مطلوب ہو وہ اس کو ان تمام چیزوں سے محفوظ رکھیں جو اس کو غبار آلود کر سکتی ہیں۔ اس زمانے کے مدعیان تہذیب اپنے کپڑوں کی صفائی کا تو بڑا اہتمام رکھتے ہیں، مجال نہیں کہ ان پر ایک شکن یا ایک دھبہ پڑنے دیں لیکن ان کے دل جس گندگی سے لت پت رہتے ہیں ان کی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی و روحانی صحت کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے، حالانکہ اصل اہمیت رکھنے والی چیز یہی ہے۔ نبی ﷺ نے اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔ مضغة فی جسد اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا و هی القلب (انسان کے جسم میں ایک ٹکڑا گوشت کا ہے، اگر وہ تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے اور جب اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے، آگاہ ہو کر سن لو کہ وہ دل ہے۔ انسان کے جسم میں جتنی چیزیں جتنی نازک اور قدر و قیمت رکھنے والی ہیں اتنی زیادہ ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ دل سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والا اور سب سے زیادہ حساس ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا سب سے زیادہ اہتمام فرمایا۔(۲۷)

تزکیہ نفس توفیق الٰہی سے حاصل ہوتا ہے

سورہ نور آیت ۲۱ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولولا فضل الله علیکم ورحمته مازکی منکم من أحد ولکن الله یزکی من یشاء (النساء:۴۹)

اس آیت کی تشریح میں مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

فرمایا کہ ہر شخص یاد رکھے کہ جس کو بھی کوئی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے محض اللہ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے، اگر اس کی توفیق شامل حال نہ ہو تو کوئی پاک نہیں ہو سکتا۔ تو کسی کو اپنے تقویٰ و تزکیہ کا اتنا غرہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دوسروں کے معاملے میں ہر قسم کی باتیں بے تحقیق قبول کر لے۔ (۲۸)

قرآن سورہ نساء میں یہود کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے:

الم تر الی الذین یزکون انفسھم بل اللہ یزکی من یشاء

تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو بزرگ اور پاکباز ٹھہراتے ہیں بلکہ اللہ ہے جو پاکیزہ بناتا ہے جسے چاہتا ہے اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا۔

اس آیت کی تشریح میں سید قطبؒ لکھتے ہیں:

یہ کام لوگوں کا نہیں ہے کہ خود کو بزرگ قرار دیں اور اپنے لیے خیر و صلاح تقرب الی اللہ اور خدا کے یہاں برگزیدگی کے مدعی ہوں، یہ صرف اللہ کا کام اور اس کا حق ہے۔ وہ جسے چاہے برگزیدہ کرے اور مزکی قرار دے۔ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال کو بخوبی جانتا ہے، وہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا، اگر وہ اس معاملہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حوالہ کردیں اور خود عمل کی طرف متوجہ ہو جائیں، بجائے اس کے کہ دعوے کریں، اگر وہ عمل کرتے رہیں اور اپنے سلسلے میں خاموش اور متواضع رہیں اللہ کا ادب اور اس سے حیا کریں اور اپنے تزکیہ کا دعویٰ اور کوئی ادعا نہ کریں تو وہ اللہ کے یہاں گھاٹے میں نہ رہیں گے۔ ان کا کوئی عمل فراموش اور نظر انداز نہ ہوگا اور نہ ان کا حق مارا جائے گا۔ (۲۹)

سورہ بقرہ آیت ۱۵۱ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وہ انھیں پاک کرتا، انھیں رفعت و بلندی بخشتا اور انھیں پاکیزگی عطا فرماتا ہے، وہ ان کے گھروں، سامانوں آبروؤں اور تعلقات کو پاکیزہ بناتا ہے، وہ ان کی زندگی، ان کے سماج اور ان کی تنظیموں کو پاک صاف کرتا ہے اور وہ انھیں شرک و بت پرستی اور خرافات و اساطیر سے اور ان مشرکانہ تصورات وخرافات سے زندگی میں انسان اور انسانیت کے لیے جو مذموم اور قابل شرم مراسم، عبادات اور اوضاع و اطوار پھیلتے اور رواج پاتے ہیں، ان سب

سے انھیں پاک کرتا ہے۔ وہ حیات جاہلیت کی گندگی اور اس گندگی میں لت پت احساسات، عبادات، رسوم اور اقدار و افکار سے انھیں پاک صاف کرتا اور نجات بخشتا ہے۔(۳۰)

خلاصہ:

خلاصہ بحث یہ ہے کہ تزکیہ کا تعلق ظاہر سے بھی ہے اور باطن سے بھی۔ عقائد سے بھی ہے اور اعمال سے بھی۔ تہذیب وتمدن سے بھی ہے اور ریاست و خلافت سے بھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے اس اقتباس پر مقالہ کا خاتمہ چاہتا ہوں۔

مختصر الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ تزکیہ ایمان، اسلام اور احسان تینوں کے تقاضے بیک وقت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے اللہ کو اس کی تمام صفتوں کے ساتھ مانیں، زندگی کے ہر گوشے میں اس کے تمام احکام کی اطاعت کریں اور یہ ماننا اور اطاعت کرنا محض رسمی اور ظاہری طریقے پر نہ ہو بلکہ پورے شعور اور گہری للّٰہیت کے ساتھ ہو۔ جس میں ہمارے اعضاء و جوارح کے ساتھ ہمارا دل بھی پورا پورا شریک ہو۔(۳۱)

حواشی

(۱) تزکیۂ نفس، امین احسن اصلاحی، کرنسی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی ۲۰۱۱، ج:۱، ص ۲۵، دار الفکر، بیروت

(۲) فتح القدیر ص ۴۴۹، ج ۵

(۳) فی ظلال القرآن ج ۲ ص ۳۹۸ حاشیہ ا

(۴) تدبر قرآن ج ا ص ۳۵۴ مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور، پاکستان

(۵) تیسیر القرآن ص ۱۷۱، مولانا صدر الدین اصلاحی ترتیب و تدوین مولانا رضوان فلاحی مطبوعہ مرکزی مکتبہ پبلشرز نئی دہلی

(۶) تیسیر القرآن ص ۱۹۵، از مولانا صدر الدین اصلاحی حوالہ سابق

(۷) تفہیم القرآن ج ا ص ۱۱۲ حاشیہ ۲۸

(۸) تفہیم القرآن ج ۵ مطبوعہ مرکزی مکتبہ سن اشاعت طبع مکرر جون ۱۹۹۷ء

(۹) شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ص ۹۲، مطبوعہ مجمع خادم الحرمین الشریفین الملک فہد

(۱۰) تفسیر القرآن الکریم للامام الجلیل الحافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر القرشی الدمشقی المتوفی ۷۷۴ھ الجزء الاول ص ۱۸۴ دارالمعرفۃ، بیروت، لبنان
(۱۱) حوالہ سابق ج ا ص ۱۹۶
(۱۲) حوالہ سابق ص ۴۲۴
(۱۳) جلد۴، ص ۳۶۳
(۱۴) المنار، مطبوعہ دارالمعرفۃ للطباعۃ والنشر، بیروت، لبنان، ص ۴۷۳
(۱۵) المنار الجزء الثانی، دارالمعرفۃ، ص ۲۸
(۱۶) المنار، الجزء الرابع، ص ۲۳۳
(۱۷) فتح القدیر، مطبوعہ دارالفکر
(۱۸) تفہیم القرآن، ج ۶ ص ۳۱۵ حاشیہ ۱۳
(۱۹) تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۵۴
(۲۰) تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۵۶
(۲۱) تفہیم القرآن ج ۶ ص ۲۴۲ حاشیہ ۸
(۲۲) تیسیر القرآن از مولانا صدرالدین اصلاحی ص ۲۸۱-۲۸۲، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی
(۲۳) تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۱۳ حاشیہ ۹۹
(۲۴) تدبر قرآن ج ۳ سورہ توبہ، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن، لاہور پاکستان
(۲۵) احزاب آیت ۵۳
(۲۶) تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۲۱
(۲۷) تدبر قرآن ج ۶ ص ۲۶۴، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور پاکستان
(۲۸) تدبر قرآن سورہ نور ج ۵ ص ۳۸۷
(۲۹) فی ظلال القرآن، سید قطب شہید، مترجم مولانا سید حامد علی ص ۳۳۱، ہندوستان پبلیکیشنز گلی قاسم جان، بلی ماران، دہلی
(۳۰) حوالہ سابق ص ۳۹۸
(۳۱) تزکیہ نفس ص ۴۱، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، اشاعت دسمبر ۲۰۱۱ء

غیر مسلم کا قرآن مجید سے استفادہ۔ مسائل اور طریقہ کار

عبدالبر اثری فلاحی

قرآن مجید "هُدیً لِلنَّاسِ" "لوگوں کیلئے ہدایت نامہ" (البقرۃ:۲/۱۸۵) ہے۔ ہر ایک کے لئے رہنما کتاب ہے۔ اسی لئے ہر ایک تک اسے پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے "وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْآنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ" (الانعام:۶/۱۹) اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو تنبیہ کر دوں۔

"یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" (المائدہ:۵/۶۷) اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے۔ وہ لوگوں تک پہنچادو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔

آپ ﷺ نے بھی خطبہ حجۃ الوداع کے موقع سے ہدایت دی تھی کہ "بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَ لَوْ آیَةً" () قرآن مجید میں تو یہاں تک ہدایت ہے کہ جنگی حالات میں بھی قرآن مجید سے استفادہ کا موقع فراہم کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَ اِنْ اَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰالِکَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا یَعْلَمُوْنَ" (التوبۃ:۹/۶) اور مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے مامن تک پہنچادو۔ یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

یہی ہدایات تھیں جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ اور اسلاف کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ حق پہنچانے کے لئے قرآن سنانے کا اہتمام کرتے تھے اور جب ضرورت ہوتی تھی تو غیروں کو بھی آیات، سورتیں اور مکمل مصحف لکھ کر بھی عنایت کرتے تھے۔

اس ضمن میں دو اشکالات کا ازالہ ضروری ہے جو بعض احادیث اور آیات کی وجہ سے ذھنوں میں راہ پا گئے ہیں۔ایک اشکال یہ ہے کہ جب دشمن کے علاقے میں قرآن لے کر سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ متفق علیہ روایت ہے تو پھر انہیں قرآن دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں:"عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ یُّسَافِرَ بِالْقُرْآنِ اِلٰی اَرْضِ الْعَدُوِّ مَخَافَۃَ اَنْ یَّنَالَہُ الْعَدُوُّ"(صحیح بخاری، کتاب الجہاد: حدیث نمبر ۲۹۹۰/صحیح مسلم، کتاب الامارہ: حدیث نمبر ۱۸۶۹) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ قرآن ساتھ لے کر دشمن کے ملک میں سفر کیا جائے، اس خوف سے کہ کہیں دشمن اسے چھین نہ لے۔

اس روایت کی تشریح میں محدثین نے صراحت کی ہے کہ اس ممانعت کی وجہ قرآن کی اہانت اور بے حرمتی کا خوف ہے۔اگر یہ خوف نہ ہو تو دشمن ملک میں بھی قرآن لے کر سفر کیا جاسکتا ہے۔تفصیلات کے لئے دیکھئے فتح الباری لابن حجر۔

دوسرا اشکال یہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ "لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ" (سورۃ الواقعہ:۵۶/۷۹) اسے نہیں چھوتے ہیں بجز پاک لوگوں کے۔اسی طرح بعض احادیث میں ہدایت ہے کہ قرآن کو باوضو آدمی ہی چھوسکتا ہے۔ایسی صورت میں اگر کسی غیر مسلم کو قرآن دیا جائے تو نہ ہی وہ پاکی اور صفائی کا اہتمام کرتا ہے جیسا کہ ایک مسلمان کرتا ہے اور نہ ہی وہ باوضو ہوتا ہے ایسی صورت میں بھلا کسی غیر مسلم کو قرآن کیسے دیا جاسکتا ہے؟

یہ اشکال بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ طہارت اور وضو کی شرط اہل ایمان کے لئے۔ غیر مسلموں کے لئے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی جاسکتی۔کیونکہ جب وہ اصل دین کو تسلیم نہیں کرتا تو فروع دین کا مکلّف اسے کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں تقریب فہم کے لئے ایک استفتاء نقل کرنا افادہ سے خالی نہ ہوگا۔ملاحظہ فرمائیں:

سوال: کیا برادرانِ وطن کو قرآن مجید مع ترجمہ دیا جاسکتا ہے؟

جواب: امام صاحبؒ سے منقول ہے کہ نصرانیوں کو قرآن اور فقہ کی تعلیم دینے

میں کچھ حرج نہیں کہ شاید یہی اس کے لئے وسیلہ ہدایت بن جائے ”أعلم النصرانی الفقه و القرآن لعله يهتدى“ (الفتاوی الهندية:۵/۳۲۳، کتاب الکراهية) خاص کر موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت ہے کہ جن غیر مسلموں سے اس بات کا اندیشہ نہ ہو کہ وہ لے کر اس کی اہانت کریں گے، تو ان کو قرآن اور اس کا ترجمہ دیا جائے، تاکہ اسلام اور قرآن کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہوں۔

سوال: بعض اخبارات میں یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک مولوی قسم کی شخصیت نے قرآن مجید وزیر اعظم کو پیش کیا، جبکہ قرآن مجید کو باوضو چھونے کا حکم ہے، کیا یہ بے حرمتی نہیں ہے؟

جواب: دعوتِ اسلام کے نقطہ نظر سے غیر مسلموں کو قرآن مجید یا اس کا ترجمہ دینا جائز ہے، قرآن مجید چھونے کے لئے وضو کرنے کا حکم مسلمانوں کے لئے ہے، جو لوگ دائرہ ایمان میں داخل ہی نہیں ہوئے، وہ اس حکم کے مخاطب نہیں ہیں، کیونکہ غیر مسلم حضرات جب تک ایمان نہ لائیں، شریعت کے فروعی احکام ان سے متعلق نہیں ہوتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو جو خطوط لکھے، ان خطوط میں بھی قرآن مجید کی آیات تھیں، حالانکہ وہ غیر مسلم تھے، البتہ اگر کسی غیر مسلم سے قرآن کی توہین کا اندیشہ ہو تو اسے قرآن نہ دینا چاہئے‘(۱)

جو لوگ صرف ترجمہ کی اشاعت اور تبلیغ کو ناجائز کہتے ہیں ان کے دو خدشات ہیں ایک تو متن قرآن کا ضیاع دوسرے تحریف معنوی لیکن ان دونوں خدشات میں زیادہ وزن نہیں ہے جیسا کہ مولانا سید عروج احمد قادریؒ نے ان خدشات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے ”اب میں ان لوگوں کے خیالات کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں جو غیر مسلموں کے لئے بھی صرف ترجمے کی اشاعت کو ناجائز کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ اندیشہ ہے کہ اگر بلا متن ترجمے رائج ہو گئے تو دیگر کتب سماوی کی طرح قرآن کا متن بھی نعوذ باللہ دنیا سے غائب ہو جائے گا اور صرف تراجم باقی رہ جائیں گے۔ قرآن کے بارے میں یہ اندیشہ میرے نزدیک وہم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس اندیشے میں پہلی بات تو یہ نظر انداز ہو گئی ہے کہ صرف انگریزی یا صرف ہندی کے ترجمے اصلاً غیر مسلموں تک قرآن کی تعلیمات پہنچانے کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے

مسلمانوں کے درمیان صرف تراجم کے رائج ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔دوسری بات جو پہلی بات سے زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ اس معاملے میں قرآن اور دیگر کتب سماوی کو ایک قرار دے دیا گیا ہے۔حالانکہ تمام انسان مل کر بھی قرآن کو دنیا سے غائب کرنا چاہیں تو ہرگز قادر نہیں ہوسکتے۔اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ قرآن کو قیامت تک دنیا میں باقی رکھنے، بلکہ امت مسلمہ میں سے ایک ایسے گروہ کو باقی رکھنے کی ذمہ داری لی ہے جو خود قرآن پر عمل کرتا رہے گا، دنیا کو اس کی طرف دعوت دیتا رہے گا اور تمام معنوی تحریفات کو باطل کرتا رہے گا۔

پریس کی اس ترقی کے زمانے میں قرآن دنیا بھر میں کروڑوں کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔لاکھوں سینوں میں قرآن محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا۔اس کے علاوہ دیگر سائنسی ذرائع اور وسائل ایسے پیدا ہوگئے ہیں جو متن قرآن کی حفاظت کے لئے بھی استعمال کئے جارہے ہیں۔اور کئے جائیں گے۔یہاں اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے۔حفاظت قرآن کے تمام ذرائع و وسائل کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔

دوسری دلیل جو دی جاتی ہے وہ یہ اندیشہ ہے کہ اگر متن سامنے نہ ہو تو تحریف معنوی کی بڑی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔

یہ عجیب اندیشہ ہے جو فہم سے بالاتر ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا متن کی موجودگی میں تحریف معنوی نہیں کی جاسکتی اور کیا متن کے ساتھ ساتھ تحریف کی مثالیں آج بھی موجود نہیں ہیں؟(۲)

ایک مسئلہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ دعوت اسلام کے نقطہ نظر سے اگر قرآن غیر مسلموں کو دینا ضروری ہی ہے تو پھر صرف ترجمہ انہیں دیا جائے یا ترجمہ مع متن انہیں دیا جائے۔اسی طرح صرف ترجمہ چھاپا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں دونوں رائیں پائی جاتیں ہیں اور دونوں کے دلائل ہیں۔لیکن زیادہ بہتر رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ حامل المتن ترجمہ چھاپا جائے اور وہی دیا جائے۔کیونکہ اصل متن سے جوڑنے، رجوع کرنے اور استفادہ کرنے میں جو افادیت ہے وہ ترجمہ سے پیدا نہیں ہوسکتی۔

اول: ترجمہ میں معنی و مفہوم میں کمی زیادتی اور سہو کا امکان رہتا ہے جس کی متعدد مثالیں اہل علم کے نالج میں ہیں۔مشہور زمانہ شاہ بانو کیس میں مطلقہ کے نفقہ کے سلسلے میں

سپریم کورٹ کے فاضل جج نے عبداللہ یوسف علی مرحوم کے انگریزی ترجمہ ''متاع'' کے ترجمہ ''مینٹینس'' سے ہی دھوکہ کھایا تھا۔اور اتنی قانونی لڑائی کے بعد اس کی اصلاح ہو سکی تھی۔

دوم: اصل متن اور ترجمہ دونوں موجود ہو تو حسب ضرورت اور حسب توفیق موازانہ کیا جا سکتا ہے اور صحیح نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔جیسا کہ بعض سائنس دانوں کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے۔(موریس بوکا لئے کے اعترافات)

سوم: اصل متن کی اپنی تاثیر ہے جو بہر حال ترجمہ میں نہیں پائی جاتی ہے۔خواہ کوئی عربی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو وہ کلام اللہ کو پڑھ کر اور سن کر اثر ضرور لیتا ہے چنانچہ اس ضمن میں تجربات بھی کئے گئے۔اور مستند واقعات بھی ملتے ہیں۔

''بعض مسلمان ڈاکٹروں نے کوشش کی کہ قرآن کی تاثیر معلوم کریں۔انہوں نے ایک مسلمان کے سامنے قرآن مجید کی کیسٹ بجانا شروع کیا اور اس کے دل پر آلہ رکھ دیا تا کہ دل کی حالت کا اندازہ کیا جائے۔اس سے ان کو اندازہ ہوا کہ تلاوت کے دوران ان کی نبض کی کیفیت تلاوت سے پہلے کی کیفیت سے مختلف تھی۔پھر اسی قسم کا تجربہ چند عیسائیوں پر کیا گیا اس لئے کہ ان کو معلوم تھا کہ مسلمان متاثر ہوتا ہے کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ وہ جو چیز سن رہا ہے وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔یہی تجربہ غیر مسلموں پر کیا گیا۔نتیجہ وہی نکلا جبکہ نصاریٰ نہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ عربی زبان سے واقف ہیں، نہ ان کا قرآن پر ایمان ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم جب قرآن سنتا ہے تو اس کا دل متاثر ضرور ہوتا ہے''۔(۳)

''معروف پیر طریقت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی نے اپنی کتاب ''قرآن عظیم الشان'' میں صفحہ ۷۸ تا ۸۱ پر قاری عبدالباسط صاحب کے دورہ روس کا ایک واقعہ نقل کیا ہے اس سے بھی اس حقیقت پہ روشنی پڑتی ہے: ''ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا، قاری صاحب! آپ اتنا مزے کا قرآن مجید پڑھتے ہیں، آپ نے بھی کبھی قرآن مجید کا کوئی معجزہ دیکھا ہے؟ وہ کہنے لگے، قرآن کا ایک معجزہ؟ معلوم نہیں کہ میں نے قرآن کے سینکڑوں معجزے آنکھوں سے دیکھے ہیں۔انہوں نے کہا، کوئی ایک تو سنا دیجئے۔تو یہ واقعہ انہوں نے خود سنایا۔

قاری صاحب فرمانے لگے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب جمال عبدالناصر مصر کا صدر تھا۔اس نے رشیا (روس) کا سرکاری دورہ کیا۔وہاں پر کمیونسٹ حکومت تھی۔اس وقت کمیونزم کا طوطی بولتا تھا۔دنیا اس سرخ انقلاب سے گھبراتی تھی۔دنیا میں اس کو ریچھ سمجھا جاتا تھا۔آج تو اس سپر پاور کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کی برکت سے صفر پاور بنا دیا ہے،…… جمال عبدالناصر ماسکو پہنچا۔اس نے وہاں جا کر اپنے ملکی امور کے بارے میں کچھ ملاقاتیں کیں۔ ملاقاتوں کے بعد انہوں نے تھوڑا سا وقت تبادلہ خیالات کے لئے رکھا ہوا تھا۔اس وقت وہ آپس میں گپیں مارنے کے لئے بیٹھ گئے۔جب آپس میں گپیں مارنے لگے تو ان کیمونسٹوں نے کہا، جمال عبدالناصر! تم کیا مسلمان بنے پھرتے ہو، تم ہماری سرخ کتاب کو سنبھالو، جو کیمونزم کا بنیادی ماخذ تھا، تم بھی کیمونسٹ بن جاؤ، ہم تمہارے ملک میں ٹیکنالوجی کو روشناس کرادیں گے، تمہارے ملک میں سائنسی ترقی بہت زیادہ ہو جائے گی اور تم دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہو جاؤ گے، اسلام کو چھوڑو اور کیمونزم اپنالو، جمال عبدالناصر نے انہیں اس کا جواب دیا تو سہی مگر دل کو تسلی نہ ہوئی۔اتنے میں وقت ختم ہو گیا اور واپس آ گیا۔مگر دل میں کسک باقی رہ گئی کہ نہیں مجھے اسلام کی حقانیت کو اور بھی زیادہ واضح کرنا چاہیے تھا، جتنا مجھ پر حق بنتا تھا میں اتنا نہیں کر سکا۔دو سال کے بعد جمال عبدالناصر کو ایک مرتبہ پھر رشیا جانے کا موقع ملا۔قاری صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے صدر کی طرف سے لیٹر ملا کہ آپ کو تیاری کرنی ہے اور میرے ساتھ ماسکو جانا ہے۔کہنے لگے کہ میں بڑا حیران ہوا کہ قاری عبدالباسط کی تو ضرورت پڑے سعودی عرب میں، عرب امارات میں، پاکستان میں، جہاں مسلمان بستے ہیں۔ماسکو اور رشیا جہاں خدا بےزار لوگ موجود ہیں، دین بےزار لوگ موجود ہیں وہاں قاری عبدالباسط کی کیا ضرورت پڑ گئی۔خیر تیاری کی اور میں صدر صاحب کے ہمراہ وہاں پہنچا۔

وہاں انہوں نے اپنی میٹنگ مکمل کی۔اس کے بعد تھوڑا سا وقت تبادلہ خیالات کے لئے رکھا ہوا تھا۔فرمانے لگے کہ اس مرتبہ جمال عبدالناصر نے ہمت سے کام لیا اور ان سے کہا کہ یہ میرے ساتھی ہیں جو آپ کے سامنے کچھ پڑھیں گے، آپ سنئے گا۔وہ سمجھ نہ پائے کہ یہ کیا پڑھے گا۔وہ پوچھنے لگے کہ یہ کیا پڑھے گا۔وہ کہنے لگے کہ یہ قرآن پڑھے گا۔ انہوں نے کہا، اچھا پڑھے۔فرمانے لگے کہ مجھے اشارہ ملا اور میں نے پڑھنا شروع کیا۔

سورۃ طٰہٰ کا وہ رکوع پڑھنا شروع کر دیا جسے سن کر کسی دور میں حضرت عمر بن الخطابؓ بھی ایمان لے آئے تھے "طٰـہٰ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی......اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ" فرماتے ہیں کہ میں نے جب دور کوع تلاوت کر کے آنکھ کھولی تو میں نے قرآن کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے کمیونسٹوں میں سے چار یا پانچ آدمی آنسوؤں سے رو رہے تھے۔ جمال عبدالناصر نے پوچھا، جناب! آپ رو کیوں رہے ہیں؟ وہ کہنے لگے ہم تو کچھ نہیں سمجھے کہ آپ کے ساتھی نہ کیا پڑھا ہے مگر پتہ نہیں کہ اس کلام میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ہمارے دل موم ہو گئے، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں، اور ہم کچھ بتا نہیں سکتے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا......؟ سبحان اللہ، جو قرآن کو مانتے نہیں، قرآن کو جانتے نہیں اگر وہ بھی قرآن سنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں بھی تاثیر پیدا کر دیا کرتے ہیں"۔

غیر مسلموں کے قرآن مجید سے استفادہ کی راہ کا سب سے بڑا مسئلہ زبان ہے۔ قرآن عربی زبان میں ہے اور بیشتر غیر مسلموں کی زبان عربی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں دو ہی شکل ممکن ہے یا تو ان کو عربی سکھانے کا نظم کیا جائے تاکہ وہ زبان سے آگاہ ہو کر قرآن پر غور وفکر کر سکیں اور ہدایت یاب ہو سکیں یا پھر قرآن کا ان کی مادری زبانوں میں ترجمہ کیا جائے اور پھر ان تراجم کو ان تک پہنچایا جائے تاکہ وہ قرآن کے پیغام کو سمجھ سکیں۔

جہاں تک غیر مسلموں کو عربی سکھانے کے نظام کا سوال ہے تو ایسی کوئی کوشش میرے علم میں نہیں اور نہ ہی ایسا نظام وضع کرنے کا کوئی منصوبہ کبھی سننے میں آیا ہے۔ ہاں انفرادی کوششوں کے سراغ ملتے ہیں اور جنھوں نے بھی کوشش کی انہیں کامرانیاں ہاتھ لگی ہیں جیسا کہ مشہور نومسلم سائنس داں موریس بوکا لئے کہ انٹرویو سے پتہ چلتا ہے۔ انٹرویو کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے:

سوال: قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتب کے مطالعہ کا اتنا گہرا داعیہ آپ کے اندر کیسے پیدا ہوا اور کیوں کر؟

جواب: فرانس کی زندگی میں عام شہریوں کی طرح میں نے بھی دین اسلام کے متعلق صرف اور صرف یہ جانا کہ دین اسلام محمد ﷺ نامی ایک عبقری اور ذہین ترین شخص کا

گڑھا ہوا دین ہے۔تقریباً پچاس سال تک دین اسلام کے متعلق میرا یہی تصور رہا، پھر اللہ رب ذوالجلال کے فضل وکرم سے میں سرجری کا ڈاکٹر بنا، مریض میرے پاس اتے تو میں ان کے سامنے دین اسلام کا مسیحیت سے موازنہ کرتا۔اس گفتگو اور بحث ومباحثہ کے دوران بعض افراد نے مجھے یہ بتایا کہ دین اسلام سے متعلق میرے یہ خیالات بالکل غلط ہیں۔ ابتداءً تو میں نے ان کو ہی جھٹلایا، لیکن جب بعض افراد نے وقتاً فوقتاً مجھے قرآن مجید کے حقائق اور سنت نبوی ﷺ کے بارے میں بتایا اور بعض دستاویزات دکھائیں تو میں نے اس پر غور وفکر کیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ افراد اپنے دعووں میں حق بجانب ہیں اور میں سراسر غلطی پر ہوں اور میری یہ اغلاط خود ساختہ تھیں۔اس طرح میں نے اخبارات ورسائل، نشریاتی ادارے، ریڈیو، ٹی وی پروگراموں میں دین اسلام کے بارے میں جو کچھ پڑھا، دیکھا اور سنا ان پر قلم پھیر دیا۔اس کے بعد بھی میں حیرت زدہ تھا کہ میں اسلام سے متعلق اپنے افکار، اپنے موقف اور اپنے رویوں میں اعتدال کہاں سے لاؤں اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کیسے کروں؟

سوال: یہ کب کا ذکر ہے؟

جواب: ویٹیکن کی آٹھویں کانفرنس کے بعد ۱۹۲۶ء سے قبل جب کہ فرقہ وارانہ احساس شدت پر تھا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان براہِ راست کسی طرح کی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔

سوال: اس کے بعد آپ کا کیا ردعمل رہا؟

جواب: اس کے بعد میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ میں قرآن مجید کی اصلی زبان کا مطالعہ کرنے کے لئے عربی زبان سیکھوں۔الغرض میں نے عربی سیکھنے کی کوشش شروع کی اور تقریباً دو سال تک بڑی محنت اور شوق سے عربی زبان سیکھنے میں لگا رہا۔بالآخر میں نے عربی زبان پر دسترس حاصل کرلی اور بالآخر باآسانی دینی وعلمی دونوں حیثیت سے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کے قابل ہوگیا۔

اسی انٹرویو میں انہوں نے آگے مزید اظہار خیال کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ''چند دن قبل مجھے چند اہم عیسائی شخصیتوں کے ساتھ ایک عصرانہ دیا گیا۔جس میں انہوں نے اسلام سے متعلق میری تحریرات پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا۔مزید برآں اسلام کے

متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے بعض تفاسیر قرآن کے نام بھی دریافت کئے۔

سوال: آپ نے انہیں کن تفاسیر کا مشورہ دیا؟

جواب: افسوس کہ بات یہ ہے کہ فرانسیسی زبان میں قرآن پاک کی ایسی تفاسیر بہت کم پائی جاتی ہیں جو ان کے حق میں اطمینان بخش ثابت ہوں اور جن سے ان کی مقصد برآوری ہو سکے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم تفسیر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی ہے، لیکن وہ کسی حد تک تشنہ ہے۔ اسی طرح سے حمزاہ ابوبکر کی تفسیر بھی اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن اس میں بھی کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے۔ اس وقت کچھ تفاسیر قارئین کے حق میں تشویشناک ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ تقاضوں کو ملحوظ خاص رکھ کر قرآن مجید کی بہتر سے بہتر تفسیر کی جائے۔ ویسے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید جو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے سب سے پہلے عربی زبان سیکھنی چاہئے۔ کیونکہ بہت سے مفسرین قرآن، قرآن مجید کے تمام مباحث میں مہارت تامہ نہیں رکھتے۔ اس لئے وہ ان مباحث میں لغزش کھا جاتے ہیں وہ قرآن مجید کی ان سو آیات کی تفسیر نہیں کر سکتے جن کا تعلق علم طبیعیات سے ہے۔ صاحب طراز ادیب ہونا بھی قرآن مجید کی تفسیر و توضیح کے لئے کافی نہیں۔

سوال: قرآن مجید کی غلط تفسیر کی کوئی مثال آپ کے ذہن میں ہے؟

جواب: مثلاً "خلق الانسان من علق" مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بہت پیچ و تاپ کھایا ہے، لیکن اس کی صحیح تفسیر ان سے نہ ہوسکی۔ ان مفسرین کے نزدیک "علق" سے مراد دم منجمد ہے۔ حالانکہ یہ تفسیر "علق یعلق" (یعنی خون دیوار رحم سے چپک جاتا ہے) کا صحیح مفہوم ادا نہیں کر رہی ہے۔ اس لئے "علق" کی تفسیر "دم منجمد" سے کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ انسان دم منجمد سے نہیں پیدا ہوا۔ بعینہ عبداللہ یوسف علی سے بھی ان کی انگریزی تفسیر میں ہوئی ہے (عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ قرآن سارے یورپ اور امریکہ کا سب سے مقبول ترجمہ و تفسیر ہے)" (۴)

غیر مسلموں کو واقعی قرآن کے پیغام سے آشنا کرنے کے لئے انہیں عربی زبان سکھانے کا نظام وضع کرنا اور انہیں روبعمل لانا وقت کی ترجیحی دعوتی ضرورت ہے جس پر

قائدین امت اور تحریکات اسلامی کے اکابرین کو سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ نو مسلموں کے تاثرات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام میں سب سے زیادہ دخل قرآن کی تعلیمات کا ہے، اور عموماً ترجموں کی مدد سے قرآن کو سمجھا گیا ہے۔ اگر براہِ راست قرآن سمجھنے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی راہ ہموار کر دی جائے تو قبول اسلام کی رفتار اور تیز ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اس عذر میں زیادہ وزن نہیں کہ عربی سیکھنے کی اہمیت انہیں کیسے سمجھائی جائے؟ اصل چیز یہ ہے کہ قرآن کی انقلابی حیثیت قرآن کے تاریخی انقلاب اور نفع رسانی کی تناظر میں سمجھائی جائے تو یہ کوئی بہت مشکل امر نہیں ہے۔ خلیجی دولت کے حصول کے لئے ہزاروں غیر مسلموں نے عربی سیکھی اور سیکھ سکتے ہیں تو قرآن کی نفع رسانی (جو دنیا و آخرت دونوں سے متعلق ہے) انہیں سمجھا دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عربی سیکھنے کی طرف مائل نہ ہوں اور نہ سیکھ سکھیں۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے پاس ایسا سسٹم موجود ہو جہاں ان کی یہ حاجت پوری ہو سکے۔ ہمیں اس سسٹم کو ڈیولپ کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔ خلیجی دولت کو حاصل کرنے کے لئے تجارتی اور عوامی عربی زبان سکھانے کا نظام بن سکتا ہے تو قرآن کا حیات آفریں پیغام پہنچانے کے لئے آخر ایسا نظام کیوں نہیں بن سکتا ہے؟ فنکشنل عربک کورس کی طرح ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کے ایسے نصاب تیار کرکے مختصر وقت کے کورس چلائے جا سکتے ہیں اور اس سلسلے میں نو مسلموں کو عربی سکھانے کے مختلف شخصی تجربات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جو بہر حال مختلف جگہوں پر ہوتے رہے ہیں مثلاً جامعۃ الفلاح، درس گاہ اسلامی رامپور، جامعۃ دارالسلام عمر آباد، ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہر غیر مسلم عربی سیکھنے کا جوکھم نہیں لے سکتا۔ لیکن جو لے گا وہ ہمارے لئے قیمتی سرمایہ بن سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس سمت میں پیش رفت کرنی چاہیے۔ "خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا" (۵)۔

قرآن مجید سے استفادہ کے سلسلے میں غیر مسلموں کے عربی نہ جاننے کے مسئلہ کا جو دوسرا متبادل ہے وہ ترجمہ قرآن کی اشاعت اور ترسیل عوامی نقطہ نظر سے یہ انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ عوام اپنی مادری زبان نہیں سیکھ پاتے تو عربی بھلا کیسے سیکھ پائیں گی۔ لہٰذا انہیں ان کی مادری زبان میں مترجم قرآن پہنچانا ہی مسئلہ کا حل ہے۔ اس کی اہمیت کے اعتراف

کے باوجود امت کا تاریخی ریکارڈ اس سلسلے میں اطمینان بخش نہیں ہے۔ دنیا میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ہر زبان میں قرآن کا ترجمہ مہیا نہیں ہے۔ عالمی ریکارڈ تو ایک مشکل کام ہے حالانکہ وہ بھی تیار کیا جانا چاہئے۔ میں سمجھنے کے لئے صرف ملک کی ریاستی زبانوں کی بات کرتا ہوں۔ ہزاروں سال سے ہم اس ملک میں رہ رہے ہیں لیکن ملک کی ہر ریاست کی زبان میں قرآن کا ترجمہ موجود نہیں ہے۔ ابھی صرف ۱۸ر زبانوں میں ترجمہ ہو سکا ہے جبکہ ۴ر ریاستی زبانوں میں ترجمہ ابھی باقی ہے۔ کیا خیر امت قرار پانے اور نفرت کو پاٹنے کے لئے اس محاذ پر توجہ دینا وقت کی اہم ضرورت نہیں ہے؟ نیز کیا یہ محاذ ایسے ہیں جن کے لئے وسائل مسدود ہیں؟ نہیں ہر گز نہیں۔ اصل مسئلہ توجہ کا ہے؟ ''ادارہ علوم القرآن علی گڑھ'' اور ''ادارہ دعوت القرآن'' ممبئی جیسے ادارے اگر اسے اپنی منصوبہ بندی اور سرگرمی کا لازمی جز بنالیں تو چند سالوں میں یہ کام ہو سکتا ہے؟ اور بڑے نفع کا کام ہوگا۔

یہاں اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں کو سامنے رکھ کر ترجمہ و تفسیر کا کام کم ہوا ہے۔ مسلمانوں کو سامنے رکھ کر کام زیادہ ہوا ہے۔ اس لئے اس میں وہی رنگ غالب ہے اور غیر مسلموں کے لئے وہ چنداں مفید ثابت نہیں ہوتے بعض کوششیں کی گئیں لیکن یا تو ادھوری یا تشنہ جیسا کہ غیر مسلموں کو سامنے رکھ کر مولانا صدر الدین اصلاحیؒ نے ''تیسیر القرآن'' لکھنا شروع کیا تھا لیکن ''سورۃ البقرہ'' تک ہی لکھی گئی تھی کہ یہ مبارک سلسلہ رک گیا یا مولانا شمس پیرزادہؒ نے ''دعوۃ القرآن'' کے نام سے تفسیر لکھی لیکن تشنگی پھر بھی باقی ہے۔

یہاں اس المیہ کا تذکرہ شاید لوگوں کو کھٹکے لیکن آگاہی اور عبرت کے لئے جاننا ضروری ہے کہ انگریزی کا سب سے پہلا ترجمہ کسی مسلمان نے غیر مسلموں کے لئے نہیں کیا بلکہ ALEXANDER ROSS نامی ایک یہودی نے ۱۶۴۹ء میں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے کیا جیسا کہ اس ترجمہ کے عنوان کی عبارت سے جھلکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"THE ALCORAN OF MAHOMET, TRANSLATED OUT OF ARABIC FOR THE SATISFACTION OF ALL THAT DESIRE TO LOOKING INTO TURKISH VANITES"(۲)

غیر مسلموں کے قرآن مجید سے استفادہ کی راہ میں دوسرا سب سے اہم مسئلہ

اصطلاحات دین کا ہے۔ اہل ایمان کے لئے پس منظر سے آگاہی، اسلامی معاشرت و ماحول اور اہل حق کی صحبت کی وجہ سے اصطلاحات دین کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں رہتا لیکن جو اجنبی ہیں ان کے لئے بڑا مشکل ہے۔ غیر مسلموں میں بہت سی غلط فہمیاں انہیں اصطلاحات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں یا انہیں اصطلاحات کی آڑ میں پیدا کی جاتی ہیں مثلاً جہاد، کافر، جزیہ، نجس وغیرہ اصطلاحات کی آڑ میں نہ جانے کتنی غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں۔ لٰہذا ضرورت ہے کہ ان اصطلاحات کی صحیح تشریحات ان کے سامنے لائی جائیں تاکہ ان کی غلط فہمیاں دور ہوں اور وہ حقیقت آشنا بن سکیں۔

غیر مسلموں کے لئے اصطلاحات کی عام فہم وضاحت کی ضرورت کا احساس مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کو بھی تھا چنانچہ انہوں نے جب غیر مسلموں کو سامنے رکھ کر ترجمہ وتفسیر ''تیسیر القرآن'' لکھنا شروع کیا تو اس کے مقدمہ کے طور پر ایک مختصر کتاب تیار کی جو ''قرآن مجید کا تعارف'' کے نام سے الگ سے مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی ۲۵ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ایک باب انہوں نے اصطلاحات کے تعارف کے لئے بھی مختص کیا تھا۔ لیکن اس میں تمام اصطلاحات کا احاطہ نہیں ہے لٰہذا ضرورت ہے کہ غیر مسلموں کو سامنے رکھ کر اصطلاحات قرآن پر ایک جامع کتاب بھی تیار ہو اور اسے وسیع پیمانے پر غیر مسلموں تک پہنچایا جائے یا مختلف تراجم کے ساتھ قرآن کے شروع یا آخیر میں رموز واوقاف کی طرح جوڑ کر شائع کیا جائے تاکہ حسب ضرورت قاری ان سے استفادہ کرتا رہے۔

غیر مسلموں کے قرآن مجید سے استفادہ کی راہ میں تیسرا اہم مسئلہ وہ اشکالات و اعتراضات ہیں جو ان کے ذہنوں میں اٹھتے ہیں (جیسے وحی و الہام کا اشکال، جہنم میں درخت کی موجودگی اور جانداروں کی زندگی کا اشکال، قتال عن المشرکین، ترک موالات کفار، مکہ معظّمہ میں کفار ومشرکین کے داخلہ پر پابندی) اس سلسلے میں مستشرقین ومشنریز نے سب سے زیادہ گل کھلائے ہیں لیکن ہمارے ملک کے متعصب غیر مسلموں کا رول بھی کچھ کم نہیں ہے۔ دیانند سرسوتی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کا چودھواں باب قرآن پر اعتراضات کے لئے ہی مخصوص ہے۔ اسی طرح گنگا پرشاد اپادھیائے کی کتاب ''مصابیح الاسلام'' میں بھی قرآن اور اس کی تعلیمات کو خاص نشانہ بنایا گیا ہے۔ گرچہ اول الذکر

کتاب کا جواب ''حق پر کاش'' کے نام سے مناظر اسلام مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسریؒ نے دیا ہے اور مؤخر الذکر کتاب کا جواب ''انوار الاسلام'' کے نام سے ابو محمد امام الدین رام نگریؒ نے دیا ہے لیکن پھر بھی آئے دن نئے نئے اشکالات واعتراضات سامنے آتے رہتے ہیں۔ گرچہ اشکال برائے اشکال اور اعتراض برائے اعتراض کا جواب تو نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن جن اشکالات واعتراضات کا جواب اتمام حجت کے لئے ضروری ہے ان کے جوابات کا مسلسل التزام وانتظام ہونا چاہئے۔ قرآنی اسلوب تو یہ ہے کہ جب بھی اس طرح کے سوالات آئے فوراً جواب دیا گیا خواہ ''يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ'' کی شکل میں ہو یا ''يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ'' کی شکل میں۔

انفرادی سطح پر علماء ودانشوران تو کوشش کرتے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن اس طرح کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اجتماعی فورم کا فقدان ہے۔ حالانکہ مشترکہ طور پر جواب کی افادیت وتاثیر زیادہ ہوگی۔ لہٰذا اس کا نظم بھی قائم کیا جانا چاہئے۔

غیر مسلموں کے قرآن سے استفادے کی راہ کا چوتھا مسئلہ ان کے ذہن کے تحفظات ہیں۔ ہر ایک کو اپنی چیز محبوب اور پیاری لگتی ہے۔ اپنا مذہب اچھا اور بہتر لگتا ہے۔ اس لئے وہ جلد اس سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں قرآنی تعلیمات کا ان کی مذہبی تعلیمات سے تقابلی موازنہ اور قرآنی تعلیمات کی فضیلت اور بہتری کا اثبات ہی ان کو ان کے ذہنی تحفظات کے خول سے باہر نکال سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ آسان کام نہیں ہے لیکن اس کے بغیر ذہنی تحفظات کا ازالہ ممکن بھی نہیں ہے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو کھلے ذہن سے سوچتے ہیں اکثر لوگ ''اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ'' کے مصداق ہوتے ہیں۔ ایسے میں غیر مسلموں کے اذہان، ان کے مذاہب اور ان کی تاریخ وروایات کو سامنے رکھ کر اور ان کا تجزیہ کرکے قرآنی تعلیمات کی برتری کا اثبات بڑے دوررس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ انسان چونکہ حال اور ترقیات سے زیادہ مانوس ہوتا ہے لہٰذا جدید سائنسی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اور عقل کو اپیل کرتے ہوئے اگر مباحث سامنے لائے جائیں تو وہ زیادہ مؤثر ہوں گے۔ بالخصوص ان دونوں پہلوؤں طبقاتی نظام اور تصور مساوات کو سامنے رکھتے ہوئے ابھی تک کوئی دعوتی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ ضرورت ہے کہ اس محاذ پر بھی مردانِ کار سامنے آئیں

اور اس فرض کفایہ کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ان دونوں پہلوؤں پر کام کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے درج ذیل مثالوں پر غور کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ملاحظہ فرمائیں:

''آج اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ علم جدید نے یہ بات منکشف کر دی ہے کہ اگر انسان جل جائے اور اس کی جلد آگ سے بری طرح متاثر ہو جائے تو اس سے احساس الم جاتا رہے گا، کیونکہ مرکز احساس انسان کی اوپری جلد ہے جب جلد ہی جل گئی تو احساس بھی نہ رہے گا۔لہٰذا جہنم میں کفار جب ایک بار آگ میں جھلس گئے اور ان کی کھال بالکل جل گئی تو اس کے بعد پھر جتنی بار بھی ان کو آگ سے جلایا جائے گا اور تکلیف پہونچائی جائے گی، موضع احساس ختم ہونے کے بعد نہ انہیں الم ہوگا اور نہ کسی تکلیف کا احساس۔

قرآن پاک نے اس کا جواب ۱۴سو سال قبل دیا ہے اور اس زعم باطل کا رد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا. كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ. اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا'' (النساء:۵٦) جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب جب ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔اللہ بڑی قدرت والا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔

''پروفیسر تگا تا تگاسون'' تھائی لینڈ کی یونیورسٹی آف شینگ مائی (University of Shaing Mai) میں علم الأجنۃ والتشریح کالج (Department of Anotomoy & Embrylogy) کے ہیڈ رہ چکے ہیں۔فی الحال اس یونیورسٹی میں میڈیکل کالج کے ڈین ہیں۔ان کے سامنے قرآن کی وہ آیات رکھی گئیں جو ان کے علمی تخصص ومہارت سے متعلق تھیں تو وہ حیرت زدہ رہ گئے انسانی جلد کے بارے میں پوچھا گیا تو جواب دیا کہ اگر جلد بری طرح جل جائے تو الم وتکلیف کا احساس اس کے بعد مفقود ہو جائے گا۔پروفیسر تگاسون بدھ مذہب کے ماننے والے تھے ان کی دلچسپی قرآن کریم سے بڑھی اور تقریباً تین سال کے گہرے مطالعے کے بعد ان کی شرکت ریاض میں منعقد آٹھویں سعودی میڈیکل کانفرنس میں ہوئی چار دن تک قرآن وحدیث کے علمی اعجاز پر مقالات و

مبحث سننے کے بعد کانفرنس ہی میں اپنے اسلام کا اعلان کیا اور کلمہ شہادت پڑھا۔ تھائی لینڈ واپسی پر قرآنی علمی اعجاز پر انہوں نے چند لکچر دیئے جس کے نتیجے میں ان کے طلبہ میں سے پانچ طالب علموں نے بھی اسلام قبول کیا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقُّ وَ يَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ" (سورہ سبا:٦) جو لوگ علم رکھتے ہیں خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے"۔(۷)

غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد ان پڑھ ہے۔ ان تک قرآن کا پیغام پہنچانے اور ان کے لئے قرآن سے استفادہ کی راہ ہموار کرنے کے لئے دو محاذ پر مزید کام ضروری ہے۔

(۱) جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے سمعی و بصری مواد کی تیاری و ترسیل اس ضمن میں تین کام کئے جاسکتے ہیں:

الف: غیر مسلم ذہن اور ان کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے دروس قرآن کی تیاری اور ان کے سنانے کے لئے مجالس کا اہتمام

ب: روزمرہ کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل کے قرآنی حل پر مبنی مختصر تقریروں کی سیریز

ج: اساسی موضوعات پر آیات قرآنی کے انتخاب اور جدید سائنسی انکشافات سے استفادے اور تفہیم پر مبنی کلپس کی تیاری و تشہیر

اس محاذ پر ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اور ان کے ادارے "اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، ممبئی" و "PEACE T.V." نے کچھ کام اور تجربات کئے ہیں، ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کچھ کام سید حامد محسن صاحب اپنے ادارے "سلام سنٹر بنگلور" کے ذریعہ انجام دے رہے ہیں۔ انہیں بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ "مدھر سندیش سنگم دہلی ٦"، اور "یونیورسل پیس فاؤنڈیشن نئی دہلی ۲۵" کی کاوشوں سے بھی اس سلسلے میں مدد مل سکتی ہے۔

(۲) "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ" کے مصداق دعاۃ و مبلغین کی تیاری جنہیں دیکھ کر، جن کی بات سن کر اور جن سے مل کر قرآن کا عکس غیر مسلموں کے ذہن پر چھا جائے۔ یقیناً یہ پتہ ماری کا کام ہے لیکن اس کے بغیر یہ میدان سر بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی

۱- کتاب الفتاویٰ، از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، جلد ا/صفحہ: ۴۶۰-۴۶۱

۲- احکام و مسائل: از سید احمد عروج قادری، مرتب ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، جلد اول صفحہ: ۶۷، ۶۸۔

۳- سہ ماہی السلام نئی دہلی جلد ۵، شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۸۔

۴- فرانسیسی سائنس داں موریس بوکالئے کا انٹرویو، ترجمہ از حافظ حقانی میاں قادری، ماہنامہ نقش کوکن، اگست ۲۰۱۱ء صفحہ ۲۵-۲۸

۵- کتاب الانبیاء، حدیث نمبر ۳۳۸۳، الجامع الصحیح للبخاری۔

۶- مضمون: ''حالیہ انگریزی تراجم قرآن مجید-ایک تنقیدی جائزہ'' از عبدالرحیم قدوائی (ماہنامہ تہذیب الاخلاق جلد ۳۱ شمارہ ۸، اگست ۲۰۱۳ء صفحہ ۱۸)

۷- (قرآن حکیم اور جدید سائنس مشاہدات کی روشنی میں، از سید محمد انس ندوی، ہدیٰ اسلامک ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۹۸ء فہم قرآن نمبر/صفحہ ۲۲۵-۲۲۶)

بین المذاہب مکالمہ اور قرآن کی رہنمائی

ضمیر الحسن فلاحی

ارباب دانش سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ گلوبلائزیشن (Globolization) کے اس دور میں بین المذاہب مکالمہ (Inter-Faith Dialogue) کی ضرورت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہو چکی ہے، باہمی مکالمہ وہ موثر ذریعہ ہے جس سے کسی مذہب کا داعی، مخاطب کو اپنی طرف بہ آسانی متوجہ کر سکتا ہے، یہ دعوت کا وہ اسلوب ہے جس کے ذریعہ مخاطب کو زیادہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سوچنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ گفتگو کا یہ ایسا انداز ہے جس میں متکلم اور سامع کے مابین براہ راست گفتگو اور تبادلہ خیال ہوتا ہے اور حقائق نکھر کر سامنے آتے ہیں جن کے نتیجے میں یا تو مخاطب مد مقابل کے موقف کو قبول کر لیتا ہے یا پھر دلائل کی بنیاد پر رد کر دیتا ہے یہ مکالمہ افراد کے درمیان بھی ہو سکتا ہے مذاہب اور مسالک کے درمیان بھی۔

موضوع کی اہمیت:

بہ حیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپ ؐ کی امت آخری امت ہے اس لئے امت اجابت ہونے کی حیثیت سے دنیا کے تمام انسانوں تک ان کے خالق کا پیغام پہنچانا ہماری دینی، منصبی اور بنیادی ذمہ داری ہے۔ قرآن و سنت کے متعدد نصوص سے واضح طور پر امت محمدیؐ پر انفرادی و اجتماعی طور پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ شاہان عالم کے نام رحمت عالمؐ کے دعوتی خطوط جہاں معاصر مذاہب اور تہذیبوں کے ساتھ آپؐ کے مکالمہ کی بہترین مثال ہیں وہیں یہ خطوط اس بات کا بھی صریح ثبوت ہیں کہ اسلام اصلاً دین دعوت ہے اور اس کے آفاقی پیغام کو دنیا والوں تک منتقل کرنا امت مسلمہ

کا بنیادی فریضہ ہے، مذاہب عالم میں صرف اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف عالمگیر سطح پر دعوت و تبلیغ کا حکم دیا بلکہ دوسرے مذاہب، تہذیبوں اور اقوام و افراد کے ساتھ باہمی گفتگو و مکالمہ کے باقاعدہ اصول بھی بتائے، اسلام کی یہ ایک ایسی انفرادیت ہے جو اسے تمام الہامی وغیر الہامی مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں: یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو سچائی قبول کرنے کی دعوت دینی چاہئے، دنیا میں پہلی مرتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا، وہ مذہب بھی جو الہامی و تبلیغی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لئے تبلیغ کے اہم اصولوں کی تشریح کی ہے، لیکن صحیفہء محمدیؐ نے نہایت اختصار مگر پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیرؤوں کو بتایا کہ پیغام الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے فرمایا: (ا) اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)

"اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق سے کرو"۔

دعوت و تبلیغ اور مکالمہ وڈائلاگ کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے ہیں حکمت ودانائی، موعظہ حسنہ اور جدال احسن، دعوت و تبلیغ کے یہی تین اصول، منطقی استدلال کے لئے عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں مقدمات کے ذریعہ دعویٰ کے ثبوت میں دلائل فراہم کئے جاتے ہیں۔ دوسرے خطابیات جن میں موثر اور دل پذیر لہجہ سے مقصود کو ثابت کرنے کی سعی کی جاتی ہے اور جدالیات جن میں فریقین کے مسلمہ مقدمات سے استدلال واستنباط کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں پہلے طریق کو حکمت، دوسرے کو موعظت حسنہ اور تیسرے کو جدال بالاحسن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت یہی نہیں ہے کہ قرآن مجید نے اسے مخالفین سے مقابلہ کا وسیلہ بنایا بلکہ متعدد مقامات پر تعلیم و تربیت کے نمونہ کے طور پر بھی اسے پیش کیا ہے، ابراھیم واسماعیل، موسیٰ وہارون، موسیٰ وخضر اور مریم اور ان کے بیٹے (علیھم السلام) کے مکالمے قرآن پاک میں تعلیم و تربیت کے نمونہ کی حیثیت سے ہی مذکور ہوئے ہیں۔

بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت، محیر العقول اور لائق استعجاب اس لئے بھی نہیں ہے کہ یہ اسلوب دعوت، عقل کو مطمئن کرنے کا موثر ترین ذریعہ ہے اور اطمینان، ایمان کی اساس و بنیاد ہے، کسی عقیدہ و مذہب کو اختیار و قبول کرنے کے لئے ذہن و قلب کا اطمینان ناگزیر ہے۔

مکالمہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

مکالمہ کو عربی زبان میں ''حوار'' کہتے ہیں جو ''حور'' سے مشتق ہے اور حوار کے معنی بات چیت کرنے کے ہوتے ہیں۔(۱) امام راغب اصفہانی کے مطابق حوار و محاورہ کا مطلب مراودۃ فی الکلام یعنی گفتگو میں ایک دوسرے کو اپنی طرف مائل کرنا ہوتا ہے، اسی سے تحاور ہے (۲) لسان العرب میں ہے وھم یتحاورون أی یتراجعون الکلام یعنی وہ گفتگو کر رہے ہیں (۳) گویا محاورہ کا مطلب مراجعت ہے اور حور کے معنی ہوتے ہیں رجوع کرنا (۴)

لفظ حوار مذکورہ تمام معانی میں قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے، مثلا:

إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّن يَحُورَ (انشقاق/۱۴)۔

اس نے سمجھ رکھا تھا کہ اسے کبھی پلٹنا نہیں ہے۔

امام قرطبی نے اس کا مطلب لکھا ہے ''لن یرجع حیا مبعوثا ''(۵) سورہ مجادلہ میں ہے:

'' قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُکَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا۔''(مجادلہ/۱)

اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے بارے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کرتی جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے۔

تفسیر جلالین اور دیگر تفاسیر میں ''تحاورکما'' کا ترجمہ، تراجعکما، (تم دونوں کی گفتگو) کیا گیا ہے۔(٦) ان تمام استعمالات سے واضح ہوتا ہے کہ حوار کا مطلب دو یا دو سے زائد افراد کا مذاکرہ و مباحثہ (Discussion) ہے اور محاورہ طرفین یا اطراف کے تبادلۂ خیالات (تداول کلام) کا نام ہے۔

حوار کی اصطلاحی تعریف بھی قریب قریب وہی ہے جس کے لئے یہ لفظ لغت

عرب میں استعمال ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ حوار، جانبین کے اس ضروری مباحثہ کو کہتے ہیں جوخصومت سے پاک ہو۔(٦) اسی طرح ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ حوار اس مناقشہ و مباحثہ کا نام ہے جس کا مقصد تصحیح، اظہار حجت، اثبات حق، دفع شبہات اور فساد رائے کی تردید ہو۔(٧) ایک اور تعریف کے بموجب کسی متعین موضوع پر دو اشخاص کی گفتگو جس کا مقصود، تلاش حق یا کم از کم ممکنہ حد تک نظریات کا تطابق ہو، جسے تعصب و تنگ نظری سے کوئی واسطہ نہ ہو اور جس کا تمام تر انحصار علم و عقل پر ہو، حوار کہلاتی ہے۔(٨)

مذکورہ بالا تعریفوں سے پتہ چلتا ہے کہ حوار و محاورہ تجاذب کلام یعنی دو مختلف الخیال افراد کا کلام میں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے اور مائل کرنے کو کہتے ہیں۔

بین المذاہب مکالمہ اور قرآن کی رہنمائی:

حوار و مذاکرہ کو نتیجہ خیز اور مفید بنانے کے لئے قرآن پاک نے کچھ اصول و آداب دیئے ہیں جن کے التزام کے بغیر کوئی مذاکرہ سود مند نہیں ہوتا، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حوار اس تبادلۂ خیال کو کہتے ہیں جو قرآن کے وضع کردہ اُصول و آداب کے مطابق ہو۔

قرآن مجید کی متعدد آیات میں تعمیری اور مثبت مکالمہ کی ترغیب دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ مکالمہ یعنی باہمی گفتگو کے ذریعہ حق کی گواہی دو کیونکہ ابہام و شبہات کے ازالہ کی کوشش دعوت حق کے مراحل کا ایک اہم مرحلہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ (آل عمران/٦٤)

اے نبی ﷺ! کہہ دو: اے اہل کتاب آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔

بین المذاہب مکالمہ کے حوالے سے قرآن مجید کی ایک اہم ترین رہنمائی یہ ہے کہ اس میں جبر و اکراہ کا شائبہ نہ ہو۔دین اسلام میں مذہب کا اولین جز ایمان ہے اور ایمان، یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں

کرسکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی لوح دل پر یقین کا ایک حرف بھی نقش نہیں کرسکتی ظاہر ہے جو مذہب اپنی ترویج واشاعت کے لئے دعوت و مکالمہ کا اسلوب اختیار کرتا ہو، جس نے اس کے اصول طے کئے ہوں، جو ہر معاملے میں عقل وبصیرت اورفہم وتدبر کا مطالبہ کرتا ہواور ہر قدم پر عقلی استدلال اور حکمت و مصلحت کا لحاظ کرتا ہووہ کیونکر جبرواکراہ ورزوروزبردستی کا راستہ اختیار کرسکتا ہے چنانچہ اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ یہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں ہے فرمایا: لاَ إِكْـرَاهَ فِـيْ الـدِّيْـنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرة/٢٥٦) "دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے الگ ہوچکی ہے"۔

اس عظیم الشان حقیقت کی تلقین سب سے پہلے قرآن پاک اور محمد عربیؐ نے کی۔ ایک جگہ فرمایا: قُـلِ الْـحَـقُّ مِـن رَّبِّـكُـمْ فَـمَـن شَـاء فَـلْيُـؤْمِـن وَمَـن شَـاء فَـلْيَكْفُر (الكهف/ ٢٩) اے نبیؐ! کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جس کا جی چاہے قبول کرے اور جس کا جی چاہے انکار کرے۔

وَلَوْ شَاء رَبُّكَ لآمَنَ مَن فِي الأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعاً أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِينَ(يونس/٩٩) "اگر تیرا رب چاہتا تو زمین کے سارے لوگ ایمان لے آتے تو کیا آپ اے پیغمبر لوگوں سے زبردستی کریں گے کہ وہ ایمان لے آئیں"۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے لڑنے کی اجازت دی گئی ہے اور آنحضرت کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا ہے، اس سے یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، صحیح نہیں ہے، قرآن مجید کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم دیا گیا ہو اور تاریخ اسلام میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے کسی کافر کو بزور مسلمان بنانا ثابت ہوتا ہو بلکہ اگر ہے تو یہ ہے کہ "وَإِنْ أَحَـدٌ مِّـنَ الْـمُشْـرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلاَمَ اللّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لاَّ يَعْلَمُون (توبة/ ٦)

"یعنی اگر مشرک تم سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اسے امن کی جگہ پہنچا دو کیونکہ یہ بے علم لوگ ہیں"۔

ظاہر ہے جو مشرک کلام الٰہی سن کر اور غور وفکر کے بعد مسلمان ہوگا اس کے تبدیلی مذہب کا محرک تلوار نہیں ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام مذہب کی جبری اشاعت کی اجازت نہیں دیتا لیکن ساتھ ہی وہ اس کا بھی روادار نہیں ہے کہ ایک شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد بھی جو اس کے جی میں آئے کرتا پھرے اور اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو بلکہ وہ مجبور کرتا ہے کہ وہ اسلام کے حدود وقیود کی پابندی کرے۔ لادینی نظاموں میں تو مذہب نجی زندگی سے متعلق ہوتا ہے اس لئے حکومت کی نافرمانیوں پر تو سزائیں اور تعزیرات ہیں مگر خدائی قانون سے بغاوت کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اسلام میں مذہب پرائیویٹ زندگی سے مخصوص ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے اور اسلامی حکومت دراصل خدا ہی کی حکومت ہوتی ہے اس وجہ سے اس میں خدا کی نافرمانی قابل گرفت ہوتی ہے۔ ارتداد بھی اسی طرح کا ایک جرم ہے بلکہ انتہائی سنگین جرم ہے اور اسلامی نظام میں اس پر جو سزا دی جاتی ہے وہ اس بات پر نہیں دی جاتی کہ ایک شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس بات پر دی جاتی ہے کہ اس نے خدا کی حکومت اور اس کے قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ اسی طرح کسی قوم کے اندر مجرد کفر کا وجود اس امر کے لئے وجہ جواز نہیں ہے کہ علمبرداران اسلام ان کے خلاف جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور بزور تلوار ان کو قبول اسلام پر مجبور کریں بلکہ اہل کفر اپنے کفر پر رہتے ہوئے اسلامی حکومت کی رعایا بن کر رہ سکتے ہیں اور اسلام ان کے تحفظ کی ذمہ داری لیتا ہے۔

مکالمہ کے چند آداب حسب ذیل ہیں:

۱- دین کی اصل ایک ہے

سب سے پہلا اصول اس بات پر ایمان ہے کہ دین کی اصل ایک ہے، اللہ تعالیٰ نے جو دین نازل فرمایا اور جس کی اقامت پر انبیاء علیہم السلام کو مامور کیا وہ ایک ہی تھا، الگ الگ اور مختلف نہیں تھا، ارشاد ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلآئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ (بقرہ/۲۸۵)

رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی اور جو اہل ایمان ہیں وہ بھی اس ہدایت کو تسلیم کرتے ہیں، یہ سب اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''ہم اللہ کے رسولوں میں تفریق نہیں کرتے۔

گویا تمام انبیاء کی رسالتوں پر ایمان، عقیدہ اسلامی کا لازمہ ہے اور اس کے بغیر کسی کا قبول اسلام معتبر نہیں ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہی ایمان دوسروں سے تعامل کی اساس و بنیاد ہے۔ ارشاد ہے:

قُولُوا آمَنَّا بِاللّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالأسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ (بقرہ/۱۳۶)

(کہو، ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئی تھی، جو موسیٰ عیسیٰ اور دوسرے تمام نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی تھی، ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔)

لہٰذا دوسروں سے گفتگو میں اس اصول کو سامنے رکھنا کہ تمام سماوی ادیان اپنے اصولوں اور دعوت خیر و عدل میں یکساں و ایک ہیں، اختلاف صرف جزئیات میں ہے جو فطرت انسانی اور امتداد زمانہ کا تقاضہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحاً وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ (شوریٰ/۱۳)

ہم نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا ہے جس کی تاکید نوح کو کی تھی اور اب جس کی وحی ہم تمہاری طرف کر رہے ہیں اور اسی کی تاکید ہم نے ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ کو بھی کی تھی۔

آیت کریمہ سے دو نقطے خاص طور سے نمایاں ہوتے ہیں۔

اول: یہ کہ متکلم (داعی) انبیائے سابقین کی رسالتوں کا اقراری ہے اور وہ مانتا ہے کہ ان سب کی اصل یہ ہے کہ یہ منزل من اللہ ہیں:

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ

وَالإِنجِيلَ. مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ (آل عمران/۳-۴)

اس نے تم پر یہ کتاب اتاری جو حق لیکر آئی ہے اور ان کتابوں کی مصداق ہے جو پہلے سے موجود ہیں۔ اس سے قبل وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے توراۃ وانجیل نازل کر چکا ہے اور اب اس نے یہ کسوٹی اتاری ہے۔

مذکورہ آیت نے واضح کر دیا کہ دین کی اصل ایک ہے اور حق بھی ایک ہے جو توراۃ وانجیل میں تحریف وتبدیل سے پہلے نازل ہوا تھا، اسی لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن مجید "بالحق" اور سابقہ کتابوں کا "مصدق" یعنی مصداق بنا کر نازل کیا ہے اور ان تمام کتب الٰہی کی غایت ومقصد ایک ہے اور وہ ہے "ہدی للناس" اور قرآن پاک وہ فرمان ہے جو سابقہ کتابوں کے حق اور بعد کی تحریفات میں فرق کرنے والا ہے۔

دوم: دوسرا نقطہ دین حق کی اقامت اور گذشتہ کتب کو تحریفات سے ان اسس و مبادی کی روشنی میں پاک کرنا ہے جن پر تمام ادیان متفق ہیں اور جن پر یہ آخری کتاب قرآن مجید مشتمل ہے یعنی توحید، دعوت خیر وعدل اور مکارم اخلاق وغیرہ، گویا قرآن پاک ان سابقہ کتابوں کے لیے قیم ومہیمن (نگہبان) کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲- مشترک ومسلم نقطہ پر ارتکاز

مکالمہ کا دوسرا اصول (ادب) یہ ہے کہ گفتگو اس نقطہ سے شروع ہو جو ہمارے اور مخاطب کے درمیان مشترک ومسلم ہے جیسا کہ سورہ آل عمران (۶۴) میں نبی ﷺ کو اہل کتاب کو بندگئ رب کی دعوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس امر میں کسے شبہ ہوسکتا ہے کہ مشترک اقدار کی تعیین وتحدید اختلاف ونزاع کا بہترین حل اور علاج ہے، اس سے فریقین کے درمیان فاصلے کم ہوتے اور نزدیکیاں بڑھتی ہیں نیز ایک دوسرے کو سمجھنے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے راستے ہموار ہوتے ہیں۔

الکلمۃ السواء جس کا ذکر اور جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے اس کی تفسیر یہ ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن میں سابقہ کتب اور گذشتہ انبیاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے (۹) اور یہ بنیاد، غیر اللہ کی عدم پرستش، شرک سے کلی اجتناب اور معصیت میں کسی فرد بشر کی عدم

اطاعت ہے۔(۱۰) تمام انسانیت اس کلمہ سواء پر جمع ہو سکتی ہے اور یہ کہ کوئی کسی سے اعلیٰ اور کوئی کسی کا آقا نہیں ہے اور یہی عدل ہے۔(۱۱) دعوت حق کا آغاز جب مشترک بنیادوں سے ہو تو ایسی دعوت مرفوض (Reject) نہیں ہوتی (۱۲)۔

مذکورہ آیت، مکالمہ بین المذاہب کی نہایت محکم اساس ہے اس میں اہل اسلام اور اہل کتاب کو ایسے کلمہ کو اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے جو دونوں کے یہاں متفق علیہ ہے، کسی ایک کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ مکالمہ میں اس اسلوب واصول کا اہتمام ہونا چاہیئے۔

۳- گذشتہ کتابوں کے مقابلہ میں قرآن کی حیثیت

باہمی گفتگو یا مکالمہ کا تیسرا اصول وادب اس بات پر پختہ ایمان ہے کہ قرآن مجید تمام کتب سابقہ پر مہیمن ہے یہ ایمان وایقان ہی دراصل اسلامی عقیدہ کی روح اور جان ہے کیونکہ قرآن پاک اللہ کی طرف سے انسانی ہدایت کا آخری وکامل صحیفہ ہے۔ ارشاد ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ (مائدہ/ ۴۸)۔

ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب برحق بھیجی ہے جو الکتاب میں سے جو کچھ اس سے پہلے سے موجود ہے اس کی مصداق اور محافظ ونگہبان ہے لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون (ہدایت نامہ) کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

معلوم یہ ہوا کہ قرآن پاک کی تنزیل بالحق ہوئی ہے، اس میں جھوٹ کا شائبہ نہیں ہے اور یہ گذشتہ 'الکتاب'' کی مصدق وامین، شہید وشاہد، رقیب اور حاکم ومحافظ ہے (۱۳)، اس سے یہ راز بھی منکشف ہوا کہ قرآن اور وہ تمام کتابیں جو مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں، سب کی سب فی الحقیقت ایک ہی کتاب ہیں، ایک ہی ان کا مصنف ہے، ایک ہی مدعا ومقصد ہے، ایک ہی تعلیم اور ایک ہی علم ان سب کے ذریعہ نوع انسانی کو عطا کیا گیا ہے۔(۱۴)۔

لفظ مہیمن کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ دیگر مفسرین کے اقوال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ سارے اقوال قریب المعانی ہیں اور مہیمن ان سب معانی پر متضمن ہے یعنی

یہ کہ قرآن اپنی ماقبل کتابوں پر امین، شاہد اور حاکم سب کچھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس محکم کتاب میں ماقبل کتابوں کے محاسن بھی جمع کر دیئے ہیں اور جو ان میں نہیں ہے اسکو بھی بیان کردیا ہے (۱۵) لہٰذا متکلم (داعی) کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس بات کا التزام و اہتمام کرے کہ اسے کیا قبول کرنا ہے اور کسے رد کرنا ہے اور اس سلسلہ میں کسوٹی قرآن پاک ہو کہ قرآن گذشتہ کتابوں کی تصدیق وتوثیق بھی ہے اور خلاف حق باتوں کا ابطال بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مکالمہ کے دوران اس حقیقت کا شعور وادراک ہی انسان کو افراط وتفریط اور ہر طرح کی لغزشوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ قرآن پاک چونکہ دین اللہ کا آخری و مکمل ایڈیشن ہے اس لئے عقیدہ، شریعت، نظام ومنہج اور ہر اُمر میں اسی کی طرف رجوع کرنا اور ہر اختلاف ونزاع کو اسی کی کسوٹی پر پرکھنا، اس کا حق اور صرف اسی کا حق ہے، جس رائے و خیال کی سند اس آخری وسماوی مرجع میں نہ ہو وہ بے وقعت و بے قیمت ہے (۱۶)۔

(۴) مکالمہ کے دائرہ کار کی معرفت

مکالمہ کا ایک قرآنی اصول یہ بھی ہے کہ گفتگو کا موضوع دین کی مسلمات نہ ہوں، اس لئے کہ وہ امور جن پر غور وتدبر کی اسلام (قرآن) اجازت نہیں دیتا اور جو سب کے نزدیک مسلّم و تسلیم شدہ ہیں، فی الواقع ان پر گفتگو کا کوئی حاصل بھی نہیں ہے، قرآن پاک کا واضح حکم ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْراً أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب / ۳۶)

(کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے تو انہیں اپنے اس امر میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

مثال کے طور پر اللہ کی ذات ان امور میں سے ہے جن پر بحث ومباحثہ کی قرآن مجید اجازت نہیں دیتا کیونکہ علم ومعرفت مکالمہ کی اہم ترین شرط ہے اور ذات الٰہی کے باب میں ہمارا علم ناقص ہے۔

لا تقف مالیس لک به علم. (الاسراء/۳۶)۔ یعنی اس چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔

لہٰذا داعی اسلام کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ربوبیت الٰہ کو موضوع بحث بنائے، عبودیت پر گفتگو کرے، اللہ تعالیٰ کی صفات کمال پر بحث کرے، اس کی تنزیہ و تقدیس پر تبادلۂ خیال کرے یا اسی طرح نبی آخرالزماں کی نبوت کو مکالمہ کا موضوع بنائے یا اس بات پر گفتگو کرے کہ قرآن منزل من اللہ ہے کہ نہیں۔

۵- ایمان کے غلبہ پر یقین

پانچواں اصول اس حقیقت پر یقین ہے کہ غلبہ و سربلندی ایمان و مؤمنین کا حق ہے اور پھر اس یقین پر ثبات و استقامت وہ قرآنی اصل ہے جس پر مکالمہ کی بنیاد ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (منافقون/۸) غلبہ اللہ، اس کے رسول اور مؤمنین کا حق ہے

وَلاَ تَهِنُوا وَلاَ تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران/۱۳۹) اور دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مؤمن ہو۔

بندۂ مومن کی گفتگو اس یقین و شعور کے ساتھ ہوتی ہے کہ غلبہ، ایمان اور قوی وہ حق ہے جس پر اس کا یقین و ایمان ہے اور جسے وہ مضبوط پکڑے ہوئے ہے، یہ شعور اسے اطمینان و خوداعتمادی سے بہرہ ور اور جھوٹی کامیابی کے دام فریب میں آنے سے محفوظ رکھتا ہے۔

مسلمان، اسلام کے سرچشمۂ طاقت سے اپنی قوت میں اضافہ کرتا ہے، ایمانی غلبہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان عناد و استکبار میں مبتلا ہو جائے بلکہ اس کا مطلب اللہ کے سامنے سرنگوں ہونا اور دل کا اس کی خشیت سے معمور رہنا ہے، یہ چیز اسے تردد و تذبذب سے محفوظ رکھتی ہے اور پھر وہ اظہار حقیقت میں بالکل بے لاگ ہو جاتا ہے۔

أَفَمَن يَهْدِىُ إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لَّا يَهِدِّىُ إِلَّا أَن يُهْدَى (یونس/۳۵)

جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا اور رہنمائی کا محتاج ہے۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ (یونس/۳۲)

حق کے بعد گمراہی کے سوا باقی ہی کیا رہ گیا۔

اظہار حق میں مومن نبی کریم ﷺ کے اس اسوہ سے تسلی حاصل کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر/۹۴)۔ اے نبی ﷺ: جس کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو۔

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ (آل عمران/۱۸۷)

اوران اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانا ہوگا اور انہیں چھپا کر نہیں رکھنا ہے۔

اس شعور کا فائدہ یہ ہے کہ داعی کسی ابہام و اغماض کے بغیر دین کے حقائق صاف صاف مخاطب کے سامنے پیش کر دیتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ حقائق کا کتمان ایک طرح کی خیانت ہے جس پر اللہ تعالیٰ اس کا مؤاخذہ کرے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَـٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (بقرہ/۱۵۹)

جو لوگ ہماری نازل کردہ روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم انہیں انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (آل عمران/۷۱)

اے اہل کتاب، کیوں حق پر باطل کا رنگ چڑھا کر اسے مشتبہ بناتے ہو؟ اور کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ تبیان حق، مکالمہ کا اہم ہدف اور اس کا اولین مقصد ہے اور اس سلسلہ میں ادنیٰ مداہنت، الباس و تلبیس اور کتمان وتزویر مقاصد و

اہداف مکالمہ کے منافی ہے۔

۶- ترجیحات کا تعین اور ان میں تدریج

مکالمہ کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ گفتگو کا آغاز فروع کے بجائے اصول سے ہو اور بتدریج ہو تا کہ فریقین وقت کے ضیاع سے بچ سکیں۔اس سلسلہ میں اسوہ انبیاء سے روشنی حاصل کرنی چاہئے کہ انہوں نے اپنی قوموں سے جو گفتگو کی، قرآن مجید کی شہادت ہے کہ وہ فروعی وجزوی نہیں تھی بلکہ اصولی وکلی تھی، انہوں نے سب سے پہلے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور اللہ واحد کی بندگی وعبادت کی طرف بلایا کہ سارے امور کی اساس یہی ہے، تمام نبیوں کی دعوت کی بنیاد بلا استثناء :''اعبدو اللہ مالکم من الہ غیرہ''تھی یعنی اللہ کی بندگی بجالاؤ اس کے سوا تمہارا کوئی الہ نہیں۔

نبی آخر الزماںؐ کی اساس دعوت وتعلیم بھی یہی تھی چنانچہ آپ ﷺ نے ابو موسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو یمن کی مہم پر روانہ کرتے ہوئے تاکید کی کہ پہلے انہیں ایک اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دینا، پھر بتدریج اقامت نماز، اداءِ زکوٰۃ اور دیگر احکام کا مطالبہ کرنا۔

یہ نبوی منہاج قرآنی اصول کی واضح تفسیر اور مکالمہ میں حکمت تدریج کا صریح و بین نمونہ ہے۔

۷- دلائل و براہین پر مبنی گفتگو

مکالمہ کا ایک اہم ادب یہ بھی ہے کہ گفتگو دلیل و حجت کی بنیاد پر ہو، اس لئے کہ بے دلیل بات بے وقعت ہوتی ہے اور بے دلیل مکالمہ بے نتیجہ ثابت ہوتا ہے پھر دلیل بھی ایسی جس کی صحت پر مکمل اطمینان اور جس کے نقل پر کامل اعتماد ہو۔قرآن پاک نے اس اصول کا غایت درجہ اہتمام کیا ہے اور بات کے قبول ورد کا معیار دلائل و براہین کو قرار دیا ہے، کوئی بات قبول کی جائے گی تو دلائل کی بنیاد پر اور رد کی جائے گی تب بھی دلائل کی بنیاد پر۔ چنانچہ وہ اپنے نبی ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ کفار ومشرکین سے دلیل کا مطالبہ کرو۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (نمل/۶۴)

کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے دعویٰ کے حق میں دلیل پیش کرو۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ هَذَا ذِكْرُ مَن مَّعِيَ وَذِكْرُ مَن قَبْلِي (انبیاء/۲۴)

اے نبی: ان سے کہو کہ لاؤ اپنی دلیل، یہ کتاب میرے عہد کے لئے بھی نصیحت ہے اور مجھ سے پہلے والوں کے لئے بھی نصیحت تھی۔

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ دعویٰ مثبت ہو خواہ منفی، دلیل بہر حال مطلوب ہے اور ہر بے دلیل بات باطل وغلط ہے۔

قرآن پاک میں برہان، سلطان اور حجۃ کے الفاظ تقریبا ۱۴۳ ربار استعمال ہوئے ہیں اور ان میں سے، بیشتر کا تعلق نبی کریم ﷺ کے کفار کے ساتھ مناظرہ ومکالمہ سے ہے، اس سے آگے بڑھ کر قرآن مجید بار بار مشرکین کو بلا دلیل شرک کے ارتکاب پر زجر وتوبیخ کرتا ہے، ارشاد ہے:

وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهاً آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ (مؤمنون/ ۱۱۷)

اور جو اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود پکارے اس کے پاس اس کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے، اس کا حساب اس کے رب کے ذمہ ہے، ایسے کافر کبھی فلاح یاب نہیں ہوتے۔

کہیں انداز بدل کر ان سے اپنے شرک کے حق میں دلیل کا مطالبہ کرتا ہے اور کہتا ہے:

أَمَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَإِلَهٌ مَّعَ اللَّهِ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (نمل/۶۴)

کون ہے جو خلق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے اور کون تم کو آسمان و زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔

اور کہیں ان کے اس بے دلیل رویہ پر تعجب کا اظہار کرتا ہے۔

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ. أَفَلَا تَذَكَّرُونَ. أَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُّبِينٌ. (صافات/۱۵۴-۵۶)۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم لگا رہے ہو، کیا تمہیں ہوش نہیں ہے؟ کیا تمہارے

پاس کوئی صاف سند ہے۔

ایک سے زائد مقامات پر قرآن مجید نے کفار کو پھٹکار لگائی ہے کہ وہ بے سند و دلیل قرآنی آیات میں کیڑے نکال رہے ہیں۔ مثلاً:

الَّذِيْنَ يُجَادِلُونَ فِيْ آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتاً عِندَ اللَّهِ وَعِندَ الَّذِيْنَ آمَنُوا كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (غافر/۳۵)

جو لوگ بلا دلیل اللہ کی آیات کے سلسلہ میں جھگڑتے ہیں، اللہ و مومنین کو ان کا یہ رویہ انتہائی ناپسند ہے۔ اللہ ایسے متکبر و جابر لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

وہ لوگ جو بے سند و دلیل اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں یہ رویہ اللہ اور مؤمنین کو انتہائی ناپسند ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُونَ فِيْ آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ إِن فِيْ صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُم بِبَالِغِيْهِ (غافر/۵۶)۔

یقیناً وہ لوگ جو کسی سند و حجت کے بغیر اللہ کی آیات میں جھگڑ رہے ہیں، ان کے دلوں میں بڑائی بھری ہوئی ہے مگر وہ اس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں۔

سورہ نجم میں یہاں تک کہہ دیا کہ ان کے یہ عقائد و آراء محض ان کے مفروضے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ قابل رد ہیں۔ فرمایا:

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ (نجم/۲۳)

یہ کچھ نہیں ہیں مگر محض کچھ نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نازل نہیں کی۔

۸- علم (Science) ایمان کا راستہ

توحید کی دلیل اور جملہ امور دینی کا اصل الاصول ہے لہٰذا مکالمہ میں داعی حق کا زیور علم سے آراستہ ہونا ضروری ہے، نبوت محمدیؐ وہ پہلی ربانی آواز ہے جس نے عقل انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا اور بار بار آیات الٰہی میں تدبر و تفکر

کی ہدایت کی۔ قرآن پاک علم و معرفت کو مکالمہ کی اہم شرط قرار دیتا ہے اور ان لوگوں کی شدید مذمت کرتا ہے جو بے علم مجادلہ و مکالمہ کرتے ہیں اور اہل ایمان کو اسلحہ علم سے لیس ہونے کی تاکید کرتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ. (حج/۸)

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی علم و ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔

قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (یوسف/۱۰۸)

کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

۹- اخلاق حسنہ کا التزام:

قرآن مجید کے وضع کردہ اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ داعی حق اخلاق حسنہ سے متصف ہو۔ اخلاق کا دائرہ انتہائی وسیع ہے، موضوع کی مناسبت سے چند اخلاق کے ذکر پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

الف: اسلوب گفتگو:

حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت، جدال و مناظرہ ہو یا مکالمہ بین المذاہب ضرورت ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کیونکہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت پیدا کرتا ہے اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد سلب کر لیتے ہیں۔ اور مخاطب کے اندر اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ دھرمی پیدا کر دیتے ہیں۔ جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالی نے اپنے رسولوں کو اپنے شدید ترین دشمنوں سے بھی نرمی سے باتیں کرنے کی تاکید کی، حضرت موسی اور ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے "اذهبا الی فرعون انه طغى فقولا له قولا لينا لعله يتذكر او يخشى" (طہ:۴۳،۴۴)

بین المذاہب مکالمہ اور دعوت وتبلیغ میں رفق ونرمی اور لطف وتحمل کی اس سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی کہ نہ کوئی داعی پیغمبروں سے بہتر ہوسکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق مکالمہ کی اخلاقیات میں ایک اہم اخلاق یہ ہے کہ مکالمہ کا اسلوب وانداز احسن ہو اور داعی ترشی، قساوت اور تشدد جیسے جذبات سے پاک ہو۔

قرآن پاک کی واضح تعلیم ہے:

ادْعُ إِلِى سَبِيْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (نحل/ ۱۲۵)

اے نبیؐ! اپنے رب کے راستہ کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔

اور اُمر واقعہ یہ ہے کہ نرم، سنجیدہ اور تشدد سے پاک گفتگو ہی دلوں کو فتح اور نفوس کو قبولیت حق پر آمادہ کرتی ہے، قساوت ودرشتی ہمیشہ حق سے دوری کا سبب بنتی ہے، قرآن پاک نے داعی اعظمؐ کی توصیف کرتے ہوئے کہا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظّاً غَلِيْظَ الْقَلْبِ لاَنفَضُّواْ مِنْ حَوْلِکَ (آل عمران/ ۱۵۹)۔

یہ اللہ کا فیضان اور اس کی رحمت ہے کہ تم لوگوں کے لئے نہایت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، اگر تم تندخو وسنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد وپیش سے چھٹ جاتے۔

رسالت محمدی ﷺ کی کامیابی اور انسانی قلوب پر حکمرانی کی شاہ کلید یہی اعلیٰ اخلاق تھے، آپ ﷺ چونکہ انسانیت کے اسوہ کاملہ ہیں اس لئے اس وصف کا اہتمام والتزام ہر داعی کی ضرورت ہے، انسان کو ہمیشہ تشدد، تعصب اور ترش کلامی وغیرہ سے اجتناب کرنا چاہئے، ایک جگہ اہل ایمان کو اہل کتاب سے مناظرہ کے سلسلہ میں صریح طور پر حکم دیا:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ (عنکبوت/ ۴۶)

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں۔

ب:　دوسرا وصف

جس سے داعی کو متصف ہونا چاہئے وہ صبر و تحمل ہے، صبر و تحمل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کینہ، غضب اور اشتعال وغیرہ سے دور رہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو عفو و درگذر سے کام لینے کی بار بار تاکید کی ہے۔

خذ العفو و أمر بالعرف و أعرض عن الجاهلين. (اعراف/۱۹۹)

یعنی نرمی و درگذر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کرو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلاً بَلِيغاً (سورہ النساء ۶۳) ان سے درگزر کرو، ان کو نصیحت کرو، اور ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں پر اثر کرے۔

اس آیت میں تین ہدایتیں ہیں اول یہ کہ مخاطب کی بدسلیقگی و بدتہذیبی اور درشتی سے درگزر اور ان کو برداشت کیا جائے، دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کی جائے اور دل سوزی کیساتھ سمجھایا جائے اور تیسری یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز و انداز اختیار کیا جائے جو دل پذیر ہو۔

ج:　شفقت و محبت:

مکالمہ کا ایک اور اخلاق یہ ہے کہ داعی غلبہ حق کا حریص اور مخاطب پر بے حد شفیق و مہربان ہو کیونکہ داعی کہتے ہی اسکو ہیں جو دوسروں کی ہدایت کا طالب ہوتا ہے اس لئے اس کی گفتگو انتقام، حسد و کینہ اور عداوت و دشمنی کے سفلی جذبات سے پاک ہونا چاہئے کہ محبت فاتح عالم ہوتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ انسانوں کے لئے بے پناہ شفیق تھے، آپ کی شفقت و محبت اور نرمی کا ذکر قرآن پاک ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم .... (توبہ/ ۱۲۸)

لوگو: تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر گراں گذرتا ہے، تمہاری فلاح کا حریص ہے۔

آنحضرتؐ نے صحابہ کے سامنے اور حضرات صحابہ نے عام انسانوں کے سامنے دین الٰہی کو اسی اصول کے مطابق پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کی دل نواز صداؤں کو مہر ومحبت کے ساتھ پیش کرنا ہیبت وجلال کے ساتھ پیش کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

د: برائی کا جواب بھلائی:

اخلاق حسنہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ شدت کا مقابلہ، رافت ورحمت، فحش کلامی کا جواب کلام طیب، جارحیت کا رد نرمی ولطافت اور تحقیر آمیز سلوک کا بدلہ احترام کی صورت میں دیا جائے اور اس قرآنی ہدایت کو ہمیشہ سامنے رکھا جائے کہ:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (فصلت/۳۴)

اچھائی اور برائی یکساں نہیں ہیں، تم بدی کو اس اچھائی سے دفاع کرو جو بہترین ہو تو تم دیکھو گے کہ تمہارے شدید ترین دشمن، جگری دوست بن جائیں گے۔

لیکن ایسا اسی وقت ممکن ہے جب داعی، صبر، حلم اور تحمل کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔

۱۰- عدل وانصاف

اسلام دین عدل ہے وہ اپنے ماننے والوں کو ہر معاملہ میں عدل وانصاف پر قائم رہنے کی تاکید کرتا ہے کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (مائدہ/۸)

عدل سے کام لو کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى (نحل/۹۰)

اللہ عدل، احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔

لہٰذا داعی اسلام کے لئے جائز ودرست نہیں ہے کہ وہ کبھی بھی جادۂ عدل سے منحرف ہو، اسے بہر صورت، دوست ودشمن سب کے معاملہ میں عدل وانصاف پر قائم رہنا ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا (مائدہ/۸)

اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔

۱۱-　کلام طیب اور قول حسن:

کلام، متکلم کا لازمی وصف ہے اس لئے ضروری ہے کہ مکالمہ کی زبان طیب اور الفاظ شیریں ہوں، کلام طیب نغمہ روحانی ہے جو دلوں کو جوڑ کر انہیں مودت و محبت سے بھر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک بار بار قول حسن اور کلام طیب پر زور دیتا ہے۔

وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُواْ الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلإِنْسَانِ عَدُوّاً مُّبِيناً (اسراء/۵۳)

اے نبی! میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالیں جو بہترین (احسن) ہو کیونکہ شیطان انسانوں کے درمیان فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو حکم دے رہا ہے کہ وہ مؤمن بندوں کو تاکید کردیں کہ وہ اپنی گفتگو میں اچھی وصاف ستھری زبان استعمال کریں، اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو شیطان ان کے درمیان در آئے گا اور شر وفساد پیدا کرے گا کیونکہ وہ آدم واولاد آدم کا ازلی دشمن ہے اور اس کی دشمنی طشت از بام ہے۔

۱۲-　حسن استماع:

اسلام خاموشی کی فضیلت پر زور دیتا ہے اور مسلمانوں کو تعلیم دیتا ہے کہ بہت سے مواقع پر خاموش رہنا، بولنے سے بہتر ہوتا ہے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''من صمت نجا'' یعنی جس نے خاموشی اختیار کی وہ کامیاب ہوگیا۔ (۲۰)

حضرت ابودرداء سے منقول ہے: "انصف اذ نیک من فیک فانما جعل لک اذنان اثنتان وفم واحد، فاسمع اکثر مما تقول" ۔(۲۱) یعنی اپنے کانوں کیساتھ انصاف کا معاملہ کرو کیوں کہ تمہیں کان دو دیے گئے ہیں اور منھ ایک، اس لئے بولو کم اور سنو زیادہ۔

امام شافعیؒ نے ایک شخص کو جو سکوت کی مذمت کر رہا تھا، جواب دیا:

قالوا سکت و قد خوصمت قلت لھم
ان الجواب لباب الشر مفتاح

والصمت عن جاهل او احمق شرف

و فيه ايضا لصون العرض اصلاح

أما ترى الأسد تخشى وهی صامتة

والكلب يخشى لعمری ؤ هو نباح (۲۲).

ترجمہ: لوگوں نے کہا تم خاموش ہو حالانکہ تم سے جھگڑا کیا جا رہا ہے، میں نے جواب دیا، جواب سے شر کے دروازے کھلتے ہیں، جاہلوں اور احمقوں کے مقابلہ میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے اور اس میں عزت کی حفاظت بھی ہے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ شیر خاموش رہتا ہے مگر سب اس سے ڈرتے ہیں اور کتا ہمیشہ خوف کی حالت میں رہتا ہے باوجود یکہ وہ ہر وقت بھونکتا رہتا ہے۔

خاموشی کا مطلب شرودذہنی یا عدم فاعلیت نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد استحضار ذہن وعقل ہے تا کہ مخاطب کی بات کو صحیح طور سے سنا اور سمجھا جا سکے، قرآن مجید ان دونوں کو لازم و ملزوم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

اذا قرئ القرآن فاستمعوا له و أنصتوا (اعراف/۱۰۴)

جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو۔

یعنی محض سکوت کوئی چیز نہیں ہے بلکہ سکوت اس لئے کہ بات کو غور سے سنا جا سکے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اتقان کلام کے لئے اتقان سماع ناگزیر ہے۔ حسن بن علیؓ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی: یا بنی تعلم حسن الاستماع كما تتعلم حسن الحديث. (۲۳)

قرآن مجید نے اس کی ضرورت کا احساس دلایا ہے:

الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُوْلَئِكَ هُمْ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ (زمر/۱۸)

جو لوگ بات کو بغور سنتے ہیں اور احسن کی پیروی کرتے ہیں، یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت سے سرفراز کیا ہے اور یہی اہل خرد ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسن استماع مکالمہ کی اہم شرط ہے اور انسانی تعلقات کی تعمیر میں اس کا اہم رول ہے، نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں اس اَدب کے شاندار نمونے

ملتے ہیں، آپ ﷺ ہر شخص کی بات کو بغور سنتے تھے، بات کرنے والا مرد ہے کہ عورت، بچہ ہے کہ بوڑھا، غلام ہے کہ آزاد، امیر ہے کہ غریب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اسی سلوک کی بناء پر آپ ﷺ کو وہ رتبہ بلند ملا، ملا جس کو مل گیا۔ دوست تو دوست جانی دشمنوں کے ساتھ بھی آپ کا یہی سلوک ورویہ ہوتا تھا، ایک موقع پر عتبہ بن ربیعہ نے کہا: یا ابن أخي، انک منا حيث قد علمت من السلطة في العشيرة و المكان من النسب وانک قد اتيت قومک بأمر عظيم فرقت به جماعتهم و سفهت به احلامهم و عبت به آلهتهم و كفرت به من مضى من آبائهم، فاسمع مني اعرض عليک و امور لعلک تقبل بعضها، آپ نے فرمایا: قل يا أبا الوليد أسمع، فقال عتبه ما قال، حتى اذا فرغ قال له صلى الله عليه وسلم او قد فرغت؟ قال نعم: فاسمع مني، قال: افعل فاخذ رسول الله ﷺ يتلو عليهمن سورة فصلت.... پھر آپ نے سورہ فصلت کی تلاوت شروع کی یہاں تک کہ آیت سجدہ تلاوت کی اور سجدہ کیا اور کہا: فأنت وذاک، عتبہ اٹھا اور اپنی قوم کی طرف چل دیا، لوگوں نے دور سے آتا دیکھ کر کہا: اللہ کی قسم، یہ وہ عتبہ نہیں ہے جو ہمارے پاس سے گیا تھا، قوم کے پاس جا کر عتبہ نے درخواست کی کہ محمد کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔

مذکورہ واقعہ میں آداب مکالمہ کے بڑے دروس ہیں، آپ ﷺ صرف خاموش ہی نہیں رہے، بلکہ اس کی باتوں کو بغور سنا پھر مزید موقع دیا کہ اگر کچھ اور کہنا ہے تو وہ بھی کہہ لو، کچھ اضافہ کرنا چاہو تو کرلو۔ الغرض حسن استماع دعوت کی راہ کا اہم ادب ہے جس کا لحاظ کر کے مخاطب کو اپنا گرویدہ بنایا جا سکتا ہے۔

۱۳- تواضع:

تواضع وانکساری مکالمہ کا اہم اصول وأدب ہے، آدمی کا اپنی، اپنی اولاد، اپنے کارنامے اور اپنا حسب ونسب بیان کرنا، سامع پر گراں گذرتا ہے اور وہ اس سے قریب آنے کی بجائے دور بھاگتا ہے۔ قرآن مجید نے اس انسانی اور نفسیات کی رعایت کی ہے فرمایا:

فلا تزكوا انفسكم هو أعلم بمن اتقى (نجم/۳۲)
یعنی تم اپنی پاکی نہ جتاؤ، وہ خوب جانتا ہے کہ متقی کون ہے۔
نبی آخر ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ان الله اوحیٰ إلی ان تواضعوا حتی لا یفخر أحد علیٰ أحد، ولا یبغی أحد علی أحد (۲۵)۔

اس کے علاوہ فطرت انسانی بھی کسی مغرور شخص کو پسند نہیں کرتی اور ایسے شخص کو جاہل ونادان گردانتی ہے جس کی گفتگو اپنے محاسن وکمالات پر مشتمل ہوتی ہے، اپنی تعریف اکثر اپنی شخصیت کے نقص کی دلیل ہوتی ہے، انسانی کمالات اظہار واعلان کے محتاج نہیں ہوتے اس لئے خواہ مخواہ مخاطب کو گراں بار کرنا عقل ودانش اور حکمت دعوت کے خلاف ہے۔

۱۴- محبت وتکریم:

اسلام، تکریم انسانیت کا پہلا معلم ہے اس لئے وہ اپنے پیروؤں کو تاکید کرتا ہے کہ گفتگو ومکالمہ میں ایسا رویہ اختیار کریں جس سے محبت وتکریم کا اظہار ہوتا ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے یا قوم، یا أبت اور یا بنی جیسے پیارے الفاظ سے اپنے مدعو کو مخاطب کیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو خطاب کر کے کہا:

يا فرعون انی رسول رب العالمين. (اعراف/۱۰۴)

سب جانتے ہیں کہ لفظ فرعون یہاں عظمت وسطوت کی علامت (Symbol) کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

محبت وتکریم کا یہی انداز ہمیں نبی آخر الزماں ﷺ کی سیرت پاک میں بھی ملتا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے زعماء عرب کے نام جو دعوتی خطوط لکھے ان کا انداز خطاب یہی تھا، مثلاً شاہ روم کو لکھا "إلی هرقل عظيم الروم" (۲۶)۔

موسم حج میں آپ ﷺ مختلف قبائل عرب کے پاس دعوت دین لے کر جاتے اور انہیں اسی طرح کے محترم ومکرم الفاظ سے خطاب فرماتے۔

ظاہر ہے ان الفاظ کے استعمال کا مقصود ان کی عزت افزائی اور اظہار مودت کے سوا اور کیا تھا؟

۱۵- حق کی جستجو:

آخری رہنمائی کے طور پر یہ بات نہیں بھولنا چاہئے کہ قرآن پاک اس مکالمہ کی اجازت ہی نہیں دیتا جس کا مقصد اعلان حق، اقناع مخاطب اور اتمام حجت کے سوا کچھ اور ہو اس لئے داعی حق کو ہمیشہ حق کا حریص اور ہر طرح کی باطل آمیزش سے کنارہ کش رہنا چاہئے کہ حق سے انحراف کسی بھی صورت جائز و درست نہیں ہے۔

یہ چند اصول و آداب ہیں جو مکالمہ کے وقت ہمارے سامنے رہنا چاہئے، اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مراجع ومصادر

۱۔ سیرۃ النبیؐ، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۰۳ء، ۴/ ۲۵۷

۲- زبیدی محمد مرتضی، تاج العروس من جواہر القاموس، دار مکتبہ الحیاۃ، بیروت ۱۳۰۶ھ، ۳/ ۱۶۲، وایضاً۔ احمد بن فارس، معجم مقاییس اللغۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۲۰۰۱ء، ۲/ ۱۱۷)

۳- اصفہانی حسین بن محمد الراغب، المفردات فی غریب القرآن، دار المعرفۃ، بیروت ص ۲۶۲۔

۴- ابن منظور محمد بن مکرم، لسان العرب، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۴/ ۲۱۸۔

۵- قرطبی محمد بن احمد الأنصاری، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتاب العربی، قاہرہ ۱۹/ ۲۷۳۔

۶- ایضاً

۷- جلال الدین محمد بن احمد المحلی وجلال الدین السیوطی، تفسیر الجلالین، دار المعرفہ، بیروت ۱/۲۴۷۔
۸- الندوہ العالمیۃ للشباب الاسلامی، اصول الحوار مطبوعہ ریاض ۱۴۰۸ھ، ص ۹۔
۹- صالح بن عبداللہ بن حمید، اصول الحوار وآدابہ فی الإسلام، دار المنارہ، جدہ ص ۳۔
۱۰- نسفی عبداللہ بن احمد بن محمود، تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التأویل، دار الکتاب العربی بیروت، ۱/۱۶۲۔
۱۱- بیضاوی عبداللہ بن عمر بن محمد، انوار التنزیل وأسرار التأویل، دار احیاء التراث العربی، ۱/۶۳۵۔
۱۲- طبری محمد بن جریر، جامع البیان عن تأویل آی القرآن، دار معرفۃ، بیروت، ۳/۲۱۳۔
۱۳- سید قطب، فی ظلال القرآن، دار الشروق، بیروت ۱/۴۰۶۔
۱۴- طبری محمد بن جریر، جامع البیان عن تأویل آی القرآن ۶/۳-۷-۲-۱۷۲- وابن کثیر تفسیر القرآن العظیم ۲/۶۵۔
۱۵- مودودی سید ابوالأعلی، ترجمۂ قرآن مع مختصر حواشی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص ۳۲۱، حاشیہ ۳۷۔
۱۶- دمشقی اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار المعرفہ، بیروت ۲/۶۵۔
۱۷- طاہر بن عاشور، التحریر والتنویر، ۶/۲۲۱، وایضاً فی ظلال القرآن، ۲/۹۰۲۔
۱۸- رازی فخر الدین محمد بن عمر، مفاتیح الغیب، طہران ۴/۳۔
۱۹- بقاعی برہان الدین ابراہیم بن عمر، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، دار الکتاب الاسلامی، قاہرہ ۲/۱۱۳۔
۲۰- اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۳/۴۶۔
۲۱- ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، کتاب صفۃ القیامہ حدیث ۲۵۰۱۔
۲۲- محمد بن عبدربہ، العقد الفرید، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۲/۳۰۲۔
۲۳- بحوالہ فی اصول الحوار، الندوۃ العالمیہ للشباب الاسلامی، ص ۳۹۔

۲۴- شافعی محمد بن ادریس، دیوان الامام الشافعی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ص ۶۳۔

۲۵- اندلس محمد بن عبدربہ، تأدیب الناشئین بأدب الدنیا والدین، مکتبۃ القرآن، قاہرہ، ص ۲۷۔

۲۶- حمیری عبدالملک بن ہشام، السیرۃ النبویہ، دارالجیل، بیروت ۔۲/۳۱-۱۳۰

۲۷- مسلم، الجامع الصحیح، صفۃ الجنۃ وصفۃ نعیمہا، حدیث ۲۸۶۵۔

۲۸- بخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، بدء الوحی حدیث ص ۷۔

۲۹- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۲/ ۲۷۱، و ایضا محمد بن جریر طبری، تاریخ الأمم و الملوک، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱/ ۵۵۶۔

درس قرآن- اہمیت، ضرورت اور طریقہ کار

زبیر عالم اصلاحی

قرآن کریم اللہ تعالی کی طرف سے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے نازل کی جانے والی آخری کتاب ہے. یہ کتاب کسی قوم، نسل، ارض اور عہد کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کے مخاطب رہتی دنیا تک کے لئے تمام انسان ہیں۔ یہ ایک مکمل دستور حیات ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسانوں کی ذہنی اور عملی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ کتاب ایک وسیع ترین موضوع سے بحث کرتی ہے، جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے، وہ کائنات کی حقیقت، اس کے آغاز وانجام اور اس کے نظم وآئین پر کلام کرتی ہے، وہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوع انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرز زندگی پر اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے کہ اس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ملتی، وہ بتاتی ہے کہ انسان کے لئے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے اور غلط راستے کیا ہیں؟ وہ ایک پورے نظام زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے، جس میں ایمانیات، عبادات ومعاملات، حقوق وفرائض، معاشرت و معیشت، عدل واحسان، امن وسلامتی اور تربیت وتزکیہ، غرض حیات انسانی کے ہر پہلو کے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کیا گیا ہے، اس کا روئے سخن عالمگیر ہے، وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ صحیح راستے کی پیروی کرنے اور غلط راستے پر چلنے کے کیا نتائج اس دنیا میں اور آخرت میں رونما ہونے والے ہیں، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے خود کو کلام اللہ اور کتاب ہدایت بتایا، ارشاد ہے۔

إِنَّ هَـٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْراً كَبِيراً (سورہ بنی اسرائیل:۹)

’’حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔ جو اہل ایمان اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے‘‘۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قَدْ جَاءكُم مِّنَ اللّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ. يَهْدِي بِهِ اللّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلاَمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنِ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ(سورة المائدة: ۱۵ . ۱۶)

’’تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے‘‘

یہ پوری انسانیت کے لئے مجموعہ نصیحت، تمام روحانی امراض کے لئے نسخہ کیمیا اور دنیا کی سب سے عظیم نعمت ہے، ارشاد ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاء لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ. قُلْ بِفَضْلِ اللّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُواْ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ. (سوره یونس: ۵۷)

’’لوگو! تمہارے پاس رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے، یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفاء ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لئے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبی! کہو کہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی، اس پر لوگوں کو خوشی منانی چاہئے، یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جسے لوگ سمیٹ رہے ہیں‘‘۔

اس کتاب الٰہی کی تعلیمات بالکل واضح اور روشن ہیں۔ یہ ایک طرف مرضیات ربانی کی داعی تو دوسری طرف احکام خداوندی کی سرتابی کرنے والوں کو تنبیہ بھی کرتی ہے۔

حم .تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ . كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ. بَشِيراً وَنَذِيراً(سوره فصلت: ۱ . ۴)

’’حم، یہ خدائے رحمان کی طرف سے نازل کردہ ہے، ایک ایسی کتاب ہے جس

کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں ،عربی زبان کا قرآن ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں بشارت دینے والا ڈرانے والا''۔

اس کتاب کے کلام الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آج تک اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جا سکی۔

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُواْ بِمِثْلِ هَـذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (سورہ بنی اسرائیل: ۸۸)

''کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں''۔

رسول اکرم ﷺ نے بھی قرآن اور حاملین قرآن کے اوصاف موقع بہ موقع تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

ألا انها ستكون فتنة فقلت ما المخرج منها يا رسول الله؟ قال كتاب الله تبارك و تعالىٰ فيه نبأ ما كان قبلكم و خبر ما بعدكم و حكم ما بينكم و هو الفصل ليس با لهزل من تركه من جبار قصمه الله من ابتغى الهدى في غيره اضله الله و هو حبل الله المتين و الذكر الحكيم. [1]

''لوگو! سنو عنقریب ایک فتنہ برپا ہونے والا ہے ،میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس سے نجات کا کیا طریقہ ہے ،آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی کتاب ،اس لئے کہ اس کے اندر تم سے پہلے لوگوں کے احوال کا ذکر ہے ،تمہارے بعد والوں کے لئے خوشخبری ہے ، وہ تمہارے آپس کے اختلاف کا حل و فیصلہ ہے۔ حق و باطل کے درمیان فرق کرتی ہے ،وہ کوئی مذاق نہیں ہے جو کبر و غرور سے اس کو چھوڑیگا اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کر رکھ دیں گے اور جو شخص ہدایت کو قرآن کے علاوہ کسی کتاب میں تلاش کریگا اللہ اس کو گمراہ کر دیں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک مضبوط رسی ہے اور پرحکمت ذکر ہے''۔

قرآن کریم کی عظمت اور فضیلت کا ذکر قرآن و احادیث میں تفصیل سے مذکور ہے ،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم نعمت ہے ،جو مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی کسی قوم

کے پاس نہیں ہے، جس طرح اللہ تعالی کی ذات وصفات تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے، اسی طرح اس کا کلام بھی ہر طرح کے نقائص سے مبرا ہے اور جس طرح اللہ تعالی کی ذات سب سے اعلی وارفع ہے اسی طرح اس کا کلام بھی سب سے افضل و انسب ہے، احادیث سے متبادر ہے کہ متعلمین و معلمین قرآن کو تمام دیگر متعلمین و معلمین پر فوقیت حاصل ہے، حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

ان افضلكم من تعلم القرآن و علمه [۲]

''تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سیکھائے''۔

قرآن مجید کے ساتھ امت مسلمہ کا جو رویہ ہے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثالوں کے ذریعہ نہایت خوبصورت اسلوب میں بیان فرمادیا ہے، ایک حدیث میں مذکور ہے کہ جو صاحب ایمان نہ تو قرآن پڑھتا ہے اور نہ ہی اس پر عمل کرتا ہے اس کی مثال ایسے پھل کی سی ہے جس میں نہ خوشبو ہے نہ ذائقہ، جو صاحب ایمان قرآن پڑھتا ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا، اس کی مثال خوشبودار پھل کی سی ہے جس میں ذائقہ بالکل نہیں ہوتا، جو شخص قرآن پڑھتا بھی ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے اس کی مثال اس پھل کی سی ہے جس میں خوشبو بھی ہے اور ذائقہ بھی۔[۳]

افسوس کہ آج امت اسلامیہ کا ایک بڑا طبقہ قرآن کریم سے محض تلاوت کی حد تک جڑا ہے، اس کے مطالبات کے اپنانے کا دور دور تک واسطہ نہیں، وہ اسے اپنی زندگی میں رائج کرنے کے تمنائی نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس گروہ کے افعال سے ڈرایا تھا، ارشاد نبوی ہے:

يخرج فى هذه الامة قوم تحقرون صلاتكم مع صلا تهم، يقرؤن القرآن لا يجاوز حلوقهم او حناجرهم يمرقون من الدين مروق السهم من الرمية. [۴]

''اس امت میں کچھ افراد ایسے ظاہر ہوں گے جن کی نمازوں کے سامنے تم اپنی نمازوں کو حقیر سمجھو گے، لیکن وہ قرآن کریم کی قرات کریں گے تو قرآن ان کے حلق سے نہیں اترے گا (یا فرمایا) ان کے گلے سے نہیں اترے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر اپنے نشانے کو چیرتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا ہے''۔

قرآن کریم کا اپنے ماننے والوں سے ایک مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیت اور

استطاعت کے مطابق قرآن کی دعوت سارے انسانوں تک پہنچائیں کیوں کہ قرآن کا پیغام سارے انسانوں اور اس کی ہدایت تمام لوگوں کے لئے ہے، ارشاد ربانی ہے:

"هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ" (سورہ البقرہ: ۱۸۵)

اللہ تعالی نے اپنے رسول کو انتہائی تاکید کے ساتھ حکم دیا ہے کہ

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالته (المائدہ:۶۷)

"اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، اس کو اچھی طرح پہنچادو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تم نے اس پیغام کو نہیں پہنچایا"۔

نبی کریم ﷺ قرآن کے پیغام کو پوری جدو جہد کے ساتھ ۲۳ سال تک بندگان خدا تک پہنچاتے رہے اس فرض منصبی کی ادائیگی کی راہ میں مصائب برداشت کرتے رہے لیکن ایک پل کے لئے آپؐ اس کی تبلیغ واشاعت سے غافل نہیں ہوئے، آپؐ کے بعد اب قیامت تک کے لئے اس فریضہ کی ادائیگی کی ذمہ داری امت اسلامیہ کے کاندھوں پر آ گئی ہے، جس کے لئے بحیثیت مجموعی وہ خدا کے یہاں مسئول ہے، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ملت اسلامیہ قرآن کریم سے رسمی وابستگی سے آگے بڑھ کر اسکی عظمت کا احساس اپنے دل میں پیدا کریں اور اس کے علمی و عملی تقاضوں پر عمل کریں، یہی قرآن سے ہمارے تعلق کا حقیقی مفہوم و معنی ہے، یقیناً یہی اعتصام بحبل اللہ اخروی کامرانی کی شاہ کلید ہے۔

اس عظیم کتاب کو اللہ تعالی نے انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا ہے، یہ ایک انقلابی کتاب ہے، یہ ایک نظام حیات ہے اور اخروی نجات کی ضامن ہے، اس کتاب کو سمجھنا اور سمجھانا اس پر عمل کرنا اسے قائم کرنا اور ساری انسانیت تک پہنچانا امت مسلمہ پر عائد کردہ فریضہ ہے قرآن مجید نے رسول اللہ کے فرائض منصبی میں تلاوت آیات اور کتاب و حکمت کی تعلیم کو ایک اہم ذمہ داری کے طور پر پیش کیا ہے۔ (الجمعہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ اس کی تشریح لوگوں کے سامنے پیش کریں (النحل ۴۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی گئی کہ قرآن کے ذریعہ تذکیر فرمائیں (سورہ ق) قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے اور پھیلانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے

کتنی محنتیں کیں وہ سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے، وہ کفار کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کی تلاوت کرنا ہو یا اصحاب صفہ کی محافل فہم قرآن ہوں، مختلف قبائل کی رہنمائی کے لئے اللہ کے رسول کا اپنے منتخب صحابہ کرام کو معلم بنا کر بھیجنا ہو یا حضور کا اپنے خطبوں میں قرآن کی آیات کا درس پیش کرنا ہو، ہر ممکنہ ذرائع سے قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کا ماحول قائم کیا گیا تھا. چونکہ قرآن قیامت تک کے لئے ہے اسے ساری انسانیت تک پہنچانا تھا، لہذا حضور ﷺ نے اس امت کو حکم دیا کہ میری بات دوسروں تک پہنچا دو خواہ ایک آیت کیوں نہ ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر امت کو راہ راست پر قائم رکھنے کے لئے قرآن وسنت تھامنے کی ہدایت فرمائی، آپ ﷺ نے اس شخص کو بہترین فرد قرار دیا جو خود قرآن سیکھے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے (بخاری) آپؐ نے ماہر قرآن کو معزز فرشتوں کی معیت کی خوشخبری سنائی (متفق علیہ) آپ نے جن لوگوں کو قابل رشک قرار دیا ان میں ایک وہ تھا جسے اللہ نے قرآن کا علم دیا ہو اور وہ اس کی تعلیم وتبلیغ میں مصروف رہے (متفق علیہ) دنیا میں قرآن کی خدمت میں مصروف رہنے والے کو بشارت دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور بلندی کی طرف چڑھتا جا (ترمذی) قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے پر زور دیتے ہوئے حضور نے فرمایا کہ اے اہل قرآن! قرآن کو تکیہ نہ بنالو بلکہ اس کی تلاوت کرو جس طرح سے اس کی تلاوت کا حق ہے، رات اور دن کے اوقات میں اور اسے اعلانیہ پڑھو خوش الحانی کے ساتھ اور جو کچھ مضامین اس میں ہیں ان پر غور کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی (متفق علیہ)۔

اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی مادری زبان عربی تھی، لہذا ان کے رو برو محض اس قرآن کی تلاوت ہی کافی تھی لیکن جہاں تک موجودہ امت مسلمہ (خصوصا برصغیر) کا تعلق ہے عربی زبان سے ناواقف ہے، اس کے سامنے تلاوت سے ثواب کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جا سکتا لہذا مسلمانوں میں قرآن فہمی کے لئے تفاسیر کے مطالعہ کے علاوہ درس قرآن اور اجتماعی مطالعہ قرآن کی محفلیں بھی مفید ذرائع ہیں، اس مضمون میں اسی طریقہ کار پر گفتگو کی گئی ہے۔

واضح رہے درس قرآن کا کوئی متعین طریقہ نہیں ہے کہ اس پر اصرار کیا جائے،

اس کا تعین اس بات پر ہے کہ درس کن لوگوں کے سامنے دیا جانا ہے، حاضرین کون ہیں، مرد ہیں یا خواتین، بچے ہیں یا بڑے، سامعین مختلف ہو سکتے ہیں مثلاً نوجوان، طلبہ وطالبات اساتذہ معززین پڑھے لکھے لوگ، عوام الناس، عام مسلمان، ملی جلی محفل وابستگان تحریک و تنظیم وغیرہ تاہم کچھ بنیادی اور مشترک اصول ہیں جن کا لحاظ کرنا ہر مدرس قرآن یا معلم قرآن کے لئے ضروری ہے، ذیل میں ان نکات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

درس قرآن کے مقاصد:

اللہ کی معرفت: مدرس قرآن کا پہلا اور بنیادی مقصد اللہ کی معرفت ہے چونکہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت خدا کا وجود ہے، اس کی تعلیم اللہ سبحانہ وتعالی نے سب سے پہلی وحی میں دی ہے، ارشاد باری تعالی ہے۔

اقْرأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اقْرأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (سورہ علق ۱ .۵)

''پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا''۔

اسی نکتہ کو سورہ یس میں بیان کیا گیا ہے

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ. وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِيُ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ. قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِىْ أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ. الَّذِىْ جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَاراً فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ. أَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُم بَلَى وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ. إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ. فَسُبْحَانَ الَّذِىْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (سورہ یس:۷۷۔۸۳)۔

''کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا

ہے کہتا ہے کون ہے جو ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟ اس سے کہو، انہیں وہی زندہ کریگا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے، وہی جس نے تمہارے لئے ہر بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے چولہے روشن کرتے ہو، کیا وہ جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے، کیوں نہیں جب کہ وہ ماہر خلاق ہے وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے، پاک ہے وہ جس کے ہاتھوں میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو"۔

اس بات کو سورہ انفطار میں بہت ہی دل نشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے ارشاد باری تعالی ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ. الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ. فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ (سورۃ الانفطار ۶-۸)۔

"اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا"

تزکیہ نفس: درس قرآن تزکیہ نفس اور تطہیر قلب کے لئے دیا جائے، مقصود یہ ہو کہ اس کے ذریعہ ذہنی آلائشوں اور فکری آلودگیوں کو دور کیا جائے گا، ہر وقت تلاش حق کی فکر دامن گیر ہو اور ایک افضل کلام کی شکل میں اور ہدایت طلب کرنے کے لئے درس دیا جائے، حصول رضائے الٰہی کے علاوہ دنیاوی اغراض پیش نظر نہ ہوں، اس کے برخلاف اگر دل میں گھٹیا مقاصد ہوں تو تلاوت کرنے والا قرآن کی ہدایت سے نہ صرف محروم رہے گا بلکہ گمراہ ہو جائے گا، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

يُضِلُّ بِهِ كَثِيراً وَيَهْدِي بِهِ كَثِيراً وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ (سورہ البقرہ: ۲۶).

"اللہ اس قرآن کے ذریعہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور اس سے گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں"۔

ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما و یضع بہ آخرین ۵۔

مثالی نمونہ: ایک مدرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو مثالی نمونہ کی حیثیت سے پیش کرے، قرآن مجید نے معلم اول اور صاحب قرآن کا نقشہ یوں پیش کیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيراً (سورة الاحزاب: ۲۱)

''درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے''۔

یہ صاحب قرآن کے اسوہ کا مکمل اور بہترین نمونہ ہے جس کے مطابق ہم اپنی سیرت وکردار کو ڈھال سکتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ کے اخلاق کیسے تھے۔ توانہوں نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے۔

طریق کار:

تلاوت : درس قرآن کے آغاز میں منتخب شدہ آیات کو ترتیل اور تجوید کے ساتھ آہستہ آہستہ پڑھا جائے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (سورة المزمل: ۴)

''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو''۔

تجوید کا اصطلاحی مفہوم قرآن مجید کے حروف کی شناخت، ان کے مخارج کا صحیح علم اور رموز واوقاف قرآنی کی ضروری واقفیت ہے، اس طرح اپنی حد تک بہتر سے بہتر انداز، اچھی سے اچھی آواز اور زیادہ سے زیادہ خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کرے،

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

زینوا القرآن باصواتکم ۶۔

''قرآن کو اپنی آواز سے مزین کرو''

لیکن تزئین اصوات کو موسیقی کا رنگ نہ دیا جائے، خوش الحانی اور singing میں فرق ہے۔

ترجمہ: تلاوت کے بعد تلاوت شدہ آیات کا سلیس رواں ترجمہ کیا جائے،ترجمہ پڑھنے کا انداز باوقار ہو،ترجمے کی سماعت سے ایسا لگے کہ خدا کا کلام ہے،زوردار اور مفہوم کو پوری طرح واضح کرنے والا ہو تا کہ سامعین تک بنیادی بات پہنچ جائے،ترجمہ کرتے وقت کوئی ترجمہ قرآن سامنے نہ رہے تو اچھا ہے بلکہ تیاری کے وقت ہی ترجمہ قرآن سے بار بار پڑھ لیا جائے۔تا کہ گروہی اور مسلکی عنصر نظر نہ آئے۔

گفتگو نکات کی شکل میں پیش کی جائے: ایک مدرس قرآن کے لئے ضروری ہے کہ جو بات وہ بیان کرے وہ بالکل صاف اور واضح ہو اور ٹو دی پوائنٹ ہو،مثلاً اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اس انکار کی سزا یہ ہے،کوئی لاگ لپیٹ والی بات نہ ہو،بالکل کھلی اور صاف بات ہو،قرآن نے یہ بتادیا ہے کہ اللہ تعالی موجود ہے،تمہیں اس کے سامنے حاضر ہونا ہے ،آخرت ہونے والی ہے،جہاں تمہارا حساب ہونے والا ہے،قرآن کتاب ہدایت ہے ،کامیابی و ناکامیابی کا دارو مدار اسی کتاب پر عمل کرنے میں ہے،اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔

قرآن مجید زندگی کی حقیقت یوں بیان کرتا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اِنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (سورة المومنون: ۱۱۵)

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے''۔

قرآن مجید نے تخلیق انسانی کا مقصد یہ بیان کیا ہے۔

اَلَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورہ الملک: ۲)

''جس نے انسانوں کی زندگی اور موت کا سلسلہ ایجاد کیا ہے وہ تم کو آزماتا ہے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔

مضمون کو بار بار دہرانا: ایک مدرس کو چاہیے کہ اپنی بات کو بار بار دہرائے تا کہ وہ سامعین کے ذہن نشیں ہو جائے اور قرآن کی صداقت اور حقانیت پر ان کے ایمان میں اضافہ

ہو،اور وہ عمل بالقرآن کی طرف راغب ہوں،اسی سلسلہ میں سورۃ الزمر میں ارشاد ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَاباً مُتَشَابِهاً مَثَانِيْ (سورة الزمر: ۲۳)

"اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں"۔

قرآن کریم نے بھی اللہ، آخرت جنت دوزخ اور بہت سے مضامین کو دہرایا ہے مگر تکرار کے باوجود گرانی محسوس نہیں ہوتی ،تکرار کی بہترین مثال سورۃ الرحمٰن ہے،اس میں ۷۸ آیات ہیں جن میں فبای الآء ربکما تکذبان کی آیات ۳۱ بار دوہرائی گئی ہیں، لیکن اس تکرار میں ایک ترنم اور صوتی حسن ہے اور غور وفکر کے لئے ایک جہان ہے۔

دوران درس سوال: مدرس کو چاہئے کہ وہ درمیان میں کہیں کہیں سوال بھی کرے تاکہ سامعین کا ذہن مستقل حاضر رہے اور جو بات کہی جائے اسے بہت غور سے سنیں قرآن کریم کا سوالیہ انداز ملاحظہ فرمائیں۔

يَـا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (سوره الصف: ۱۰)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو میں بتادوں تم کو وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا سکے؟"۔

اس سوال کے بعد سامع یا قاری جواب کا متلاشی ہوگا ، ذہن میں یہ بات ابھرے گی ہاں بتائیے وہ کونسی تجارت ہے،اس کے فوراً بعد قرآن جواب دے رہا ہے۔

تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (سوره الصف: ۱۱)

پھر اس تجارت سے ہونے والے منافع کا بھی تذکرہ کیا جارہا ہے۔

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (سوره الصف: ۱۲)

قرآن کریم میں یہ اسلوب متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔

مثلاً قرآن میں ارشاد ہے" القارعة "عظیم حادثہ" ما القارعة" کیا ہے وہ عظیم

حادثہ؟ و ما ادراک ما القارعه تم کیا جانتے ہو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے(سورہ القارعۃ: ۱۔۳)سورہ الحاقہ میں ارشاد ہے الحاقة ہونی شدنی! مالحاقة کیا ہے ہونی شدنی؟ وَ مَا اَدْرَاکَ مَا الْحَاقَّةُ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے ہونی شدنی؟(سورۃ الحاقه: ۳.۱)

سچے واقعات: ایک مدرس کو اس بات بھی خیال رکھنا چاہئے کہ موضوع سے متعلق احادیث نبوی، سیرت النبی ﷺ یا سیرت صحابہؓ سے مستند سچے واقعات پیش کرے، قرآن برحق ہے اور حضور نبی برحق ہیں، قرآن وسنت اور سیرت رسول ﷺ کسی مصنوعی رنگ کے محتاج نہیں، واقعات میں مبالغہ آرائی سے بچنا چاہئے (و لا تلبسوا الحق باالباطل)

صحابہ کی نماز، صحابہ کا انفاق، صحابہ کا شوق جہادِ، صحابہ کی فکر آخرت۔ یہ اور ان جیسے موضوعات پر مدرس کے پاس مستند مواد ہونا چاہئے جسے وہ درس میں وقتاً فوقتاً استعمال کرے۔

پر امید کرنا: یہ درس قرآن کا ایک اہم جزو ہونا چاہئے، طالب علم فیل ہو گیا، ناکام ہو گیا، گھبرا رہا ہے، اسے دلاسا دینا پر امید کرنا ٹیچر کا کام ہے، کبھی آدمی ہمت ہار جاتا ہے، ٹوٹ جاتا ہے ایسے وقت میں اس کی ہمت افزائی کرنا بہت ضروری ہے اسے دلاسا دینا چاہئے کہ وہ مایوس نہ ہو۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ ایسے موقع میں قرآن کیا انداز اختیار کرتا ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِیَ الَّذِیْ اَسْرَفُوا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُو الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم (سوره الزمر: ۵۳)

امید دلائی جا رہی ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ وہ غفور الرحیم ہے، یہ پیغام امید ہے صرف امید دلا کر وہ چھوڑ نہیں رہا ہے بلکہ ”طریقہ عمل“ بھی بتا دیا ہے۔

وَأَنِيْبُوا إِلَى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ (سورۃ الزمر:۵۴)۔

”جھکو اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اس سے قبل کہ تم پر عذاب آجائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے“۔

متشابہات سے اجتناب: عوامی درس میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ متشابہات کو موضوع نہ بنایا جائے، اللہ تعالی نے قرآن میں محکم آیات بھی نازل کی ہیں اور متشابہ آیات

بھی ،درس قرآن کا موضوع محکم آیات پر مشتمل ہونا چاہیئے ،متشابہات کی تاویل سے گریز کرنا چاہیئے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ (آل عمران:۷)

''جن کے دلوں میں تیڑھ ہے، ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں''

قرآن نے گمراہ لوگوں ہی سے بچنے کے لئے ہمیں یہ دعا سکھائی ہے۔

رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا (آل عمران: ۸)

اے ہمارے پروردگار! ہمیں سیدھے راستے پر لگا دینے کے بعد ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کرنا۔

یہ بات ہر صاحب فہم مسلمان پر واضح ہوتی ہے کہ درس قرآن اور دعوت اسلام کے لئے صحیح عقائد، احوال قیامت، احوال جنت و دوزخ، بینات، عبادات، معروف و منکر، فرائض و واجبات، اخلاقیات اور معاملات کے احکام، اجتماعی زندگی کے فوائد اور اسلام کے عائلی اور اجتماعی نظام کی برکات جیسے موضوعات ہی اہمیت رکھتے ہیں، عوام الناس کو وجہ اللہ (اللہ کا چہرہ) ید اللہ (اللہ کا ہاتھ) دیگر متشابہات پر مبنی موضوعات کا چسکا لگانا مناسب نہیں۔

حالات حاضرہ پر انطباق: درس قرآن کے مضمون کو حالات حاضرہ سے جوڑنے کی کوشش کرنی چاہیئے، قرآن کریم قیامت تک کے لئے رہنمائی ہے، لھذا عصری معنویت واضح کرنا بھی ضروری ہے، سامعین کو بتایا جائے کہ منتخب شدہ آیات ان مشکل حالات میں ہمارے لئے کیا لائحہ عمل تجویز کرتی ہیں، ان ہدایات کی روشنی میں ہم اپنے باطن اور ظاہر کو کس طرح بہتر کر سکتے ہیں، معاشرہ میں کون سی تبدیلیاں ناگزیر ہیں خدائی ہدایات کی روشنی میں ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیئے؟

دعائیہ کلمات پر اختتام: درس قرآن کا اختتام دعا پر کیا جائے۔عموماً ان کلمات پر اختتام کیا جاتا ہے۔

و آخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين .

اور ہماری آخری دعا یہ ہے کہ ساری تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

حواشی

۱- جامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن: ۲۹۰۶۔
۲- صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب من تعلم القرآن وعلمہ، ۵۰۲
۳- صحیح البخاری: فضائل القرآن باب فضل القرآن علی سائر الکلام، ۵۰۲۰
۴- صحیح البجاری، کتاب استتابۃ المرتدین، باب قتل الخوارج الملحدین بعد اقامۃ الحجۃ علیھم: حدیث ۶۹۳
۵- مسلم: باب فضائل القرآن
۶- سنن ابی داؤد ابوداؤد: باب استجاب الترتیل فی القرآۃ۔

رجوع الی القرآن کی ایک نادر اور خوشگوار مثال

مستشرق ٹامس کلیری کا انگریزی ترجمۂ قرآن مجید (۱۹۹۳ء)

عبدالرحیم قدوائی

ہر چند کہ یہ مصرعہ پامال ہے لیکن زیر تذکرہ تصنیف پر بالکل صادق آتا ہے کہ مذکورہ تصنیف امریکی نژاد اور امریکہ ہی میں مقیم مستشرق Thomas Cleary ٹامس کلیری (پ ۱۹۴۹ء) کی ہے۔ موصوف نے مشرقی ایشیا کی زبانوں اور تہذیب پر پی. ایچ. ڈی. مشہور امریکی جامعہ ہارورڈ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کی اصل شہرت اور مہارت بطور مترجم ہے اور میدانِ اختصاص بدھ مت کے مذہبی صحائف کا انگریزی ترجمہ اور ان کی ترتیب اور تدوین۔ ۲۵ سے زائد بدھ مت کے مذہبی صحائف کے تراجم ان کی جلالت علمی پر دال ہیں۔ اسلام پر ان کی یہ تین تصانیف اور تراجم ہیں:

1. The Essential Koran - The Heart of Islam: An Introductory Selection of Readings from the Quran (Harper Collins, 1993).
2. The Quran : A New Translation (Starlatch, 2004)
3. The Wisdom of the Prophet : The Sayings of Muhammad (Shambhala, 2001)

اس مقالے میں تذکرہ البتہ صرف اول الذکر تصنیف یعنی منتخبہ آیاتِ قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کا ہے۔ گو کہ یہ مکمل ترجمۂ قرآن مجید نہیں ہے لیکن اس تصنیف کی اصل اہمیت اس میں شامل تفسیری حواشی کی بنا پر ہے۔ حواشی ہی مصنف کے قابل ستائش رجوع الی القرآن الحکیم کے عکاس ہیں۔ کلیری کا مکمل ترجمہ قرآن مجید اس باعث زیادہ لائق توجہ نہیں

کہ حواشی سے عاری ہونے کے باعث اس سے مصنف کے ذہن اور قرآن مجید سے متعلق اس کے نقطۂ نظر کا حال کچھ کھلتا نہیں۔ تیسری تصنیف منتخبہ احادیث نبوی کے ترجمے پر مشتمل ہے جس کا اس مقالے سے براہ راست تعلق نہیں۔

زیر تبصرہ تصنیف کے دو مابہ الامتیاز پہلو ہیں اور دونوں ہی وقیع، بڑی حد تک حیرت انگیز اور مزید تحقیق اور مطالعے کے لائق۔ ہر چند کہ یہ ترجمہ ایک مستشرق کے قلم سے ہے لیکن خوشگوار بلکہ ناقابل یقین حد تک صدیوں کو محیط، مستشرقین کی اسلام سے بغض و عناد سے عبارت رویّے سے یکسر مبرّا ہے۔ دیباچے میں چرچا نہ اسلام کی خرد دشمنی کا ہے اور نہ اسے عیسائیت کے ایک ناکام، مضحکہ خیز چربے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مزید باعث مسرت یہ نکتہ بھی کہ معاصر مستشرقین کے برعکس موصوف کی نظر میں اسلام دہشت گردی اور جنگ و جدال کا منبع اور ماخذ نہیں۔ اسی طرح ان کے تعارف یا حواشی میں مستشرقین کے تسامحات، تعصبات، مزعومات اور افتراء کا طومار نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس مخلصانہ اور دیانتدارانہ سعی اس امر کی ہے کہ آج کی سیکولر بلکہ مذہب بیزار دنیا کے سامنے قرآن مجید کی اہمیت، معنویت اور جواز کو ثابت کیا جائے۔ دلائل و براہین کی بنیاد پر مصنف نے اس بدیہی حقیقت کو اجاگر کیا ہے جس سے بدقسمتی سے مغرب لاعلم ہے کہ قرآن مجید ہی ایسا صحیفہ ہے جو اپنے قارئین کی ایسی ذہنی اور فکری تربیت کرتا ہے جس کے نتیجہ میں حصولِ علم اور فروغِ دانش کے باب وا ہوتے ہیں اور تحقیق اور اکتشافات کی اصل روح تک رسائی ہوتی ہے۔ بغیر کسی ذہنی تحفظ کے مصنف نے قرآن مجید کا شمار توریت اور انجیل کی طرح کتاب الٰہی کے طور پر کیا ہے اور اس بلیغ نکتے کو بھی نمایاں کیا ہے کہ دیگر کتب سماوی کے برخلاف قرآن مجید کی تنزیل، جمع و تدوین اور تفسیر ایک بیّن تاریخی حقیقت ہے اسی طرح انھوں نے قرآن مجید کے عالم گیر پیغام کا اعترافِ کیا ہے کہ اس کا مخاطب فرد بھی ہے اور جماعت بھی اور ماضی کی ملتیں، آج کی اقوام اور مستقبل کے تمام بنی نوع انسان۔ دیگر مستشرقین کے برخلاف ان کو اسلام کی غیر معمولی کامیابی اور پذیرائی کے پس پشت کوئی دوراز کار معاشی، جغرافیائی یا معاشرتی عوامل نظر نہیں آتے بلکہ اسے انھوں نے صریحاً اسلام کے انقلابی اور فطری پیغام کا ثمرہ قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

محمدؐ اور مسلمانوں کی کامیابی محض عسکری فتوحات کی مرہون منت نہیں بلکہ یہ نتیجہ تھی مسلمانوں کے اپنے مذہب سے فرط تعلق کا اور ظلم اور ناانصافی کے خلاف ان کے برسر پیکار ہونے کا۔ احکام قرآن اور خود اپنے کردار اور عمل سے آپؐ نے خاندانی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں متعدد اصلاحات کیں (ص.xii)

دیباچے کے علاوہ اپنے تفسیری حواشی میں مصنف نے جابجا قرآن کی عظمت اور حقانیت کو اجاگر کیا ہے جو ان کی سلیم الطبعی اور انصاف پسندی کی شہادت دیتا ہے۔ ان کے بعض قابل قدر تفسیری نکات حسب ذیل ہیں:

الف) قصۂ آدم کے ذیل میں مصنف کی یہ صراحتیں بہت اہم ہیں: ''قرآن کی رو سے آدم کی لغزش کے لئے حوا ذمہ دار نہیں بلکہ آدم اور حوا دونوں ہی شیطان کے مکر کا شکار ہوئے''۔ یہ موقف معروف یہودی/عیسائی روایت سے یکسر مختلف ہے جس کے مطابق ھبوط کی تمام تر ذمہ داری حوا کی ہے۔ اسی باعث عیسائی مغرب میں عورت کے حقیر ہونے کا خیال عام ہوا۔

مصنف نے اس حقیقت کو بھی نمایاں کیا ہے کہ قرآن مجید میں مذکور آدمؑ کی شبیہ یہودی/عیسائی روایت سے بالکل جدا ہے۔ بائبل کے بموجب بنی نوع انسان خاطی ہونے کے سبب شفاعت اور نجات کا محتاج ہے۔ اسی کے زیر اثر عیسیٰؑ کے نجات دہندہ اور بنی نوع انسان کے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے عقائد عام ہوئے۔ مصنف نے یہ صراحت بجا طور پر کی ہے: ''یہودی/عیسائی عقیدے کے برخلاف قرآن نے اللہ کی قدرت کاملہ اور رحمت تامہ کو نمایاں کیا ہے، آدم کو عقل اور قوت فیصلہ سے سرفراز کیا ہے اور آدم کو اولین پیغمبرِ الٰہی کے طور پر پیش کیا ہے''۔ (ص ۱۷۱)

ب) مصنف نے ابتداء ہی میں غیر مسلم بالخصوص عیسائی قارئین پر یہ واضح کر دیا ہے کہ قرآن مجید میں مذکور بائبل اور عیسائی دنیا میں رائج بائبل کے درمیان نمایاں فرق ہے اور ان دونوں کو ایک نہیں سمجھنا چاہئے'' (ص ۱۶۷)۔ بالفاظ دیگر

مصنف نے موجودہ بائبل کے محرّف ہونے کا اثبات کیا ہے۔

ج) مذکورہ بالا نکتے کو مزید واضح انہوں نے اس جملے میں کیا ہے: ''قرآن اصلاً فرقان ہے کہ اس کے مندرجات کی روشنی میں قدیم صحف سماوی میں حذف اور اضافے کا علم ہوتا ہے اور اس طرح انسان اصل حقیقت سے واقف ہوتا ہے'' (ص ۱۷٦)۔

د) سورہ النساء میں وارد قانونِ وراثت میں عورتوں کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے یہ محض مستشرقین کا بہتان ہے۔ اس باب میں مرد اور عورت کے مابین فرق کی وجہ صرف یہ ہے کہ ''مرد کے برخلاف عورت پر معاشی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں'' (ص ۱۷۹)۔

س) مصنف کے تجزیے کے مطابق قرآن مجید کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ ''عیسیٰ کے لئے انتہائی تعظیمی القاب (''کلمہ، روح'') کے استعمال کے باوجود اس نے اللہ کی وحدانیت کو بعینہٖ برقرار رکھا ہے۔ قرآن نے عیسیٰ کے بنیادی پیغام کا اثبات بھی کیا ہے اور خود قرآن کو ماقبل کی وحی الٰہی کے مصداق اور محافظ کے طور پر بھی پیش کیا ہے'' (ص ص ۱۸۹-۱۸۱)۔

ش) قرآن نے پیغمبروں کی عظمت کے پہلو بہ پہلو ان کی بشریت کا بھی اعلان کیا ہے۔ قرآن کا یہ امتزاج قابل غور ہے کہ اس نے پیغمبروں کو حاملِ وحیِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے تاکہ ان کے پیغام کے الٰہی ہونے کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ رہے'' (ص ۱۸۴)۔

ص) رہبانیت کی تغلیط اور تردید قرآن کا ایک اور امتیازی پہلو ہے۔ ''کشاکشِ دنیا سے فرار انسان کو زیب نہیں دیتا۔ اصل امتحان یہ ہے کہ آزمائشوں اور مسائل کے باوصف انسان زندگی بہترین طور پر بسر کرے'' (ص ۱۸۴)۔

ض) صدقے اور خیرات کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے تعبیر کرتے ہوئے قرآن

مجید نے اس نیک عمل کی رغبت اور اہمیت میں بہت اضافہ کیا۔ مصنف کا اس بارے میں یہ تبصرہ اہم ہے کہ ''صدقہ، خیرات معاشرہ کی فلاح و بہبود اور اس میں توازن قائم رکھنے کے ضامن ہیں'' (ص ۱۹۳)۔

ط) ''بت پرستی اور مادہ پرستی کے خلاف اعلان جنگ کے باوجود قرآن ترکِ دنیا کا قائل نہیں۔ اس کا مقصود ہے کہ دنیا میں توازن اور اعتدال قائم رہے، قرآن کے مطابق مال فی نفسہ محمود یا مذموم نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیسے خرچ کیا جائے، اسی پر اس کا محمود یا مذموم ہونا منحصر ہے'' (ص ۲۰۱)۔

پیغام قرآن مجید کی اس مثبت اور منصفانہ ترسیل اور ابلاغ کے علاوہ زیر گفتگو ترجمۂ قرآن مجید کا دوسرا خوشگوار پہلو تقابلِ ادیان ہے۔ یہ افسوس ناک بلکہ سوہانِ روح علمی روایت مغرب اور استشراق کے مسلّمات میں داخل ہے کہ قرآن مجید نعوذ باللہ یہودی، مسیحی اور مشرق قریب کی مذہبی روایات کا ملغوبہ ہے اور آں حضرت ﷺ کی محض اختراعِ ذہنی۔ ان کے مطابق اولاً قرآن مجید کے مضامین سرے سے غور وفکر کے لائق ہی نہیں، اور اگر کوئی مثبت پیغام جہاں تہاں ہے بھی تو وہ یہودی/مسیحی روایات سے ماخوذ یا اس کا ناقص چربہ ہے۔ صدیوں سے مستشرقین توریت، انجیل اور قرآن مجید کے مابین مماثلت کو محض ناکام سرقے پر محمول کرتے رہے ہیں، اس پس منظر میں مصنف کی یہ کاوش قابل داد ہے کہ اس غیر منصفانہ اور باطل مفروضے کو مطلق نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تصنیف میں انہوں نے قرآن مجید اور تقابلِ ادیان کے ضمن میں ایک نئی علمی روایت کی بنیاد ڈالی ہے کہ جا بجا قرآن مجید اور بدھ مذہبی صحائف کے مابین مشترک نکات کو منظر عام پر لائے ہیں اور اس میں ان کا رویہ تفوق یا اعتراض کا نہیں بلکہ مقصود دو عظیم مذہبی روایات کے درمیان متفق علیہ تصورات اور تعلیمات کو نمایاں کرنا ہے۔ مطالعۂ قرآن مجید کے باب میں یہ ایک گراں بہا اضافہ ہے کہ ہمارے علماء اور قرآن مجید کے طالب علم بالعموم اس مشترک میراث سے بے خبر ہیں۔ موصوف نے عالمانہ وقار کے ساتھ اور بمسرّت ان مشترک اقدار کا تذکرہ کیا ہے۔

ان کی تحقیق کے مطابق رضائے الٰہی کے حصول کے لئے صدقے، خیرات کی روایت، علم اور اس کی انواع اور اقسام کی جستجو، آبائی تقلید سے اجتناب، نورِ الٰہی سے ہم کنار ہونے کی سعیٔ پیہم، تاریخی آثار کے حوالے سے حقیقت عظمیٰ کی شناخت وغیرہ قرآن مجید اور بدھ مذہبی صحائف کے مشترک مضامین ہیں۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ ہے:

۱) سورہ البقرہ آیت ۴۴ میں منافقین پر یہ تعریض ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں جبکہ وہ خود نیک عمل کرنے سے محترز رہتے ہیں۔ مصنف کے بموجب بدھ مذہبی صحیفے The Flower Ornament Scripture (باب ۱۰) میں بعینہٖ یہی مضمون اس طرح ادا ہوا ہے: "ان کی مثال کونے میں بیٹھے ہوئے اس شخص کی سی ہے جو نیک عمل کا ذکر ضرور کرتا ہے لیکن یہ اس کے قلب کی اندرونی آواز نہیں ہوتی، بلاشبہہ ایسے ہی لوگ بے عمل ہیں" (ص ۱۷۱)۔

۲) سورہ البقرہ کی معروف آیت البر (آیت ۱۷۷) میں مختلف حاجت مندوں کی مدد کے لئے مال خرچ کرنے کا حکم آیا ہے۔ "علی حُبّہِ" کی ضمیر کا مرجع مفسرین نے اللہ اور مال دونوں کو قرار دیا ہے یعنی حُبّ الٰہی کے زیر اثر مال خرچ کیا جائے یا مال سے محبت کے باوصف اسے ضرورت مندوں کی مدد پر صرف کیا جائے۔ مصنف کا قول ہے کہ بدھ مذہب میں بجنسہٖ یہی حکم پایا جاتا ہے کہ بہترین صدقہ یا عطیہ وہ ہے جو معطی، مستحق شخص اور عطیے کی مالیت سے ماورا ہو۔ موصوف کی رائے میں صدقے اور خیرات سے متعلق سورہ البقرہ کی جامع آیات (۲۶۲-۲۶۵) اور بدھ مذہب کی اس بارے میں تعلیمات مشترک اور مماثل ہیں بالفاظ دیگر دونوں مذاہب میں صدقے اور خیرات کی اہمیت اور ان کی ادائیگی کے آداب اور اقدار یکساں ہیں (ص ۱۷۵)۔

۳) سورہ آل عمران (آیات ۷۹-۸۰) میں عیسیٰؑ کے بارے میں عیسائیوں کے مشرکانہ عقائد کی پُر زور تردید اور پیغمبران الٰہی کی بشریت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا

ہے۔ مصنف کے بموجب بدھ مذہبی عقیدہ Mahaparinirvana-sutra بھی شخصیت پرستی کے اسی شدید انکار کا مظہر ہے۔ بالفاظ دیگر، دونوں مذاہب میں شخصیت پرستی کی گنجائش نہیں (ص ۱۷۷)۔ یہاں یہ اضافہ البتہ ناگزیر ہے کہ یہ عقیدہ بدھ مذہب کا جزو ضرور رہا ہوگا مگر عملاً آج بدھ مذہب بدترین شخصیت پرستی سے عبارت ہے۔ گوتم بدھ کی مورتی پوجا ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ فاضل مصنف کا اس بارے میں مطلق سکوت ناقابل فہم ہے۔

۴) سورہ لقمان (آیت ۲۷) میں اللہ کی خلاقی اور لامحدودیت کو اس مرعوب کن پیرائے میں بیان کیا گیا ہے:

روئے زمین کے تمام درختوں کے اگر قلم ہو جائیں اور تمام سمندروں کی روشنائی ہو جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر اور بھی ہوں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے۔ بے شک اللہ غالب اور باحکمت ہے۔

مصنف کی تحقیق کے مطابق بدھ مذہبی صحیفے The Flower Ornament Scripture کے باب ۳۹ میں آفاقی چشم کی جلالت کا اظہار بھی کم وبیش ان ہی الفاظ میں کیا گیا ہے کہ ''یہ آفاقی چشم تمام انفس وآفاق اور حقیقت عظمیٰ کی ہمہ وقت نگرانی کرتی رہتی ہے، حقیقت اولی کی جانب سب کی رہنمائی کرتی رہتی ہے اور تزکیے کا فریضہ بھی انجام دیتی رہتی ہے۔ اس آفاقی چشم کی عظمت، تعلیمات اور صفحات عالیہ کو تمام پہاڑوں کے برابر قلم اور تمام سمندروں کے برابر روشنائی بھی رقم نہیں کر سکتی'' (ص ۱۸۹)۔

۵) مصنف نے اس حقیقت کی بھی نقاب کشائی کی ہے کہ سورہ سبا (آیت ۳) میں لوحِ محفوظ کا قرآنی تصور کم وبیش وہی ہے جو بدھ مذہبی صحیفے The Flower Ornament Scripture کے باب ۳۷ میں درج ہے۔ دونوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ اس لوح میں ابد سے ازل تک کے تمام واقعات اور احوال درج ہیں۔ (ص ص ۱۹۰-۱۹۱)۔

۶) سورہ سبا آیت ۳۹ میں صدقے، خیرات کے لئے انعام خداوندی کا تذکرہ ہے۔ مصنف کا موقف ہے کہ بدھ مذہب میں بھی بے لوث صدقے اور خیرات کے لئے بے حساب انعام کا عقیدہ ہے۔ خواہ یہ عطیہ ماڈی قدر و قیمت کے لحاظ سے معمولی ہی ہو۔ (ص ۱۹۱)۔

۷) سورہ سبا (آیت ۴۳) میں آباء واجداد کے دین کی اندھی تقلید کی مذمت کی گئی ہے۔ مصنف کی رائے میں گوتم بدھ کا پیغام بھی اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ مصنف نے ابراہیمؑ اور آنحضرتؐ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس کا اعادہ کیا ہے کہ انھوں نے باطل آبائی روایات کے خلاف کامیاب جہاد کیا اور آبائی دین کے بجائے براہ راست مشاہدے پر مبنی حقیقت کے ادراک کو فروغ دیا۔ (ص ۱۹۱)۔

۸) سورہ الفیل کے تاریخی سیاق وسباق پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے یہ اشارہ کیا ہے کہ بدھ مذہبی روایات اور صحائف میں تاریخی واقعات کا تذکرہ اور ان سے دینی، روحانی اور اخلاقی سبق کا استنباط اور استناد ایک معروف منہج ہے۔

اسلام اور قرآن مجید کی حقانیت کے اعتراف اور اسلام اور بدھ مذہب میں متفقہ اقدار کی نشاندہی کے لئے مصنف مبارکباد کا مستحق ہے۔ اس نوع کے بین المذہبی اشتراک اور اتحاد کو فروغ دینا ہمارا فرض ہے اور اسی میں انسانیت کی فلاح ہے۔ ایسا بین المذہبی مکالمہ جس سے عقائد پر آنچ نہ آتی ہو اور بہتر باہمی تعلقات کی راہ ہموار ہو بلاشبہہ محمود بھی ہے اور مزید توجہ کا طالب بھی۔

آخر میں یہ اضافہ ضروری ہے کہ صدیوں کو محیط استشراق کی تاریخ میں رجوع الی القرآن الحکیم کی ایسی درخشاں مثال شاذ ہی ملتی ہے۔

جنسی استحصال کا سد باب - قرآن کی روشنی میں

محمد عمر اسلم اصلاحی

صالح تمدن کی بقاء اور استحکام کے لئے جنسی استحصال کا سد باب از بس ضروری ہے۔کیوں کہ جنسی استحصال سے نہ صرف یہ کہ ایک صنف کی حق تلفی ہوتی ہے اور اس کی ناموس پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے بلکہ اس سے رحمی رشتہ کی پاکیزگی بھی متاثر ہوتی ہے۔اگر یہ بیماری عام ہو جائے تو معاشرہ اختلال و فساد سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔جنسی استحصال کے واقعات پہلے بھی کم نہیں پیش آتے تھے لیکن ادھر چند سالوں سے مغربی تہذیب کے اثر سے یہ بیماری اس قدر عام ہوگئی ہے کہ جو لوگ صنفی آوارگی کو آزادیٔ حق تصور کرتے رہے ہیں وہ بھی چیخ پڑے ہیں اور اس کے سد باب کے لئے سخت ترین قانون بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں،لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اگر جنسی استحصال یا زنا جبری ہو تب تو اسے وہ جرم مانتے ہیں لیکن اگر وہی زنا برضا و رغبت ہو تو اب بھی وہ اسے آزادیٔ حق ہی گردانتے ہیں۔حالانکہ بسا اوقات یہی رضا جب کسی وجہ سے ناراضگی میں تبدیل ہو جاتی ہے تو وہی جنسی تعلق آزادیٔ حق کے بجائے قابل گردن زدنی ہو جاتا ہے۔

جو سماج ایک طویل عرصہ سے اس طرح کی آزادی کے نعروں کے ساتھ آگے بڑھتا اور شجر بے برگ کے سائے میں زندگی گزارتا رہا ہے،اب وہ اس کے نقصانات سے آگاہ اور اس آزادی کی فسوں کاری سے واقف ہو گیا ہے اس لئے باوجودیکہ اس سماج کی فسطائی ذہنیت اب بھی اسے ایک خوبصورت کلچر کے روپ میں پیش کر رہی ہے وہ اس کے نتائج بد کا اعتراف کر رہا ہے اور لوگوں کو اس آزادی سے دور رہنے کی تلقین بھی کر رہا ہے۔

لیکن جس سماج کو ابھی اس کا بہت زیادہ تجربہ نہیں ہے وہ مغرب کی نقالی میں اس کی وکالت کر رہا ہے البتہ جب کبھی کوئی بڑا ناخوشگوار واقعہ پیش آ جاتا ہے اور عوام اس پر سراپا احتجاج بن جاتے ہیں تو مغرب کے یہی نقال اسے غلط قرار دینے لگتے ہیں لیکن اسی کے

ساتھ اپنی پسند کو سماج پر تھوپے رکھنے کے لئے بالرضا اور بالجبر کی تقسیم کر کے اس سماج کو اس لعنت سے یکسر نجات حاصل کرنے کا موقع نہیں دیتے۔

چونکہ اب جنسی استحصال کے واقعات بہت زیادہ رونما ہونے لگے ہیں اور مشرقی تہذیب کے علم بردار بڑی شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس کے سد باب کے لئے سخت ترین قوانین کے وضع ونفاذ کی بات کر رہے ہیں اس لئے حکومتیں بھی اس بارے میں سخت قانون کی بات کرنے لگی ہیں، لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کی جو قانون بھی فطرت کو نظر انداز کر کے بنایا جائے گا کبھی مؤثر نہیں ہوسکتا۔ فاطر ارض وسماوات نے خود ہی اس بیماری کا ایسا علاج تجویز کر دیا ہے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، اسی لئے ماضی میں جس سماج نے اس نسخہ کو آزمایا وہ صدر شک ارم بن گیا۔ اس سماج میں نہ کوئی عورت جنسی تلذذ سے محروم رہ گئی اور نہ کسی کی ناموس پر ڈاکے ڈالے گئے اور نہ اسے خوف وہراس کی زندگی گزارنی پڑی۔ بلکہ اس نے پورے نسوانی وقار اور انسانی شرف کے ساتھ زندگی گزاری۔ ایک مرحلہ میں وہ باعث رحمت، دوسرے مرحلہ میں ملکۂ خانہ اور تیسرے مرحلہ میں ذریعہ حصول جنت سمجھی گئی۔

فاطر ارض وسماوات نے جنسی استحصال کے سد باب کے لئے جو فطری قوانین وضع کئے ہیں وہ اس نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید میں تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں آئے دیکھا جائے کہ وہ فطری قوانین کیا ہیں۔

تکریم انسانیت:

ایک بات تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ ہم نے تمام انسانوں کو معزز ومکرم بنایا ہے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ آدَمَ (بنی اسرئیل:۷۰)

اور یقیناً ہم نے آدم کی تمام اولادوں کو عزت بخشی۔

جب اللہ تعالیٰ نے سارے ہی انسانوں کو شرف ووقار عطا فرمایا ہے تو نہ کسی مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی عورت کو اس سے محروم کرے اور نہ کسی عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی مرد کو اس سے محروم کرے۔

پھر فرمایا کہ ہم نے انسانی وجود کا ذریعہ مرد اور عورت دونوں کو بنایا ہے اس لئے مرد بحیثیت باپ اور عورت بحیثیت ماں قابل احترام ہیں۔فرمایا:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَا كُمْ مِنَ ذِكّرُوُ اِنثِي (سورہ حجرات : ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔

مرد اور عورت کی ایک دوسرے سے وابستگی کا طریقہ:

مرد اور عورت کے ایک دوسرے سے وابستگی کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک جائز ہے اور دوسرا ناجائز۔جائز وابستگی ہمیشہ کے لئے بذریعہ نکاح ہوتی ہے جبکہ ناجائز وابستگی ایک ہیجانی کیفیت کے زیر اثر محض تسکین نفس کے لئے عارضی ہوتی ہے، چنانچہ جو وابستگی محض تسکین نفس کے لئے ایک ہیجانی کیفیت کے نتیجہ میں ہوگی وہ اولا تو عارضی ہوگی اور ثانیا اس میں ذاتی مفاد اور ضرورت سے آگے کا کوئی اور تعلق قائم نہیں ہو سکے گا،ایسی وابستگی حقیقی محبت اور احساس ذمہ داری سے خالی ہوگی،اس میں طرفین کا مفاد حاصل ہو گیا اور ضرورت پوری ہوگئی تو وابستگی کی اہمیت بھی ختم ہوگئی اور جس تعلق میں مستقل وابستگی کی اہمیت مفقود ہوتی ہے اس میں صنف ضعیف کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اس کا استحصال ہوتا ہے۔چونکہ اسلام میں کسی بھی طرح کا استحصال جائز نہیں اس لئے اس نے استحصالی وابستگی کو ناجائز قرار دیا ہے۔رہی وہ وابستگی جس میں حقیقی محبت اور احساس ذمہ داری کی کارفرمائی ہوتی ہے وہ صرف نکاح کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔نکاح ایک پاکیزہ بندھن ہوتا ہے،اس پاکیزہ بندھن میں بندھ جانے کے بعد مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن جاتے ہیں اسی لئے ان دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔قرآن کہتا ہے:

هن لباس لكم وانتم لباس لهن (البقره :۱۸۷)

وہ (عورتیں) تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کیلئے لباس ہو۔

زنا کی حرمت اور اس کی علت:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لا تقربوا الزنا انه كان فاحشة و ساء سبيلا (بنی اسرائیل : ۳۲)

تم زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو. یہ بڑی بے حیائی کا کام اور انتہائی برا راستہ ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زنا کی حرمت کے ساتھ اس کی علت بھی بتا دی ہے کہ یہ بے حیائی کا کام اور انتہائی برا راستہ ہے اور ظاہر ہے کہ بے حیائی انہیں زیب نہیں دیتی جن کو اللہ تعالیٰ نے شرف و وقار سے نوازا ہے۔

زنا جسے قرآن فاحشہ قرار دیتا ہے عدل کی ضد ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ و ینھیٰ عن الفحشاء و المنکر والبغی . (النحل : ۹)

بے شک اللہ عدل، احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کا حکم دیتا ہے اور فحشاء، منکر اور بغی سے روکتا ہے۔

یہاں دیکھئے تین اوامر اور تین منہیات کا ذکر ہے، اوامر میں سب سے پہلے عدل کا ذکر ہے اور منہیات میں سب سے پہلے فحشاء کا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ فحشاء عدل کا مقابل اور اس کی ضد ہے۔

عدل کا ایک اور مقابل اور ضد ظلم ہے اور ظلم شرک کے ہم معنیٰ ہے. قرآن کہتا ہے:

اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْم (لقمان : ۱۳)

بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

تو گویا شرک اور فحشاء وزنا ایک سطح کے جرائم ہیں، اللہ تعالیٰ کو جتنا ناپسند یہ ہے کہ کوئی اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے اتنا ہی ناپسند یہ بھی ہے کہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ زنا کرے، شرک سے اللہ تعالیٰ کی عظمت داغدار ہوتی ہے تو زنا سے انسانیت کی ردائے عصمت تار تار ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے مرتکبین کی کڑی سزا تجویز کی ہے، مشرکین کے بارے میں فرمایا:

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أُولٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ(البينة:٦)

بے شک وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا اور مشرکین جہنم کی آگ میں ہونگے، اسی میں ہمیشہ رہیں گے یہی لوگ بدترین خلائق ہیں۔

اورزانیوں کے بارے میں فرمایا

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِئَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (النور : ۲)

زانی اور زانیہ دونوں کو سوسو کوڑے مارو اور اللہ کے قانون کے نفاذ میں ان دونوں کے سلسلہ میں تمہارے اندر کوئی ہمدردی نہ پیدا ہونے پائے اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان دونوں کو عذاب دیتے وقت مومنین کی ایک جماعت وہاں موجود رہے۔

خواتین کا دائرہ ومیدان کار:

خواتین کو جنسی استحصال سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا جب تک ان کا دائرہ ومیدان کار متعین نہ ہو، اگر ان کا دائرہ ومیدان کار متعین ہو جائے تو انہیں خود بھی اس کی پابندی کرنی چاہیے اور ان کے سرپرستوں کو بھی ان سے پابندی کرانی چاہیئے اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کی کوئی مداہنت نہیں کرنی چاہیئے ،قرآن نے خواتین کا اصل میدان کار درون خانہ کو قرار دیا ہے۔فرمایا:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً (سورۃ الاحزاب:۳۳)

اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی ﷺ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کرے۔

اس فرمان الٰہی سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خواتین کا اصل دائرہ ومیدان کار درون خانہ ہے بیرون خانہ نہیں، درون خانہ ہی میں ان کے اتنے فرائض ہیں کہ اگر وہ ان کی ادائیگی کریں تو باہر کے لئے بہت زیادہ گنجائش نہیں بنتی، مال واسباب کی حفاظت، گھر در کی حفاظت، اولاد کی تربیت اور اگر ساس وخسر ہوں تو ان کی دیکھ ریکھ اور جائز حدوں میں ان کی خدمت، کھانا پکانا وغیرہ۔ یہ سارے وہ کام ہیں جو گھر میں رہتے ہوئے ایک خاتون ہی کو انجام دینا ہے۔ چونکہ مرد تلاش معاش کے لئے باہر جاتا ہے، اہل خانہ کی ضروریات کی تکمیل

کے لئے سفر پر رہتا ہے اس لئے اس کی عدم موجودگی میں گھر کی نگرانی اسی کو کرنی ہے۔ یہاں عورتوں کو گھر میں ٹک کر رہنے کے لئے "قرن" کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہ "قرار" مصدر سے بھی ہوسکتا ہے اور "وقار" مصدر سے بھی۔ یوں اس مصدر نے خود ہی اس جانب اشارہ کر دیا کہ اگر گھر میں قرار پکڑو گی تو عزت و وقار سے رہنے کی سعادت پاؤ گی اور اگر بیرون خانہ کو اپنا دائرہ عمل بناؤ گی تو تمہاری عصمت کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں۔

گھر سے باہر نکلنے کے آداب:

گھر میں رہنے والی اس خاتون کو بھی باہر نکلنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے اس لئے اس کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ ملکۂ خانہ ہے کوئی قیدی نہیں ہے، البتہ اگر اسے کسی ضرورت سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے حسن کو چھپا کر اور بناؤ سنگار کی چیزوں کو اتار کر نکلے تاکہ خواہ مخواہ فتنہ اس کا تعاقب نہ کرے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى (الحزاب:۳۳)

اور تم سابقہ جاہلیت کے انداز میں سج دھج کر نہ نکلو۔

گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں اس کے لئے دوسری ہدایت یہ ہے کہ وہ مکمل پردے کے ساتھ باہر نکلے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ (الاحزاب: ۵۹)

اے نبیؐ اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورتیں گھروں سے باہر نکلیں تو اپنے چہرے اور سینے وغیرہ ڈھانک کر نکلیں، پھر ایک دوسری آیت میں ہے

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ (النور-:۳۱)

اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رکھیں۔

قرآنی آیت کے اس ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سینوں کے اوپر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رکھیں۔ان کی یہ صورت درون خانہ اور بیرون خانہ دونوں میں مطلوب ہے۔

بالفاظ دیگر عورتوں کو اپنے جسم کے وہ سارے حصے چھپا کر ہی باہر نکلنا چاہیئے جو دعوت نظارہ دے سکتے ہیں یا مردوں کے اندر ہیجان برپا کر سکتے ہیں۔عہد حاضر میں اس پردے کے لئے برقع کا استعمال ہوتا ہے۔یہ برقع پردہ کی کامل ترین شکل ہے بشرطیکہ چہرہ مکمل طور سے چھپا ہوا ہو۔بس راستہ دیکھنے کے لئے ہی گنجائش چھوڑی گئی ہو اور برقع اس قدر ڈھیلا ڈھالا ہو کہ اعضاء جسمانی کی نمائش نہ ہو رہی ہو۔اللہ تعالیٰ نے اس پردہ کی حکمت بھی بیان کردی ہے۔فرمایا:

ذَلِکَ أَدْنَی أَن یُعْرَفْنَ فَلاَ یُؤْذَیْنَ (الاحزاب : ۵۹)

یہ زیادہ قرین ہے اس بات کے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں گزند نہ پہنچائی جاسکے۔

یہاں پردہ کی حکمت یہ بتائی گئی کہ اس سے لوگوں کو اندازہ ہوجائے گا کہ یہ وہ شریف زادیاں ہیں جنہیں خود اپنی عزت وعصمت کی فکر ہے۔اور جنہیں خود اپنی عزت وعصمت کی فکر ہوگی شیطان ان کی طرف بڑھنے کی جرأت نہیں کرے گا اس طرح ان کی عصمتوں کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔برخلاف ان کے جو خواتین باریک اور مختصر لباس زیب تن کرتی ہیں اور اپنی پردہ کی جگہوں کی نمائش کرتی پھرتی ہیں،شیطان ان کا تعاقب زیادہ کرتا ہے اور وہ اپنے لئے ان کے یہاں زیادہ گنجائش پاتا ہے۔آج کل عورتیں اسمبلی اور پارلیمانی انتخابات لڑتی ہیں جیت کر اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں میں مردوں سے بحث کرتی ہیں،کبھی کبھار ہاتھا پائی بھی کرتی نظر آتی ہیں،اپنے اپنے حلقوں میں غیر محرم مردوں کے ساتھ لمبے لمبے دورے کرتی ہیں،خلوتوں میں نشستیں بھی لیتی ہیں،دفتروں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں،کالجوں میں لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتی ہیں،مردانہ اسپتالوں میں نرس کی حیثیت سے کام کرتی ہیں،جہازوں،ٹرینوں میں مسافروں کی خدمت کرتی ہیں،ہوٹلوں اور دکانوں پر مردوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں،پولیس اور فوج میں مردوں کے ساتھ شبانہ روز ڈیوٹی کرتی ہیں۔ایسی عورتوں کے لئے ان کی عصمتوں کی حفاظت کس حد تک ممکن ہے؟اسی طرح جو خواتین عریاں یا نیم عریاں ہوتی ہیں نگاہیں ان کا تعاقب کرتی ہیں،لوگ ان کے عریاں جسم سے ابتداء میں تو فکری تلذذ حاصل کرتے ہیں لیکن موقع پاتے ہی جنسی تلذذ کے لئے جبر کا سہارا لیتے ہیں۔یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ

خواتین جیسے چاہیں رہیں مردوں کو ان کی طرف دیکھنے کی اجازت کہاں سے حاصل ہوگئی؟ لیکن عملاً اس فتنہ سے محفوظ رہنا آسان نہیں ہے کیوں کہ حسن کی نمائش بجائے خود ایک دعوت ہے، اس سے اجتناب بہت ضروری ہے۔عہد حاضر میں جنسی زیادتی کے جو واقعات پیش آرہے ہیں وہ زیادہ تر ایسی ہی خواتین کے ساتھ پیش آرہے ہیں جن ذکر اوپر ہوا ہے۔بلا شبہ معزز مسلم خواتین کی عزتوں پر بھی ڈاکے ڈالے جاتے ہیں لیکن اس قسم کے اقدامات صرف ان ہی لوگوں کی طرف سے ہوتے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی ایذا رسانی کو اپنا پیشہ بنالیا ہے۔

درون خانہ کے اصول وآداب:

اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی عصمت کے تحفظ کے لئے درون خانہ کے بھی کچھ اصول وآداب بتائے ہیں تاکہ درون خانہ جو فتنے جنم لے سکتے ہیں ان کا سد باب ہو۔

مردوں کے لئے ہدایت

اللہ تعالیٰ نے معاشرے کو بدنگاہی اور اخلاقی مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لئے مردوں کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ.فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَداً فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ.لَّيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ.قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ أَزْكَى لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ (النور : ۲۷۔۳۰)

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک انسیت حاصل نہ کرلو اور گھر والوں کو سلام نہ کرلو۔یہ تمہارے حق میں بہتر ہے شاید تم یاد دہانی حاصل کرو۔پس اگر تم ان گھروں میں کسی مرد کو نہ پاؤ تو اندر مت جاؤ یہاں تک کہ تمہیں اجازت دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جاؤ۔ یہ تمہاری پاکیزگی کے لئے زیادہ مناسب ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح

باخبر ہے، ان غیر رہائشی مکانوں میں داخلہ پر کوئی پابندی نہیں ہے جس میں تمہارے کام کی کوئی چیز ہے .اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو. اے نبی! مومنوں کو ہدایت کرو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں. یہ ان کی پاکیزگی کے لئے زیادہ موزوں ہے بے شک اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں۔

ان آیات میں مردوں کو ان ساری باتوں کی ہدایات دے دی گئی ہیں جن کا پاس ولحاظ اگر وہ رکھیں تو درون خانہ کے فتنوں سے حفاظت کا سامان ہو جائے گا، اور جنسی استحصال کی نوبت نہیں آئے گی. چنانچہ فرمایا گیا: کہ جب بھی کوئی مرد کسی دوسرے شخص کے گھر میں جانا چاہے تو پہلے اپنی پہچان کرادے کہ کون ہے جو گھر میں آنا چاہتا ہے اور اس کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ وہ دروازے پر پہونچ کر سلام کرے. اگر آنے والا مانوس آدمی ہے تو اپنی آواز ہی سے پہچان لیا جائے گا، اب اگر اس کے گھر کے اندر داخل ہونے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہوگی تو خواہ گھر میں مرد ہو یا نہ ہو اسے داخلہ کی اجازت مل ہی جائے گی، لیکن اگر آواز سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ فلاں شخص ہے جس کا مرد کی گھر میں موجودگی کے بغیر گھر میں آنا شرعاً ممنوع ہے تو اسے یہ جواب ملے گا کہ میاں جی گھر میں نہیں ہیں. بعد میں آئیے گا. یہ بھی ممکن ہے کہ آواز بالکل اجنبی کی معلوم ہو تو گھر کے اندر سے کوئی جواب ہی نہ ملے. بالکل خاموشی ہو. ایسی صورت میں بھی واپس ہو جانے کا ہی حکم ہے۔ اس پابندی سے مردوں کی عدم موجودگی میں صرف محرم ہی گھر میں داخل ہو سکیں گے جن سے عزت کو کوئی خطرہ نہیں، غیر محرم گھر میں داخل ہی نہیں ہو سکیں گے اس لئے ان سے خطرہ کا سوال ہی نہیں اور اگر اجنبی غیر محرم ہوگا تو اسے یہ پتہ ہی نہ چل سکے گا کہ گھر میں مرد ہے یا نہیں اس لئے وہ دہلیز پار کرنے کی جرأت ہی نہیں کرے گا. البتہ ایسے گھروں میں داخلہ پر کوئی پابندی نہیں جو زنان خانہ نہ ہوں مثلاً چوپال اور بیٹھک لیکن یہاں بھی یہ ہدایت دے دی گئی کہ محض گپ شپ کرنے کے لئے وہاں مت جاؤ ضرورت ہو تو جاؤ ورنہ وقت برباد نہ کرو۔

چونکہ ہر گھر میں یہ سہولت نہیں ہوتی کہ عورتوں کی رہائش کا حصہ الگ ہو اور باہر سے آنے والے مہمانوں کے لئے انتظام الگ ہو، تو ایسے گھروں میں مردوں کی موجودگی میں غیر محرموں کو داخل ہونے کے کچھ آداب سکھائے گئے ہیں تاکہ اندر کا شیطان بیدار نہ ہو جائے اور فتنہ کا کوئی امکان پیدا نہ ہو جائے. فرمایا گیا کہ اگر اجازت ملنے پر گھر میں داخل ہو تو نگاہیں

نیچی رکھو.ادھر ادھر تانک جھانک نہ کرو اور اس طرح اٹھو بیٹھو کہ شرمگاہیں کھلنے نہ پائیں۔

اگر مردان ہدایات کو پیش نظر رکھیں تو درون خانہ ان کی طرف سے کسی فتنہ کا اندیشہ نہیں رہے گا۔

عورتوں کے لئے ہدایات:

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو ان کی ساخت اور مزاج کے لحاظ سے ہدایات دی ہیں اور عورتوں کو ان کی ساخت اور مزاج کے لحاظ سے ہدایات دیں.چنانچہ عورتوں کو جو ہدایات دی ہیں وہ یہ ہیں۔

وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاء بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاء بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُوْلِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاء وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (النور : ۳۱)

اور اے نبی! مومنہ عورتوں کو ہدایت کرو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کا اظہار نہ کریں مگر جو خود ہی ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کے سامنے یا اپنے باپوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے سامنے یا اپنے بیٹوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے سامنے یا اپنے بھتیجوں کے سامنے یا اپنے بھانجوں کے سامنے یا اپنے تعلق کی عورتوں کے سامنے یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا اپنے زیر کفالت مردوں کے سامنے جو عورت کی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی عورتوں کی پس پردہ چیزوں سے آشنا نہ ہوں اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو اور اے ایمان والو! سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو.شاید تم فلاح پاؤ۔

اس آیت میں عورتوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ اگر تمہارے شوہر کے علاوہ دوسرے مرد تمہارے گھر میں داخل ہوں تو ان کی موجودگی میں اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے تمہیں کیا کرنا ہے۔ پہلے تو ہدایت دی کہ تم بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھو. آنے والے مرد کی طرف خواہ مخواہ نگاہیں اٹھا کر مت دیکھو اور اس کا اہتمام کرو کہ تمہارے جسم کا کوئی وہ حصہ کھلنے نہ پائے جس سے آنے والے اس مرد کا شیطان جاگ سکتا ہو. ورنہ وہ اس کے لئے امکانات تلاش کرنا شروع کرے گا. اسی طرح اس کے سامنے اظہار زینت سے گریز کرو تم اپنا رنگ اور اپنا کپڑا تو نہیں چھپا سکتیں لیکن ان کی نمائش سے اجتناب بہر حال ناگزیر ہے. البتہ اگر گھر میں آنے والا مرد تمہارا کوئی قریب ترین رشتہ دار ہے. جس کی حیثیت محرم کی ہے تو اس کی طرف دیکھنے یا اپنے سامان زینت کے ساتھ آنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے. مثلا تمہارا شوہر ہو، باپ ہو، شوہر کا باپ ہو، تمہارا بیٹا ہو، تمہارے شوہر کا اس کی دوسری بیوی سے بیٹا ہو، تمہارا بھائی ہو، بھتیجہ ہو، یا بھانجہ ہو یا وہ عورتیں ہوں جن سے تمہارا خاص تعلق ہو یا تمہارے غلام اور باندی ہوں یا پھر ایسے بوڑھے مرد ہوں جن کی کفالت تمہارے گھر کے لوگ کر رہے ہوں یا ایسے چھوٹے بچے ہوں جنہیں تمہاری نسوانیت کا ابھی شعور نہ ہو لیکن ان کے سامنے بھی پاؤں پٹخ کر اور اپنی زینت کا اظہار کرتی ہوئی نہ پھرو، بلا شبہ ان لوگوں سے فتنہ کا زیادہ اندیشہ نہیں ہے لیکن تمہاری نسوانیت تمہارے شوق اظہار زینت کی وجہ سے مسائل پیدا کر سکتی ہے اس لئے حتی الامکان احتیاط ضروری ہے۔

اور آخر میں اللہ تعالی نے یہ ہدایت دی کہ اگر ابھی تک اس سلسلہ میں عدم واقفیت کی وجہ سے تم سے لاپرواہی ہوتی رہی ہے تو اللہ سے توبہ کرو اور آئندہ پھر اس طرح کی لاپرواہی نہ ہو۔

غیر شادی شدہ مرد و خواتین کے نکاح کی ہدایت:

معاشرے میں بالغ مرد یا بالغ عورت کسی وجہ سے ازدواجی زندگی گزارنے سے محروم رہ جائیں تو ان کے جنسی استحصال کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے، ہمارے سماج میں کتنے ہی مرد ہیں جو اپنی غربت یا برادرانہ عصبیت کے سبب نکاح نہیں کر سکے ہیں اسی طرح کتنی ہی خواتین ہیں جو اپنے سرپرستوں کی لاپرواہی، غربت یا خوبصورت نہ ہونے کی وجہ سے ازدواجی زندگی گزارنے سے محروم ہیں. ایسے مردوں یا عورتوں کے سلسلے میں قرآن مجید معاشرہ کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ وہ ان کی شادیوں کا بندوبست کرے. فرمایا:

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَى مِنكُمْ (النور : ۳۲)

اور تم میں سے جو بے جوڑا ہوں ان کے نکاح کراؤ۔

جو مرد یا عورت ازدواجی زندگی سے محروم ہو اس کے اندر جنسی خواہش کے دباؤ کے نتیجہ میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اس کی یہ کمزوری اس کی مجبوری اور بڑھا دیتی ہے اور جب صورت حال یہ پید ہو جاتی ہے تو شیطان کی دراندازی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں .اس لئے سماج کو پاک رکھنے اور اپنے بھائی بہنوں کو جنسی استحصال سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے نکاح کا بندوبست کیا جائے ،ان کے لئے رشتہ تلاش کیا جائے ،شادی کرنے میں ان کی مدد کی جائے ،اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے انہیں سہارا فراہم کیا جائے ۔جنسی استحصال صرف عورتوں ہی کا نہیں ہوتا بلکہ مردوں کا بھی ہوتا ہے .عورتوں کے جنسی استحصال کی خبر تو بہت عام ہے لیکن مردوں کے جنسی استحصال کے واقعات بھی گاہے گاہے سننے میں آتے رہتے ہیں۔ متعدد بار پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا پر یہ خبریں آئیں کہ عورتوں کی ایک ٹولی نے کئی دنوں تک مسلسل ایک نوجوان کو یرغمال بنائے رکھا اور اس کا جنسی استحصال کرتی رہی اور بالآخر موقع پا کر وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور کسی طرح اس نے اپنی جان بچائی۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے معاشرہ کو یہ ہدایت دی کہ وہ ہر اس شخص کی شادی کا انتظام کرے جو یا تو بیوی آشنا ہونے کے بعد اب اپنے جوڑے سے محروم ہے یا اس کی کسی مجبوری کی وجہ سے ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اسی طرح ہر اس عورت کی شادی کا انتظام کرے جو یا تو شوہر آشنا ہونے کے بعد اب اپنے جوڑے سے محروم ہے یا کسی مجبوری کی وجہ سے ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔

اگر ان ہدایات پر عمل کیا جائے تو جنسی استحصال کا سد باب ہو سکتا ہے ۔ادھر جب سے جنسی استحصال کے واقعات زیادہ رونما ہونے لگے ہیں لوگوں نے اس کے سد باب کے لئے سخت ترین قانون بنانے کا مطالبہ شروع کر دیا ہے، حالانکہ اسلام میں اس کے سخت ترین قوانین موجود ہیں بعض حالات میں سو کوڑے اور بعض میں رجم کی سزا تجویز کی گئی ہے .اگر ان سزاؤں کے نفاذ کو یقینی بنا دیا جائے تو جنسی استحصال یکسر ختم ہو جائے گا۔

تلاوت وتدبر کے چند راہنما اصول

کمال اختر قاسمی

آج مسلمانوں کی بڑی تعداد اس عظیم ترین کتاب سے دور ہوتی جارہی ہے جو دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی اورانسانیت کی ہدایت ورہ نمائی کے لئے نازل کی گئی ہے، سب سے اہم ترین نعمت جو ہمارے پاس ہے وہ یہی قرآن مجید ہے، یہ بذات خود عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف سے ہدایت ورحمت کے حصول کا سب سے اہم ترین ذریعہ بھی ہے۔

ارشاد باری ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ. قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (یونس:۵۸)۔

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت، دلوں کی بیماریوں کی شفا اور مومنوں کے لئے ہدایت ورحمت آ پہنچی ہے، آپ کہہ دیجئے کہ یہ کتاب اللہ کے فضل اور اس کی مہربانی سے نازل ہوئی، تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں یہ اس سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

قرآن مجید کے تئیں افراد امت بالعموم بے اعتدالی کا شکار ہیں۔امت کا ایک طبقہ جو قرآن مجید کو سینے سے لگائے ہوئے ہے وہ قرآن کریم کے ظاہری الفاظ کی تزئین اور مخارج کی ادائیگی کو ہی اصل اصیل سمجھ رہا ہے، اور قرآن میں موجود عبرت ونصیحت اور زندگی

گذارنے کے راہنما اصول کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں ہے۔ جب کہ دوسرا طبقہ قرآنی آیات میں تفکر و تدبر کو اصل قرار دیکر الفاظ قرآن کی صحت کے ساتھ ادائیگی کو غیر ضروری سمجھتا ہے، چنانچہ مواعظ وغیرہ پیش کرنے کے دوران تلاوت قرآن کی غلطیاں خوب سنائی دیتی ہیں، اوراس کو کوئی اہم معاملہ بھی نہیں سمجھا جاتا ہے۔

اس کے برعکس جب ہم قرآن وسنت اور اسلاف کی تصریحات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دونوں طرز ہائے عمل محتاج اصلاح نظر آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صحت کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنا اس کا سمجھنا اوراس پر تدبر وتفکر کرنا سب کا مطلوب ومقصود ایک ہے، اوروہ ہے خدا سے گہرا ربط، خدا کی معرفت، اعمال وکردار اور اخلاق کی اصلاح۔

تلاوت قرآن کی اہمیت:

قرآن مجید کے چند مقامات میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب و الحکمة. (جمعہ:۲)۔

خدا وہی ہے جس نے امیوں میں انہیں میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا تاکہ وہ اس کی آیتوں کو پڑھ کر سنائے، ان کا تزکیہ کرے اورانہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔

اللہ کے رسول کو اس لئے بھیجا گیا تا کہ وہ خوبصورت لب و لہجے میں تلاوت کرے اوراس کو مقصود اول قرار دیا گیا، لوگوں کے سامنے تلاوت کرنے کا صرف یہی مقصد نہیں ہے کہ لوگ الفاظ قرآن سے واقف ہوجائیں، بلکہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگ اسی طرح سے پڑھنا سیکھ لیں۔

الفاظ قرآن کی تحسین وتزئین کے لئے قرآن واحادیث میں تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:"ورتل القرآن ترتیلا (مزمل:۴) قرآن کو صاف صاف پڑھو۔

احادیث مبارکہ میں جگہ جگہ قرآن کے الفاظ کو خوبصورت آواز سے مزین کرنے

پر زور دیا گیا ہے۔

عن سعد بن وقاص و عن ابی لبابة تبشیر بن عبد المنذر قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من لم یتغن بالقرآن فلیس منا(۱)

جس نے قرآن کو خوبصورت آواز سے مزین نہیں کیا وہ ہم میں سے نہیں

ایک ایک لفظ کی تلاوت پر دس نیکیوں کے اجر کی بشارت دی گئی۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من قرء حرفا من کتاب الله فله به حسنة والحسنة بعشر امثالها، لا اقول الم حرف بل الف حرف، ولام حرف و میم حرف.(۲)

جس شخص نے کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھا اس کے لئے اس کے بدلہ ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس گنے کے ساتھ ہے، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ الم ایک حرف ہے، بلکہ الف الگ حرف ہے، لام الگ حرف ہے اور میم الگ ایک حرف ہے۔

ایک حدیث میں تلاوت قرآن کو زنگ آلود قلوب کی صفائی کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم إن هذه القلوب تصدأ کما یصدأ الحدید اذا أصابه الماء، قیل یا رسول الله و ما جلاء ها؟ قال: کثرة ذکر الموت و تلاوة القرآن (بیہقی کتاب فضائل القرآن)۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: دل زنگ آلود ہو جاتا ہے جس طرح لوہے پر جب پانی لگ جائے تو وہ زنگ آلود ہو جاتا ہے، آپ سے پوچھا گیا کہ دل کو زنگ سے صاف کرنے کا کیا طریقہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کثرت سے موت کو یاد کرنا اور کثرت سے قرآن کی تلاوت کرنا۔

ایک جگہ کہا گیا کہ قیامت کے دن قرآن ان لوگوں کے لئے سفارشی بن کر آئے گا جو قرآن کی تلاوت کے عادی ہونگے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: إقرء القرآن فانه یاتی یوم القیامة شفیعا لا صحابه(۳)

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: قرآن پڑھتے رہو، کیونکہ یہ قیامت کے روز ان لوگوں کے لئے سفارشی بن کر آئے گا جو قرآن پڑھتے ہیں۔

قرآن کی تلاوت کرنے والے کو مالٹا کی طرح پسندیدہ مانا گیا ہے۔

عن ابی موسیٰ الاشعریؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل المومن الذی یقرأ القرأن کمثل الأترجة ریحها طیب و طعمها طیب،ومثل المؤمن الذی لایقرأ القرآن کمثل التمرة لا ریح لها و طعمها حلو، ومثل المنافق الذی یقرأ القرآن مثل الریحانة ریحها طیب و طعمها مرٌّ. و مثل المنافق الذی لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلة لیس لهاریح و طعمها مرٌّ(۴)۔

قرآن پڑھنے والے مومن کی مثال اس مالٹے کی مانند ہے جس کی بو اور ذائقہ دونوں پسندیدہ ہے، قرآن کی تلاوت نہ کرنے والے مومن کی مثال کھجور کے مانند ہے جس کی کوئی بو نہیں ہے البتہ مزہ میٹھا ہے، اور قرآن پڑھنے والے منافق کی مثال ریحانہ (پھول) کی مانند ہے، جس کی بو پسندیدہ ہے مزہ تلخ ہے اور قرآن کی تلاوت نہ کرنے والے منافق کی مثال حنظلہ کی مانندی ہے جس کی کوئی بو بھی نہیں ہے اور مزہ بھی تلخ ہے۔

قرآن کی تلاوت کو جنت میں ترقیٔ درجات کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اقرأ و ارتق و رتل کما کنت ترتل فی الدنیا بأن منزلتک عند آخر آیة تقرأها.(۵)

قرآن پڑھتے جاؤ اور اوپر چڑھتے جاؤ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھو جس طرح دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے (اور جنت کے درجات طے کرتے جاؤ) وہی تمہاری منزل ہوگی جہاں تمہاری قراءت پوری ہوگی۔ (ابوداؤد، کتاب الوتر، باب کیف یستحب الترتیل فی القراءۃ:۱۴۶۴)۔

تلاوت قرآن کے اصول وآداب:

ذیل میں تلاوت قرآن کے کچھ اصول پیش کئے جارہے ہیں جن کی روشنی میں تلاوت قران کے عظیم مقاصد تک پہنچنے میں کچھ مدد مل سکتی ہے۔

اس کتاب مقدس کو چھونے سے پہلے اس یقین کی تجدید کرنی چاہئے کہ یہ اس مالک کائنات کا کلام ہے جس کی طاقت وقدرت سے باہر کوئی چیز نہیں ہے، اس میں انسان کو خدا سے جوڑنے، خدا کی مرضیات کو سمجھنے، عمدہ سیرت و کردار سے آراستہ ہوکر دنیا اور اہل دنیا کے لئے مفید بننے اور زندگی کو شاہراہ اعتدال پر ڈھالنے کے جامع اصول موجود ہیں۔

تلاوت قرآن کے لئے اس یقین واستحضار کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل شرائط کی رعایت ضروری ہے۔

۱- طہارت:

قرآن کریم کی تلاوت دراصل بندے اور خالق کے درمیان سرگوشی ہے، جس کے لئے طہارت ایک امر لازم ہے، طہارت سے صرف بدن، کپڑے اور جگہ کی پاکی ہی مراد نہیں ہے، بلکہ قلوب کی طہارت بھی ضروری ہے یعنی دل گندے افکار وخیالات اور کدورتوں سے پاک ہو کیوں کہ ایک صاف وشفاف اور پاکیزہ دل ہی خدا کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں:

لو طهرت القلوب لم تشبع من قراءة القرآن.

یعنی اگر قلوب کی پاکیزگی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کی جائے تو قرآن کی تشنگی کبھی ختم نہیں ہوتی (۶)۔

۲- قبلہ کی طرف رخ کرنا:

اس نشست سے تلاوت قرآن میں عبادت کی روح پیدا ہوجاتی ہے اور قرآن کی عظمت کا اظہار بھی ہوتا ہے، اگرچہ اس کے علاوہ دوسری طرف رخ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مقصود تلاوت کرنا ہے۔

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَاماً وَقُعُوْداً وَعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (آل عمران:۱۹۱)

عقلمند وہ ہیں جو کھڑے، بیٹھے لیٹ کر ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں۔

۳۔ نماز کی حالت اور مسجد میں تلاوت کرنا:

ما قعد قوم في مسجد يتلون كتاب الله و يتدارسونه بينهم إلانزلت عليهم السكينة و غشيتهم الرحمة و حفتهم الملٰئكة (۷)۔

جو لوگ مسجد میں بیٹھ کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں ان پر سکونت نازل ہوتی ہے، رحمت ان پر چھا جاتی ہے اور فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں۔

تمام حالتوں میں نماز کی حالت اور تمام جگہوں میں مساجد کو طہارت ونظافت اور فضیلت کے اعتبار سے اہم مقام حاصل ہے، ان حالتوں میں بندے کا خدا سے خصوصی ربط وتعلق رہتا ہے، جس سے بندے کی عبدیت اور خالق کی معبودیت نمایاں ہوتی ہے۔

قرآن کی تلاوت کے لئے ایسی حالت اور ایسی جگہ کا انتخاب کرنا جہاں توجہ ربانی کا عمل ظہور ہوتا ہے قرآن کے مقاصد تک پہنچنے کے لئے انتہائی معین ومفید ہے (۸)۔

(۴) تلاوت کی مقدار:

اعتدال دین اسلام کا خاص امتیاز ہے، عبادات ومعاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی بڑی اہمیت ہے، لہٰذا تلاوت قرآن میں بھی اعتدال ضروری ہے تاکہ عجلت کی وجہ سے قرآن کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو، اس لئے کم سے کم تین دن میں ایک قرآن مکمل کیا جائے، اس سے زیادہ عجلت مناسب نہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کو پسند نہیں فرمایا ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من قرأ في اقل من ثلاث لم يفقهه (۹)۔

جس نے تین دن سے کم میں قرآن مکمل پڑھ لیا اس نے قرآن کو نہیں سمجھا۔

(۵) قرآن کے حصوں کی تقسیم:

جس طرح عبادت اسلام کا اہم ترین حصہ ہے اسی طرح عمل میں دوام واستمرار عبادت کی روح ہے، عمل میں مداومت کی ترغیب آئی ہے۔

عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم: یا عبد الله لاتكن مثل فلان كان یقوم فترک قیام اللیل. (۱۰)۔

اے عبداللہ تم فلاں آدمی کی طرح مت ہو جانا جو تہجد پڑھتا رہتا ہے پھر چھوڑ دیتا ہے، اس لئے قرآن کریم کو چند حصوں میں تقسیم کر کے مداومت کے ساتھ تلاوت کرنی چاہئے، اس سے تلاوت قرآن کی زیادہ سے زیادہ توفیق ملتی ہے، اور قرآن کریم کے فیوض و برکات سے فیضیاب ہونے کے ساتھ ساتھ کلام ربانی سے التزام نصیب ہوتا ہے جو تعلق باللہ کا اہم ترین ذریعہ ہے، صحابہ کرام کا خاص معمول تھا کہ قرآن کو چند حصوں میں تقسیم کر کے پابندی سے تلاوت کرتے تھے (۱۱)۔

ترتیل سے پڑھنا:

قرآن مجید کو صاف صاف اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہئے، اچھی طرح سے الفاظ کی ادائیگی ہو، قرآن میں ارشاد ہے " ورتل القرآن ترتیلا (مزمل:۴)۔ قرآن کو صاف صاف پڑھو۔

قرآن کی تلاوت کا مقصد صرف الفاظ قرآن کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ یہ وہ عبادت ہے جس میں اللہ جل جلالہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، تلاوت قرآن کا ایک اہم ترین مقصد یہ بھی ہے کہ آیات قرآن میں غور وفکر کر کے ہدایت وراہنمائی کے قیمتی اصول حاصل کئے جائیں، قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا قرآن میں غور وفکر اور تدبر وتفکر کے لئے زبردست معاون ہے (۱۲)۔

فہم قرآن:

کسی بھی ہستی کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، ہر کلام میں صاحب کلام کا عکس موجود ہوتا ہے، لہٰذا کلام ربانی کو سمجھے بغیر خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔ تلاوتِ قرآن کی اہمیت وآداب کے تعلق سے جتنی آیات وروایات اوپر پیش کی گئیں ان میں تلاوت سے مراد صرف وہ تلاوت نہیں جو ہمارے یہاں بطور خاص غیر عربی ممالک میں رائج ہے، بلکہ تلاوتِ قرآن کا مطلب ہے اس کو سمجھ کر غور وفکر کے ساتھ پڑھنا، قرآن کو سمجھے بغیر صرف پڑھ لینا تلاوت کا ایک جزء ہے، اس کو سمجھ کر غور وفکر کرنا دوسرا اہم ترین جزء ہے، انفرادی طور پر دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، تاہم تلاوت اس وقت مکمل ہوگی جب اسے سمجھ کر غور وفکر کے ساتھ پڑھا جائے۔

فہم قرآن کے طریقے:

۱- قرآن کی زبان سے واقفیت

قرآن کریم اس لئے نازل نہیں ہوا کہ اس کا مطالعہ کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرلیا جائے، بلکہ اسکا مقصد قرآن مجید میں موجود ان اصولوں کو سمجھنا ہے جن سے خدا کی صحیح معرفت ہوتی ہے، جن سے کلام الٰہی کا اثر قلوب انسانی پر ہوتا ہے۔ قرآن میں بلا کی تاثیر ہے، جب انسان اس کو سمجھ کر تلاوت کرتا ہے تو اس کے اثرات قلوب میں سرایت کر جاتے ہیں، یہ مقصد دوسروں کے ترجمے سے حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ مترجم قرآن میں موجود ان کیفیتوں کو اپنے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا جو کلام الٰہی اور بندوں کے درمیان طاری ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن کی زبان عربی سے اتنی واقفیت ضروری ہے جس سے اصل متن کو سمجھا جاسکے۔

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ (الشعراء:۱۹۲-۱۹۵)

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا، بالکل

واضح عربی زبان میں، جس کو روح الامین لیکر تمہارے قلب پر نازل ہوئے ہیں، تاکہ تم بھی ڈرانے والے پیغمبروں میں سے بن جاؤ۔

نزول قرآن کا چونکہ اہم مقصد غور وفکر کر کے ہدایت ونصیحت حاصل کرنا ہے اور یہ مقصد بلا قرآن کی زبان سیکھے حاصل نہیں ہوسکتا۔

ارشاد ربانی ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ (ص:۲۹)

جو کتاب ہم نے آپ پر نازل کی ہے وہ بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور کریں اور تاکہ اہل عقل اس سے نصیحت حاصل کریں۔

صاحب کلام کی عظمت کا استحضار:

فہم قرآن اور اس کے مقاصد تک پہنچنے کے لئے صاحب کلام کی عظمت کے استحضار کا بہت بڑا دخل ہے، اس استحضار کی وجہ سے کلام کی اہمیت اور اس سے اپنا تعلق جوڑنے کا داعیہ اور اس سرچشمۂ ہدایت سے فیضیاب ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

استحضار قلب:

قرآن کو سمجھنے کے لئے استحضار قلب لازمی امر ہے، تاکہ لغو خیالات دل میں جگہ نہ کرسکیں، ذہنی ساخت اور حضور قلب کو قرآن کریم سے ہدایت اور معرفت الٰہی کے حصول کے تابع کرنا چاہئے، اگر ذہنی ساخت قرآنی فکر سے ہم آہنگ نہیں ہوگی تو قرآن مجید راہ ہدایت کی تعیین نہیں کرسکتا، بلکہ انسان الٹے گمراہی اور ضلال کے گڑھے میں گرسکتا ہے۔

هُوَ الَّذِيَ أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاء الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاء تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلاَّ اللّهُ. (آل عمران:۷)۔

وہی تو ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں وہی اصل کتاب ہیں، اور بعض متشابہ ہیں، تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑ

جاتے ہیں، تاکہ فتنہ برپا کریں اور ان کی مراد اصلی کا پتہ لگائیں حالانکہ متشابہات کی اصل مراد اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

جو لوگ حضور قلب کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں انہیں کو قرآن سے نصیحت و ہدایت حاصل ہوتی ہے۔

إن في ذلک لذکریٰ لمن کان له قلب أو ألقی السمع وھو شھید. (ق:۳۷)

بے شک اس کتاب میں انہیں لوگوں کے لئے نصیحت ہے جن کے پاس بیدار دل ہو، یا جو حضور قلب کے ساتھ کان لگا کر سنے۔

اگر کسی وقت غفلت ہو جائے اور استحضار قلب نہ رہے تو آیت کا بار بار اعادہ کرنا چاہیے اس سے استحضار قلب کی عادت ہو جائے گی (۱۳)۔

۴- تدبر:

تدبر کے معنی ہیں امور کے انجام میں غور و فکر کرنا، آیات قرآن میں تدبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کوئی نتیجہ اس لئے اخذ کرنا تاکہ ان سے نصیحت وعبرت کا پہلو واضح ہو جائے (۱۴)۔

آیات کے انجام ونتائج پر غور وفکر کرنے کے ساتھ ان آیات کو اپنی عملی زندگی میں لے آنے سے تدبر کی صلاحیت میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ پہلی ہی مرتبہ میں آیت سے اس کا صحیح نتیجہ برآمد ہونا ضروری نہیں اگر اصل قرآن کو سمجھ لینے، استحضار قلب اور آیت کو اپنی عملی زندگی میں لے آنے کے بعد بھی تدبر کا یہ مقام حاصل نہ ہو تو انہیں شرائط کی رعایت کے ساتھ آیت کو بار بار دوہرایا جائے۔

عن ابی ذرؓ قال: قام رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بنا لیلة فقام بآیة یرددھا وفی روایة: فقرء بآیة حتی الصباح یرکع بھا و یسجد بھا، وھی: إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ. (مائدہ:۱۱۸)

فلما أصبح قلت یا رسول اللہ ما زلت تقرء ھذہ الآیة حتی

اصحبت ترکع بها و تسجدبها. قال إني سئلت ربي عز و جل الشفاعة لأمتي فاعطانيها، وهي نائلة إن شاء الله لمن لا يشرك بالله شيئا (۱۵)۔

ابوذرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت (اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو زبردست حکمت والا ہے) رات سے صبح تک بار بار دوہراتے رہے، ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ جب صبح ہوئی تو میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ صبح تک یہ آیت کیوں پڑھتے رہے، آپ نے فرمایا میں اللہ سے اپنی امت کے لئے شفاعت کی درخواست کرتا رہا اور اللہ نے مجھے شفاعت دیدی اور اس کا حق دار ہر وہ شخص ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

۵- تامل وتفکر:

آیات قرآن میں غور وفکر اور تدبر کے ساتھ آیت کے پس منظر اور اس کے لازمی نتیجہ کے انطباق سے حقیقت کا اخذ کرنا تامل وتفکر کہلاتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ کی صفات وافعال، انبیاء علیہم السلام کے احوال، مکذبین کی ہلاکت وتباہی، جنت وجہنم، اوامر ونواہی وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ ہے، اللہ کی صفات پر غور وفکر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح خدا کے افعال جیسے آسمان وزمین، انسان وحیوان، چرند وپرند اور بہت سی مخلوقات کی تخلیق پر غور وفکر کے نتیجہ میں خالق کی قدرت وطاقت کا اندازہ ہوتا ہے، اسی طرح مکذبین جیسے عاد وثمود کی خوفناک تباہیوں پر مشتمل آیات میں غور وفکر کرنے سے اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہوتا ہے، انبیاء کرام پر ایمان لانے والوں کے ساتھ اللہ کی خصوصی نصرت ومدد پر مشتمل مضامین میں تامل وتفکر سے راہ حق اختیار کرنے والوں کے لئے اللہ کی مدد ونصرت کا اندازہ ہوتا ہے، جنت کے خوبصورت احوال اس کی نعمتوں اور آسائشوں پر مشتمل آیات میں غور وفکر کرنے سے ان اعمال اور طریقہ کار کو اختیار کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے جو جنت کی راہنمائی کرتے ہیں، جن آیات میں دوزخ کے شدائد ومشکلات اور اس کی خوفناکیوں کا تذکرہ ہے ان پر غور وفکر کرنے سے ان اعمال سے

بچنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے جو دوزخ میں لے جانے والے ہیں، اس طرح بے شمار مضامین و معانی پر مشتمل آیات ہیں جن پر غور وفکر کر کے ان کے لازمی نتائج تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے، اسے تامل وتفکر کہا جاتا ہے(۱۶)۔

فہم قرآن کے موانع:

چند ایسے عوامل ہیں جوفہم قرآن کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں، امام غزالیؒ نے احیاءعلوم الدین میں خصوصی توجہ دلائی ہےاوران موانع کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

۱- حروف کے مخارج ومأخذ میں شدید انہماک:

حروف کے مخارج کی تحقیق وجستجو میں شدید انہماک فہم قرآن کے لئے سخت مانع ثابت ہوتا ہے، کیونکہ قاری کی ساری توجہ اس طرف مرکوز ہوتی ہے کہ آیا وہ لفظ اپنے صحیح مخرج سے نکلا یانہیں اس کا ماخذ اشتقاق کیا ہے۔

اس طرح کے شدید انہمام سے قوت فکر کا صحیح استعمال نہیں ہو پاتا، جس سے قرآن مجید میں موجود باریک معانی کا انکشاف دشوار ہوجاتا ہے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کے صحیح مخارج کو جاننے کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ قرآن کا صحیح مخارج سے تلاوت کرنا ضروری ہے،لیکن اس کی تحقیق وتدقیق کو اپنا مقصد علم وہنر نہ سمجھا جائے کہ سارا زوراور خدا کی عنایت کردہ فطری صلاحیتوں کو اسی میں صرف کردیا جائے(۱۷)۔

۲- تدبر وتفکر کی صلاحیت کو اسلاف کے تابع کردینا

قرآن مجید ہر زمانے اور ہر ماحول کے لئے ایک مثالی کتاب ہے، ہر طرح کے حالات کے لئے اس میں کامل درجہ کی رہنمائی موجود ہے، لہٰذا ہمارے بزرگوں اور جلیل القدر اسلاف نے اپنے زمانے اور ماحول کے لحاظ سے قرآن کریم کو سمجھ کر جو تحقیقی مواد اور قیمتی تشریحات چھوڑی ہیں وہ ہمارے لئے نئی راہیں مقرر کرنے کے لئے یقیناً معاون ہیں لیکن یہ آخری اور حتمی نہیں کہ غور وفکر کا دروازہ بند کردیا جائے، ہمارا کام صرف اسلاف کے آراءاوراقوال کی نقالی کرنانہیں، یہ فہم قرآن کے لئے زبردست مانع ہے(۱۸)۔

۴۔ گناہوں پر اصرار

قرآن کریم ہدایت اور مالک حقیقی سے ربط وتعلق پیدا کرنے والی کتاب ہے، ہدایت اور معرفت الٰہی ایک ایسا لطیف اور روحانی معاملہ ہے جس کا گہرا تعلق قلوب سے ہے،قلوب کی صفائی اور پاکیزگی کے بغیر یہ کتاب نہ تو راہ ہدایت فراہم کرسکتی ہےاور نہ ہی خدا سے تعلق، بلکہ الٹے ہماری تباہی وبربادی کا سبب بن سکتی ہے۔

ان الله يرفع بهذا الكتاب اقواما و يضع به آخرين. (۱۹)۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو بلندی نصیب کرتا ہے اور بہتوں کو قعر مذلت میں ڈھکیل دیتا ہے۔

إِنَّ هَـــذَا الْقُـرْآنَ يِهْـدِي لِلَّتِـي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْراً كَبِيْرا. (بنی اسرائیل:۹)

یہ کتاب ان لوگوں کے لئے ہدایت فراہم کرتی ہے جو درست ہو اور ایسے مومنین کے لئے خوشخبری جو اچھے اعمال کرتے ہیں، اوران لوگوں کے لئے بڑا اجر ہے۔

تَبْصِرَةً وَذِكْرَى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ (ق:۸) یہ راہنمائی اور یاددہانی ہےان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

ومـا يتـذكـر إلا من ينيـب، وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

گناہوں پر اصرار سے قلوب زنگ آلود ہو جاتے ہیں، اللہ ایسے قلوب کو ہدایت نہیں دیتا جو گناہوں کے سیاہ پردے میں چھپے ہوئے ہوں، بلکہ ان پر مہر لگا دی جاتی ہے۔

عـن ابی هريرة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن العبد إذا أخـطـأ خطيئة نكتت في قلبه نكتة سوداء فاذا هو نزع و استغفر و تاب سـقـل قـلبـه، و إن عـاد زيـد فيها حتى تعلو قلبه و هو الران الذى ذكر الله (كلا بل ران علىٰ قلوبهم ما كانو يكسبون(۲۰)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ جب ایک گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے، جب اس سے باز آ جاتا ہے، توبہ اور استغفار کر لیتا ہے تو اس کے دل کو صاف کر دیا جاتا ہے، اور اگر دوبارہ گناہ کرتا ہے تو اس داغ میں اور اضافہ کر دیا جاتا ہے حتی کہ وہ داغ اس کے دل پر پوری طرح چھا جاتا ہے اسی کو قرآن میں مہر کیا گیا ہے،

كلا بل ران على قلوبهم ما كانو يكسبون۔

تلاوت قرآن اور فہم قرآن کے اصل مقاصد:

(۱) قرآن کے اثر کو قبول کرنا

قرآن انسان کے اندر آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے، دنیا کے عیش و آرام کو بھلا کر آخرت کے غم میں ڈبو دیتا ہے۔

قرآن کریم میں مختلف مضامین پر مبنی آیتیں ہیں وعدۂ مغفرت کی آیتیں، وعید کی آیتیں، کہیں جنت کی پرعیش زندگی کا تذکرہ کہیں جہنم کے عذاب کی ہولنا کیوں کا بیان، کہیں قیامت اور اس کے شدائد کا ذکر۔

تلاوت کرتے ہوئے جب جہنم کی ہولنا کیوں اور قبر کے مشکلات وغیرہ مفاہیم پر دلالت کرنے والی آیتوں سے گذر ہو تو یوں ہی سرسری طور پر نہیں پڑھ لینا چاہئے بلکہ ان حالات و کیفیات کا تصور کرنا چاہئے جو ان آیات میں درج ہیں۔

إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّداً وَبُكِيّاً (مریم:۵۸)

جب ان کو رحمٰن کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَاباً مُّتَشَابِهاً مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللّهِ ذَلِكَ هُدَى اللّهِ يَهْدِيْ بِهِ مَنْ يَشَاءُ (الزمر:۲۳)

اللہ تعالیٰ نے انتہائی اچھی بات نازل فرمائی یعنی ایسی کتاب کی شکل میں جس کی آیتیں باہم ملتی جلتی ہیں، اور دہرائی جاتی ہیں، جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان

کے بدن کے رونگٹے اس سے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یہی ہے اللہ کی ہدایت، وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا (بنی اسرائیل:۱۰۹)

اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گر پڑتے ہیں، اور یہ قرآن ان کی عاجزی ورقت میں اور اضافہ کرتا ہے۔

پچھلی قوموں کی نافرمانیاں اور ان کی ہلاکتوں پر مشتمل آیات سے گذر ہو تو وہاں بھی ان اسباب پر غور کرنا چاہیے جو ان کی تباہی و بربادی کے لئے محرک ثابت ہوئے۔

أَوَ لَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَاراً فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ (مومن:۲۱)

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں، جو ان سے زیادہ طاقتور اور حکومت والے تھے، اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی وجہ سے ان کی پکڑ کی ان کو اللہ سے کوئی بچانے والا نہیں ہوا۔

اسی طرح وعدۂ مغفرت، جنت کی خوشخبری، اس کی پرعیش اور کامیاب زندگی پر مشتمل آیات سے سامنا ہو تو وہاں ان لذتوں اور پرمست کیفیتوں کو ذہنوں پر طاری کر کے ان کے حصول کی راہوں پر غور کرنا چاہیے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النحل:۹۷)۔

جو کوئی اچھا عمل اختیار کرے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور آخرت میں بھی ان کے اچھے کاموں کا پورا بدلہ دیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلاً. خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلاً (کہف:۱۰۷-۱۰۸)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اعمال کئے ان کے لئے ضیافت کے طور پر فردوس کے باغات ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ خود بھی وہاں سے جگہ بدلنا نہیں چاہئیں گے۔

تمام اداب وشرائط کوملحوظ رکھ کرقرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اس کتاب عظیم کی رقت آمیز اثرات ضرور مرتب ہونگے۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَى أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (المائدہ:۸۳)

اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر نازل کیا گیا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے حق بات پہچان لی اور وہ دعاء کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے پس تو ہمیں ماننے والوں میں لکھ لے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَاناً وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ. (انفال:۲)

مومن تو بس وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز اٹھتے ہیں، اوران کے سامنے اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

احادیث میں قرآن کے اثرات طاری کرنے کا بار بار حکم دیا گیا ہے:

عن سعد بن وقاص قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن هذا القرآن نزل بحزن فاذا قرء تموه فابكوا، فان لم تبكو فتبا كوا و تغنوا فمن لم يتغن بالقرآن فليس منا. (۲۱)۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ یہ قرآن غم اورحزن لے کر نازل ہوا ہے، جب تم اس کو پڑھوتو تمہیں رونا چاہئے ، اگر تمہیں رونا نہ آئے تو اپنے اوپر رونے کی کیفیت طاری کرو، قرآن کوترنم کے ساتھ پڑھو، جو شخص قرآن کوترنم کے ساتھ نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے اثرات:

ایک مرتبہ اللہ کے رسولؐ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا کہ مجھے قرآن سناؤ، ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے سورہ نساء شروع کی، جب اس آیت پہ پہنچا: فكيف اذا جئنا من كل امة بشهيد و جئنا بك على هؤ لاء شهيدا. (نساء:۳۰)

(اس وقت کیا ہوگا جب ہر امت میں سے ایک گواہ کو لایا جائے گا اور آپ کو ان تمام پر گواہ بنا کر لایا جائے گا) تو میں نے دیکھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہے، اور آپؐ نے فرمایا: بس کافی ہے (۲۲)۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ پر بڑھاپا چھا گیا ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: ہاں مجھے سورہ ہود، سورہ مرسلات، سورہ نبا، اور سورہ تکویر نے بوڑھا بنا دیا (۲۳)۔

صحابہ کرام پر قرآن کے اثرات:

امام غزالی نے احیاء علوم الدین میں ایسے بہت سے واقعات بیان کئے ہیں:

ایک مرتبہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے کسی کو یہ آیت (إن عذاب ربک لواقع ماله من دافع آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا) پڑھتے ہوئے سنا تو آپؓ خوف سے چیخ اٹھے، اور بیہوش ہوکر گر پڑے لوگ انہیں گھر تک اٹھا کر لئے گئے، عذاب کے خوف کا یہ عالم تھا کہ ایک ماہ تک مسلسل بیمار رہے (۲۴)۔

اور بعض تابعین کے بارے میں یہاں تک بیان کیا گیا ہے آیات وعید سن کر موت تک واقع ہوگئی۔

ازارہ بن اوفی مشہور تابعی ہیں لوگوں کی نماز میں امامت فرمایا کرتے تھے، یہ آیت (فاذا نقر فی الناقور فذالک یومئذ یوم عسیر ،مدثر ۹-۸)۔ (جب صور پھونکا جائے گا تو وہ بہت مشکل ترین دن ہوگا)۔

پڑھتے پڑھتے چیختے ہوئے گر پڑے یہاں تک کہ محراب میں ہی موت واقع ہوگئی (۲۵)۔

یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اسلاف کی قرآن کے ذریعہ اثر پذیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۲) عمل کی نیت سے قرآن مجید کا مطالعہ کرنا:

قرآن مجید نازل ہی اس لئے ہوا ہے کہ کہ اس پر عمل کیا جائے ،اگر ہر ہر آیت پر عمل کا جذبہ نہیں ہوا تو اس کا مطالعہ بے سود ہے۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ .الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَئِكَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ (الزمر:۱۸)

اے نبی بشارت دیجئے میرے ان بندوں کو جو اللہ کا کلام توجہ سے سنتے ہیں اور عمدہ طریقہ سے اس کی پیروی کرتے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی اور یہی لوگ عقلمند ہیں۔

وَهَـذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (انعام:۱۵۵)

اور ہم نے یہ برکت والی کتاب اتاری ہے،اس کی پیروی کرو اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے کی نیت کرنا:

جنات نے ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ سے قرآن مجید سنا تو فوراً اس کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے اپنی قوم کی طرف لوٹے۔

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَراً مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَى قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ (احقاف:۲۹)

اور جب ہم نے جنوں میں سے ایک جماعت آپ ﷺ کی طرف متوجہ کردی کہ وہ قرآن کو غور سے سن رہی تھی ، جب وہ اس کے پاس آئی تو کہنے لگی خاموش رہو۔ پھر جب پڑھنا مکمل ہوگیا تو اپنی قوم کی طرف واپس چلی گئی تا کہ انہیں ڈرائیں۔

فہم قرآن، تلاوت قرآن اور اس کے مقصد نزول کے تعلق سے ایک مطالعہ پیش کیا گیا ہے جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کو صحیح مخارج وآداب کے ساتھ پڑھنے اور مراد ربانی کو سمجھ کر عام کرنے کی جو ہماری شرعی ذمہ داری ہے اسے

ادا کرنے کے لیے ہم خود تیار ہوں اور امت کے ہر ہر فرد کو اس ذمہ داری کا احساس دلایا جا سکے۔ اللہ سے دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کی تلاوت کرنے، صحیح فہم حاصل کرنے اس کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے اور اس کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔

ماخذ ومراجع

۱- ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیہا، باب فی حسن الصوت بالقرآن

۲- ترمذی: ۲۹۵۰ باب ماجاء فی من قرء حرفا من القرآن مالہ من الاجر

۳- مسلم: باب فضل قرائۃ القرآن وسورۃ البقرۃ

۴- بخاری: ۵۰۲۰، باب فضل القرآن علی سائر الکلام

۵- ابوداؤد، ترمذی کتاب فضائل القرآن، باب ان الذی لیس فی جوفہ من القرآن کا البیت الخرب.

۶- احیاء علوم الدین، ج ۲ ص ۳۸۹، بحوالہ الدراسات الاسلامیہ محرم-ربیع، ۱۴۲۹ھ

۷- ترمذی: ۲۹۴۵، باب ماقعد قوم فی مسجد یتلون کتاب اللہ

۸- احیاء علوم الدین، جلد ا ص ۳۶۱

۹- ترمذی باب ماجاء ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف

۱۰- متفق علیہ بحوالہ ریاض الصالحین

۱۱- احیا علوم الدین، ج ا ص ۳۶۱-۳۶۲

۱۲- احیاء علوم الدین، ج ا ص ۳۷۱

۱۳- احیاء علوم الدین، ج ا ص ۳۶۹

۱۴- اساس البلاغۃ: مادہ متعلق ص ۱۸۲

۱۵- نسائی باب الترديد، ابن ماجہ، اقامة الصلاة و السنة فيها)۔(باب ماجاء فی القراءۃ فی صلاۃ اللیل، مسند احمد فی مسند الانصارؓ، حدیث ابی ذر الغفاریؓ

۱۶- احیاء علوم الدین، ج ۱ص ۳۷۰ تا ۳۸۱

۱۷- احیاء علوم الدین، ج ۱ص ۳۷۱

۱۸- احیاء علوم الدین، ج ۱ص ۳۷۱-۳۷۲

۱۹- مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل من يقوم بالقرآن و يعلمه، ۱۸۹۷

۲۰- ترمذی، باب ومن سورة ويل للمطففين: ۳۳۳۴

۲۱- ابن ماجه، کتاب اقامة الصلوٰة و السنة فيها، باب فی حسن الصوت بالقرآن

۲۲- بخاری: باب فکیف اذا جئنا من کل امۃ

۲۳- ترمذی، ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللہ، باب من سورۃ الواقعہ

۲۴- احیاء علوم الدین جلد ۱، ص ۳۸۴

۲۵- احیاء علوم الدین، جلد ۱، ص ۳۸۵

دارالعلوم دیوبند اور اس نہج پر چلنے والے مدارس میں تفسیر کی تدریس

اشتیاق احمد قاسمی

قرآنِ کریم کتاب قراءت ہی نہیں کتابِ ہدایت بھی ہے، اس کی ہدایت کا دائرہ ساری انسانیت کو محیط ہے۔ (بقرہ:۱۸۵) اس میں پہلی امتوں کے (سبق آموز) واقعات ہیں، آئندہ رونما ہونے والے حوادث کی آگہی ہے، اور زمانۂ حال کے مسائل کا حل ہے، اس کی باتیں فیصلہ کن ہیں، یہ دل لگی کی باتیں نہیں ہیں، جو سرکش اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو توڑ دیں گے اور جو قرآن کریم سے ہٹ کر ہدایت تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو گمراہ کر دیں گے، یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، یہ حکمت بھرا نصیحت نامہ ہے اور یہ سیدھا راستہ ہے۔[۱]

قرآنِ کریم کے بعض مضامین تو بہت آسان ہیں، سب سمجھ سکتے ہیں، چند احکام صرف اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں، اور بعض مضامین اتنے اونچے ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ان کا علم ہے، مثلاً حروفِ مقطعات کا مفہوم۔

علامہ سیوطیؒ نے الاتقان فی علوم القرآن میں قرآن پاک کی آیتوں کے چار درجے بیان فرمائے ہیں:

۱- قرآن کی بعض آیات تو ایسی ہیں جن کو عرب محض عربی دانی کی وجہ سے سمجھ لیتے ہیں۔

۲- بعض آیات ایسی ہیں جن کا سمجھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، اور ہر ایک سمجھ بھی سکتا ہے۔

۳۔ بعض آیات کا مطلب صرف علماء ہی سمجھ سکتے ہیں، دوسرے کے بس کی بات نہیں۔

۴۔ بعض آیتوں کا مفہوم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

تفسیر کے مراحل:

ہمارے مدارس میں قرآنِ پاک کی تفسیر تین مرحلوں میں پڑھائی جاتی ہے، پہلے ترجمۂ قرآن مجید، پھر جلالین شریف پڑھائی جاتی ہے اور بالکل اخیر میں تکمیل تفسیر ہے، جسے دورۂ تفسیر یا تخصص فی التفسیر بھی کہا جاتا ہے۔

پہلا مرحلہ:

ہمارے نصاب کی خصوصیت ہے کہ قرآنِ پاک کا ترجمہ مکمل پڑھایا جاتا ہے، اس میں بھی تدریج ہے، پورے قرآنِ پاک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

سوم عربی میں ترجمۂ قرآن مجید:

عربی سوم سے اس کی ابتداء ہوتی ہے؛ اس لیے کہ اس سے پہلے دو سالوں میں نحو، صرف اور عربی زبان کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، سوم عربی میں وہ اس لائق ہوجاتے ہیں کہ ان کو قرآنِ پاک کا ترجمہ پڑھایا جائے؛ اگر طلبہ نحو، صرف اور عربی زبان میں کمزور ہوں تو انھیں ہرگز ترقی نہ دی جائے، یہ ان کے حق میں بہتر ہے، اس کے بہتر ہونے کا احساس ان کو دلایا جائے۔ اپنے یہاں کے مدارس میں عموماً اور دارالعلوم دیوبند میں خصوصاً سوم عربی کے طلبہ کو سورۂ ق سے اخیر قرآنِ کریم تک ترجمہ پڑھایا جاتا ہے؛ مگر ترجمہ، پارۂ عم سے شروع کیا جاتا ہے، جب یہ پارہ مکمل ہوجاتا ہے تو سورۂ ق سے ترجمہ شروع ہوتا ہے، پہلی ششماہی میں سوا پارہ یا ڈیڑھ پارہ ہی ترجمہ ہو پاتا ہے؛ چوں کہ شروع میں ترجمہ سے مناسبت نہیں ہوتی؛ اس لیے شروع میں اساتذہ دو چار آیتیں ہی پڑھائیں تو بہتر ہے، اور پڑھانے کا انداز یہ ہو کہ پہلے مشکل لغات لکھائے جائیں، لفظ کا مادّہ، صیغہ، واحد، جمع، تعلیل، تخفیف اور صلات وغیرہ بس اتنا ہی بیان کرنا چاہیے جتنے کی اس جگہ

ضرورت ہو۔ پھر ترجمہ لفظی کرنا چاہیے؛ مگر نہایت ہی قدیم ترجمہ تحت اللفظ سے احتراز کرنا چاہیے۔ بعض اساتذہ حضرت تھانویؒ کا ترجمہ کرتے ہیں یہ بھی ٹھیک ہے؛ اس لیے کہ اس ترجمہ میں مضمون بھی واضح ہوجاتا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ترجمہ بھی عمدہ ہے، پھر خلاصۂ تفسیر نہایت ہی اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہیے، اگر آیت کا سمجھنا شانِ نزول پر موقوف ہو تو اس کو ضرور بیان کرنا چاہیے، واقعات میں صحیح ترین واقعہ کو دیکھ کر اطمینان کر کے بیان کرنا چاہیے، ورنہ اسرائیلیات میں پڑنے کا شدید خطرہ باقی رہ جائے گا، جس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے ایک سے زائد اقوال ہوں، ان میں سب سے راجح قول ہی طلبہ کو بتایا جائے؛ تاکہ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ یاد کرسکیں۔

کبھی چند اقوال بتادینے کا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ طلبہ ایک قول بھی یاد نہیں کرتے ناچیز کو پہلے سال دارالعلوم دیوبند میں شرح مائۃ عامل پڑھاتے ہوئے یہ تجربہ ہوا، ایک جملہ کی دو ترکیبیں کردیں، طلبہ نے ایک بھی یاد نہ کی۔

سوم عربی میں بعض اساتذہ ترکیب میں زنجیری انداز اختیار کرتے ہیں، اور بعض صرف اعراب اور وجہ اعراب کے بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، اگر طلبہ کی نحوی استعداد پختہ ہے، شرح مائۃ عامل انھوں نے اچھی طرح پڑھی ہے تو صرف وجہِ اعراب بتادینا بھی کافی ہے، زنجیری ترکیب ضروری نہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں عم پارہ میں ترکیب پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور سبق کی مقدار بہت کم رہتی ہے، پوری ششماہی میں صرف ایک سوا پارہ پر محنت مرکوز رہتی ہے، سورۂ ق سے مرسلات تک دوسری ششماہی میں پڑھاتے ہیں۔

چہارم عربی میں ترجمۂ قرآن مجید:

جب یہ طلبہ چہارم عربی میں آتے ہیں تو ان کو قرآن کی مشکل لغات، ترکیب اور خلاصہ یاد کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے؛ اس لیے چہارم میں نصاب کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اور سورۂ یوسف سے سورۂ حجرات تک یہ ترجمہ پڑھتے ہیں، ان میں اکثر سورتیں مکی ہیں، مضامین مشکل نہیں ہیں؛ اس لیے ترجمہ، اعراب اور لغات پر زیادہ توجہ دینی چاہیے،

یہاں بھی اندازِ بیان آسان اختیار کیا جائے، اور سوم عربی میں جن باتوں کا خیال کیا گیا ہے، ان کو ملحوظ رکھا جائے، لغات واعراب میں صرف اتنا ہی بتایا جائے جتنا ان کو ہضم ہو جائے، بعض اساتذہ اختصار کا خیال نہیں رکھتے ہیں؛ اس لیے ان کا درس بافیض نہیں ہو پاتا۔

مدنی سورتیں درج ذیل ہیں: حج، نور، احزاب، محمد، فتح اور حجرات ان میں احکام ہیں، آیات سے مستنبط ہونے والے احکام کو بھی نہایت ہی دقتِ نظر سے پڑھایا جائے۔

پنجم عربی میں ترجمۂ قرآن مجید:

پنجم عربی تک طلبہ کو ترجمۂ قرآن سے اچھی خاصی مناسبت ہو جاتی ہے، اس مرحلہ میں شروع سے سورۂ ہود تک ترجمہ پڑھایا جاتا ہے، ان میں اکثر حصہ احکام ومسائل کا ہے؛ اس لیے مسائل اچھی طرح بیان کیے جائیں، جہاں اعراب مشکل ہو وہیں ترکیب بتائی جائے؛ البتہ لغات پر توجہ دینا یہاں بھی ضروری ہے۔

مسائل بتاتے ہوئے اساتذہ زیادہ طویل کلام نہ کریں، بس اتنے ہی مسائل بتائیں جو آیت سے مستنبط ہو رہے ہوں، تفصیل ہدایہ کے لیے چھوڑ دیں، اگر کسی آیت کی چند تفسیریں ہوں تو راجح کو علت کے ساتھ بیان کر دیں، لمبی تقریریں طلبہ کے لیے مفید نہیں ہوتیں۔

چہارم تک آیات میں ادب اور بلاغت ہرگز بیان نہ کریں، پنجم عربی میں دروس البلاغہ یا تلخیص المفتاح پڑھے ہوتے ہیں؛ اس لیے علم بیان، معانی اور بدیع کی مثالیں بیان کرنے میں بھی حرج نہیں۔

ترجمۂ قرآن دارالعلوم دیو بند کے طرز پر پڑھانا چاہیے:

دارالعلوم دیو بند کے طرز پر پورے قرآنِ پاک کا ترجمہ پڑھانا چاہیے اور نصاب کی تکمیل کا خیال رکھنا چاہیے، نصاب کا پورا نہ ہونا بہت بڑا عیب ہے، طلبہ میں تشنگی باقی رہ جاتی ہے، وہ زندگی بھر ختم نہیں ہوتی۔

تذکیری آیات کی تدریس:

آج کا ماحول فسق پسند ہے؛ ہر طرف گناہ اور گناہ کی طرف متوجہ کرنے والے اسباب کی بہتات ہے؛ اس لیے جن آیات میں اللہ رب العزت نے راست طور پر انسانی قلوب کو متوجہ کیا ہے، مختلف قسم کی ظاہری اور باطنی خرابی کو بیان کرکے ان سے بچنے کی تلقین کی ہے، ان آیات کو پڑھاتے وقت طلبہ کو باطن کی طرف متوجہ کرنا چاہیے، اس طرح امت کے نونہالوں کا تزکیہ ہوگا اور وہ امت کے لیے پاکیزہ قیادت کے علم بردار بن سکیں گے۔

تطبیق آیات:

آیاتِ قرآنی کا تعلق انسانی زندگی سے نہایت ہی قریب کا ہے، زندگی کی نشیب وفراز سے متعلق آیات موجود ہیں، ضرورت ہے کہ ان کو روزمرہ کی زندگی پر منطبق کیا جائے، بہت سی آیات واضح ہیں، ہمارے مدارس کے طلبہ کو برمحل آیات پڑھنے کی عادت نہیں ہوتی؛ اس لیے کبھی کبھار اساتذہ طلبہ سے سوال کریں کہ فلاں بات سے متعلق آیت پڑھو؟ فلاں حکم کی آیت کون سی ہے؟ یہ بات پیش آئی ہے، اس سے متعلق کون سی آیت ہے؟ اس طرح طلبہ میں برجستہ آیات پڑھنے اور ان سے استدلال کی عادت ہوگی، حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری زید مجدہ نے منتخب آیات واحادیث کے چھوٹے چھوٹے تین اجزاء محفوظات کے نام سے تیار کیے ہیں، ان کا مقصد بھی یہی ہے، ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرکیف! تطبیق آیات کا ملکہ، مشق وتمرین سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

دوسرا مرحلہ:

دوسرے مرحلہ میں عام طور سے ہمارے مدارس میں جلالین شریف پڑھائی جاتی ہے، اس مرحلہ میں طلبہ ایک حد تک قرآنِ کریم کے مضامین سے واقف ہوتے ہیں؛ اس لیے اساتذہ محض آیات کی تفہیمی تقریر نہ کریں؛ بلکہ پوری توجہ کتاب کے حل پر مرکوز رکھیں، جب کتاب ان کے قابو میں ہوگی تو تفصیل وہ خود ہی کرلیں گے، اس کتاب میں درج ذیل باتوں پر توجہ دی جائے:

۱- فوائدِ قیود: علامہ سیوطیؒ اور محلیؒ کے بڑھائے ہوئے الفاظ کی وجہ بتائی جائے، کہیں اعراب کی تعیین ہے، کہیں ترجمہ ہے، کہیں محذوف کی وضاحت ہے، کہیں تعلیل ہے، کہیں قراءتِ مشہورہ اور کہیں قراءتِ شاذہ کی وضاحت ہے، کہیں مسئلہ شافعی کا بیان ہے، کہیں شانِ نزول ہے، کہیں قصہ ہے اور کہیں ناسخ ومنسوخ کی تعیین ہے۔

غرض یہ کہ جہاں جو بات بیان کی گئی ہے، استاذ صاحب کی ذمہ داری ہے کہ اسے حل کریں، اور طالب علم کو مطمئن کریں، جب تک اطمینان نہ ہو سبق نہ پڑھائیں، اور طلبہ کو ہر تفسیری اضافہ کی وجہ پوچھنے کی اجازت ہو، ان کے سوال پر ڈانٹا نہ جائے اور نہ الزامی جواب پر اکتفاء کیا جائے؛ بلکہ استاذ صاحب سوال کو سنجیدگی سے سنیں، اگر جواب مستحضر نہ ہو تو بعد میں جواب دینے کا وعدہ کریں اور مطالعہ کریں، اس موقع سے یہ خیال رہے کہ سوال کرنے والے طلبہ میرے علم میں اضافے کا سبب ہیں، ذہین طلبہ کی وجہ سے مطالعہ کی توفیق ہوتی ہے اور علم میں پختگی حاصل ہوتی ہے، جس طرح ہمارے اساتذہ نے ہمارے ساتھ ہمدردی کی ہے، ہمیں بھی طلبہ کے ساتھ ویسی ہی ہمدردی کرنی چاہیے، یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات کی نگرانی کرنے والے پروفیسران کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اندازہ ہوا کہ وہ طلبہ کی الجھنوں کو نہایت ہی ہمدردی سے دور کرتے ہیں اور تحقیق میں طلبہ کا پورا تعاون کرتے ہیں؛ بلکہ عملی اشتراک سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

۲- راجح کی تعیین: علامہ سیوطیؒ اور محلیؒ نے جس تفسیر کو اختیار کیا ہے، وہ ہر جگہ راجح نہیں ہے، کہیں کہیں مرجوح بھی ہے، اس کی تعیین کی ذمہ داری استاذ کی ہے، انھیں پہلے اکابر علماء کی تفسیریں دیکھنی چاہئیں، پھر بڑی تفسیروں کی طرف رجوع کرنا چاہیے، مثلاً ابن کثیر، روح المعانی، مظہری اور مدارک وغیرہ، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو یا چند اقوال میں سے ہر ایک درست ہوتے ہیں، ان میں فتویٰ کی طرح کسی ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت نہیں۔

۳- اگر کوئی عقلی اعتراض ہو تو اس کے لیے تفاسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تفسیر کبیر بہت مفید ہے، اکثر عقلی اعتراضات اس میں حل ہو جاتے ہیں۔

۴- کہیں کہیں جلالین میں اسرائیلیات در آئی ہیں، ان کی نشاندہی بہت ضروری ہے، اس جگہ صحیح تفسیر کرنا، استاذ کی ذمہ داری ہے، اکابر علماء کی تفسیر کے ساتھ ابن کثیر کا دیکھنا بہت مفید ہوتا ہے، تفسیر بالروایہ میں ابن کثیر سب سے اہم تفسیر ہے۔

۵- شروع میں ہی طلبہ کو بتا دیا جائے کہ علامہ سیوطیؒ اور محلیؒ دونوں شافعی ہیں، آیات سے اپنے مسلک کے مطابق تفسیر اخذ کرتے ہیں، ان تمام مقامات پر سب سے پہلے شافعی مسلک کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے، اور اگر شوافع کی فقہی کتابیں میسر ہوں تو براہِ راست ان میں مسائل دیکھنے چاہئیں، پھر اپنے مسلک کی کتاب سے مسائل دیکھ کر بیان کیے جائیں، شوافع کے استدلال کا جواب دینا بھی ضروری ہے، ورنہ حنفی طلبہ کے ذہن میں اشکال باقی رہ جائے گا اور یہ بہتر نہیں۔

۶- جلالین کا حاشیہ بہت عمدہ ہے، اس کی عمدگی کا اعتراف بہت سے علماء نے کیا ہے؛ مگر حاشیہ لکھنے والے کون بزرگ ہیں؟ اس کا علم نہیں، انھوں نے محض اخلاص کی بنیاد پر اپنا نام تک نہیں لکھا؛ لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ مسلکاً حنفی ہیں۔ تفسیر کے بہت سے اشکالات اچھی طرح حل کر دیتے ہیں؛ لیکن واقعات میں اسرائیلیات بھی خوب لیتے ہیں، اساتذہ کو ایسے مقامات پر بیدار مغزی سے کام لینا چاہیے، ان کی رو میں خود کو بہانا نہیں چاہیے۔

۷- جلالین میں قراءات بھی ہیں، قراءتِ مشہورہ کے ساتھ شاذّہ کو بھی ذکر کرتے ہیں، اساتذہ کو ذکر کردہ قراءت کو اچھی طرح تحقیق کر کے طلبہ کو بتانا چاہیے، اس کے لیے حاشیۃ الجمل کافی ہے، اس کے علاوہ السراج المنیر، روح المعانی، مظہری، وغیرہ کا دیکھنا بھی مفید ہے، ہر قراءت کے لحاظ سے آیت کی مختصر تفسیر ضرور کر دینی چاہیے؛ بلکہ لکھوا دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

جلالین میں ایک مشکل یہ ہے کہ وہ قراءت میں ترتیب کا لحاظ نہیں کرتے ہیں،

قرآنِ پاک کے رائج نسخہ میں جو آیت ہے، اس کی قراءت کبھی بعد میں اور دوسری قراءت پہلے لکھ دیتے ہیں، ایسی جگہوں پر طالبِ علم تشویش کا شکار ہوتا ہے؛ اس لیے اساتذہ کو وضاحت کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

جلالین میں ہر جگہ لہجات کو بیان نہیں کرتے ہیں؛ مگر جہاں دو ہمزہ جمع ہو جائیں ان کے لہجات ضرور لکھتے ہیں، ایسی جگہوں میں اساتذہ اگر قراءتِ سبعہ نہ پڑھے ہوں تو کوئی حرج نہیں، کسی جید قاری سے ادائیگی سیکھ لیں، پھر ادا کریں، محض عبارت دیکھ کر الٹا سیدھا ادا نہ کریں، یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

۸- ناسخ ومنسوخ کے بارے میں طلبہ کے ذہن میں شروع سے ہی یہ بات بٹھا دینا ضروری ہے کہ قرآنِ پاک کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے، پورا قرآن مجید محکم ہے، اپنے بزرگوں میں سے حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کا یہی موقف ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا رجحان بھی یہی ہے، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی عبارت سے سمجھ میں آتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اگر یک لخت کہہ دیتے کہ کوئی آیت منسوخ نہیں، تو لوگ نہ مانتے؛ اس لیے شاہ صاحبؒ قارئین کو تدریجاً اس نظریہ تک لے جانا چاہتے ہیں کہ موجودہ قرآن میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ [۳]

الفوز الکبیر کی شرح میں حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند نے آیاتِ قرآنی کے محکم اور غیر منسوخ ہونے والے موقف کو اختیار فرمایا ہے، حضرت مفتی محمد امین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے بھی الخیرالکثیر میں اسی موقف کی تائید کی ہے، اور جن آیتوں کو علماء نے منسوخ کہا ہے، ان سب کی ایسی واضح تفسیر کی ہے جس سے منسوخ نہ ہونے کا یقین ہوجاتا ہے۔

علامہ سیوطیؒ کے نزدیک اگرچہ اکیس آیتیں منسوخ ہیں؛ مگر جلالین میں ڈھیر ساری آیتوں کو منسوخ بتایا ہے، شاید متقدمین کے نظریہ کے مطابق ایسا کیا ہے؛ اس لیے پہلے اساتذہ نسخ کی بحث سمجھا دیں، متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح کا فرق بھی بتادیں اور ان جگہوں میں ایسی تفسیر کریں کہ طلبہ کا اشکال دور ہوجائے۔

۹- اسی مرحلہ میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ ہر آیت کا ''شانِ نزول'' ضروری نہیں، صرف انھیں آیتوں کا شانِ نزول جاننا ضروری ہے، جہاں بغیر شانِ نزول کے آیت کا سمجھنا مشکل ہو، مثلاً غزوۂ بدر وغیرہ کی آیات۔ (انفال ۴۲)

جلالین کے لیے معاون کتابیں:

قرآنِ پاک کے ترجمے اور اس کی تفسیریں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا، ساری تفسیروں کا مطالعہ ممکن نہیں؛ جب دار العلوم حیدر آباد میں راقم الحروف سے کتابیں متعلق ہوئیں تو جلالین شریف کے علاوہ کوئی کتاب ایسی نہیں تھی، جس میں جی لگتا، میں نے مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہ کو فون پر بتایا کہ ساری کتابیں اوّل، دوم اور سوم کی ہیں، صرف ایک جلالین مطالعہ کے لائق ہے، میں کیا کروں؟ جی نہیں لگ رہا ہے، حضرت نے برجستہ فرمایا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے کہ قرآن مجید سے مناسبت پیدا ہو جائے گی اور یہ بہت بڑی نعمت ہے، تم اس کی متعلقات کتب خانہ سے نکال کر ذوق وشوق سے مطالعہ شروع کردو، جی لگنے لگے گا، میں کتب خانہ گیا اور ترسٹھ کتابیں نکال لایا، وہاں کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا، کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا، مختلف ذوق رکھنے والے مفسرین کی کتابیں دیکھتا تھا؛ لیکن ہدایت کے مطابق طلبہ کے لیے باتیں ترتیب دے کر جاتا، عبارت سے متعلق بس ضروری باتیں ہی بیان کرتا تھا؛ اس طرح ذی الحجہ کا مہینہ آگیا، اور دیوبند آنا ہوا، یہاں حضرت مفتی صاحب سے پوچھا کہ تفسیر کی کتابیں تو بے شمار ہیں، مجھے جلالین کے لیے کون کون سی کتابیں دیکھنی چاہئیں، فرمایا ''حاشیۃ الجمل'' سے جلالین حل کیا کرو پھر اپنے کسی بزرگ کی تفسیر دیکھ لیا کرو، اتنا کافی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ جلالین کی مشکلات حاشیۃ الجمل میں حل ہو جاتی ہیں، صاوی بھی جمل کے شاگرد ہیں، اس میں جمل کا اختصار ہے، بار بار کے مقابلے سے میں نے یہ سمجھا ہے، کہا جاتا ہے کہ صاوی بدعتی ہیں، ان کے حوالے سے متعدد بدعات کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں۔ راقم الحروف ان کے ساتھ علامہ شوکانی کی فتح القدیر، زمخشری کی کشاف اور خطیب کی سراج منیر کے ساتھ خازن اور مدارک بھی دیکھتا تھا اور استفادہ کرتا تھا، قرآن مجید کے اردو

تراجم میں جتنے تراجم میسر ہوئے، سب کو اس لیے دیکھا کہ ایک تقابلی نظر ہو جائے، اس دوران بہت سوں سے عقیدت بڑھی اور بہت سوں سے بدگمان ہو گیا۔

جلالین کے لیے اردو شروحات دیکھنے کی نوبت نہیں آئی؛ البتہ دو تین مرتبہ مشکل مقام پر ''کمالین'' کو اٹھایا، اتفاق سے دو جگہ ترجمہ بھی نہیں کیا گیا تھا، اور ایک جگہ ترجمہ تو تھا؛ مگر اس سے عبارت حل ہوتی ہوئی نظر نہ آئی، اس کے بعد سے کبھی نہ دیکھا، ''جمالین'' اس وقت طبع ہوئی جب چار پانچ سال جلالین پڑھا چکا تھا؛ اس سے استفادہ کا موقع نہیں ملا؛ البتہ ایک بار تعارف لکھنے کے لیے دیکھا، بہ ظاہر اچھی شرح معلوم ہوتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ شارح نے کتاب کے حل کرنے میں بڑی عرق ریزی کی ہے۔

تفسیر کی منتخب کتابیں:

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے عربی تفاسیر کی پانچ کتابوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر کوئی ان کو دیکھ لے تو ان شاء اللہ کسی اور کے دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، وہ کتابیں درج ذیل ہیں:

۱- تفسیر ابن کثیر ۲- تفسیر کبیر ۳-تفسیر أبی سعود
۴- تفسیر قرطبی ۵- روح المعانی

''ابن کثیر'' تفسیر بالروایہ میں لاجواب ہے، یہ احادیث صحیحہ، ضعیفہ اور موضوعہ کی تعیین کر دیتے ہیں، اسرائیلیات میں بہت محتاط ہیں۔

''تفسیر کبیر'' میں امام رازیؒ نے نہایت ہی بسط و تفصیل سے کلام کیا ہے، اس میں احکام شرعیہ کا بیان ہے، فرقِ باطلہ کی تردید ہے، ربط آیات کو بھی نہایت ہی بے تکلف بیان فرماتے ہیں، اس تفسیر میں تفسیری اشکالات حل ہو جاتے ہیں، ہاں! یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس میں رطب ویابس روایات بھی خوب ہیں؛ چوں کہ واعظ تھے؛ اس لیے روایات میں غضِ بصر سے کام لیا ہے۔

''تفسیر أبی سعود'' کے مطالعہ کی رہنمائی مجھ کو حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ استاذ حدیث، مدیر ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند نے کی، یہ تفسیر بھی نہایت عمدہ ہے،

مختصر ہے، اس میں ربط آیات، فقہی احکام، ادب اور بلاغت بہت سی چیزیں قارئین کے لیے کشش کا باعث ہیں۔

''تفسیر قرطبی'' بھی کافی عمدہ ہے، اس میں روزمرہ کی ہدایات، تذکیری آیات پر کافی تفصیلی گفتگو ملتی ہے، مشکل الفاظ کو حل کیا ہے، اعراب کی تعیین بھی کی ہے۔

''روح المعانی'' کے لیے بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس میں متقدمین کی جملہ تفاسیر کا عطر اکٹھا کیا گیا ہے، اسلامی کتب خانوں میں اس سے عمدہ تفسیر موجود نہیں، لغت، نحو، صرف، قراءت، بلاغت، فقہ، عقائد، فلسفہ، ہیأت اور تصوف ہر چیز کو بیان کیا ہے، روایات میں بہت محتاط ہیں، بعد کے سارے مفسرین ان کے خوشہ چیں ہیں۔

تیسرا مرحلہ:

اس مرحلہ کو تکمیل تفسیر، تخصص فی التفسیر اور دورۂ تفسیر بھی کہتے ہیں، ہندوستان کے سارے مدارس کا حال تو مجھے معلوم نہیں، صرف دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم حیدرآباد کو قریب سے دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا ہے، دارالعلوم دیوبند میں دو تفسیر اور ایک اصولِ تفسیر کی کتاب داخلِ نصاب ہے، ابن کثیر میں سورۂ صافات اور ستائیسواں پارہ مکمل پڑھاتے ہیں، بیضاوی میں سورۂ آل عمران مکمل اور سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورۂ بقرہ آدھ پارہ داخل نصاب ہے، اساتذۂ کرام ان دونوں تفسیروں کو سبقاً سبقاً پڑھاتے ہیں، عملی کوئی کام نہیں لیا جاتا؛ اس لیے یہ درجہ بہت فعال نہیں ہے۔

دارالعلوم حیدرآباد میں تخصص فی التفسیر کا شعبہ کھلا، اس میں تفسیر کی درج ذیل کتابیں داخلِ نصاب کی گئیں: مختصر ابن کثیر، فتح القدیر للشوکانی، تفسیراتِ احمدیہ، تاویل مشکل القرآن لابن قتیبہ، مشکلات القرآن علامہ کشمیریؒ، مناہل العرفان۔

وہاں مختلف انداز سے لکھنے کا کام بھی لیا جاتا تھا، مثلاً آیاتِ احکام کی تخریج کرائی جاتی تھی اور راست طور پر قرآن مجید سے کتنا حکم مستنبط ہوتا ہے، اس کی تفصیل معاون کتابوں سے طلبہ لکھتے تھے، بیان القرآن کا مطالعہ لازم تھا، متعدد عناوین پر طلبہ سے مقالے لکھوائے جاتے تھے، راقم الحروف سے متعلق مناہل العرفان تھی، دارالعلوم دیوبند کے

نصاب کے مطابق تین مباحث پڑھائے اور ان سے متعلق نوٹس لکھوائے جاتے تھے؛ لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ تفسیر کے لیے اچھے طلبہ نہیں ملتے تھے، اکثر اچھی استعداد والے یا تو افتاء پڑھتے ہیں یا عربی زبان وادب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ لکھتے ہیں:

''دورۂ تفسیر فراغت کے بعد پڑھایا جاتا ہے؛ اس لیے جو طلبہ پڑھنا چاہتے بھی ہیں، ان کو ان کے سر پرست موقع نہیں دیتے، وہ کہتے ہیں کہ تم فارغ ہو گئے اب پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کام میں لگو! پھر ایسے کام میں لگتے ہیں کہ از خود مطالعہ بھی نہیں کرتے''۔[4]

دورۂ تفسیر کا طریقۂ کار:

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہ لکھتے ہیں:

''دورۂ تفسیر جس میں بیضاوی، ابن کثیر اور مظہری کی مدد سے قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پڑھائی جاتی ہے، یہ دورۂ تفسیر کچھ کامیاب نہیں، اور ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ تفاسیر اتنی طویل ہیں کہ ان کے پانچ پانچ پارے بھی ایک ایک گھنٹہ میں کما حقہ نہیں پڑھائے جاسکتے، علاوہ ازیں ذی استعداد طلبہ از خود ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں، انھیں ایک سال لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر دورۂ حدیث عمدۃ القاری، فتح الملہم، بذل المجہود اور معارف السنن کی مدد سے پڑھایا جائے، یعنی متونِ حدیث پڑھانے کے بجائے یہ شروح پڑھائی جائیں تو دورۂ حدیث کا رنگ بھی پھیکا پڑ جائے گا''۔

آگے لکھتے ہیں:

''دورۂ تفسیر میں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ متن قرآن کریم کو بنیاد بنا کر شیخ الحدیث اور اساتذۂ حدیث شریف کی طرح متخصصینِ تفسیر، قرآن کریم کا درس دیں، اور تمام تفاسیر سے استفادہ کریں اور خلاصہ بیان کریں تو دورۂ تفسیر کی شان پیدا ہو سکتی ہے''۔[5]

اس کے ساتھ اگر مشورے سے کچھ عملی کام کا اضافہ کر لیا جائے تو بہت بہتر رہے گا۔

قرآنِ کریم سے بے توجہی:

دیکھا جائے تو ہمارے مدارس میں ترجمۂ قرآن ہی پر توجہ ہے، سوم، چہارم اور پنجم عربی میں اردو ترجمہ اور جلالین کے ذریعہ عربی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے اور بس، چند ہی مدارس میں تخصص ہے، اور وہ بھی غیر فعال، قرآنِ پاک کی حیثیت ایک مظلوم صحیفہ کی سی ہوگئی ہے، یہ کتاب جتنی توجہ کی مستحق ہے ہم اتنی توجہ نہیں دے رہے ہیں، ضرورت ہے کہ مدارس کے سرکردہ حضرات سر جوڑ کر بیٹھیں اور تفسیر قرآن کا ایک مفید نصاب اور مؤثر طریقۂ کار اپنائیں!

الحمد للہ! آج حفاظ کی کمی نہیں ہے، اگر کمی ہے تو قرآنِ کریم کو صحیح سمجھ کر عمل کرنے اور عام کرنے کی، اگر قرآنِ کریم پر ہم عمل پیرا رہے تو ہمیں ضرور بالضرور عزت و رِفعت ملے گی، وباللہ التوفیق!

اصولِ تفسیر کی تدریس:

''اصولِ تفسیر'' میں تفسیر قرآن سے متعلق قواعد اور قوانین بیان کیے جاتے ہیں، اس موضوع کی دو کتابیں ہمارے یہاں داخل نصاب ہیں:

(۱) الفوز الکبیر (۲) مناہل العرفان

الحمد للہ! دونوں کتابوں کو کئی بار پڑھانے کا موقع ملا، الفوز الکبیر بڑی مفید کتاب ہے، اس میں فہم قرآن میں پیش آنے والے مشکلات کو نہایت ہی اچھے انداز سے حل کیا گیا ہے، مختصر سی کتاب میں اتنے اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی اور کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بہ قول حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ:

''یہ ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے، اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں، جن کو ان مشکلات سے واسطہ پڑا ہو، بعض بعض اصول جو شاہ صاحبؒ نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بناء پر لکھ دیے ہیں، دوسری کتابوں کے سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے بھی حاصل نہیں ہوسکتے''۔[۱]

اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے یہاں صرف یہی ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے، تو بھی بے جا نہ ہوگا؛ اس لیے کہ تخصص فی التفسیر چند ہی مدارس میں ہے اور اس میں داخل ہونے

والے طلبہ بھی بہت کم ہوتے ہیں۔

پھر اس کتاب کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اسے سال کے اخیر میں پڑھاتے ہیں، اور وہ بھی روا روی میں اس طرح کہ طلبہ اس کو کما حقہ سمجھ نہیں پاتے، وہ سالانہ امتحان کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں اور جلالین پڑھانے کے بعد پڑھائی جاتی ہے؛ اس لیے اس کا کوئی فائدہ طالب علم پر مرتب نہیں ہوتا۔

دار العلوم دیوبند کے اربابِ انتظام نے اس پر توجہ دی اور ۱۴۱۷ھ سے سال کے شروع میں پڑھائی جانے لگی، اور اس کا گھنٹہ مستقل کر دیا گیا؛ تاکہ طلبہ گہرائی کے ساتھ پڑھیں اور قرآنِ کریم کے اصول سے اچھی طرح واقف ہوں، دار العلوم کا یہ اقدام بہت مفید ثابت ہوا۔ے

دار العلوم حیدر آباد میں جب یہ مجھ سے متعلق ہوئی تو میں نے ذمہ داروں سے اجازت لے کر سال کے شروع میں پڑھانا شروع کیا۔

''الفوز الکبیر'' کو سرسری طور پر نہ پڑھایا جائے، کسی بھی اصول کی کتاب کو سرسری طور پر پڑھانا فائدہ مند نہیں ہوتا، اہم ترین کام ان اصولوں کا اجراء ہے، اس میں سب سے بنیادی چیز قرآنی آیات کی زُمرہ بندی ہے، شاہ صاحبؒ نے پانچ قسموں میں زمرہ بندی کی ہے: (۱) احکام (۲) جدل (۳) تذکیر نعمت (۴) تذکیر واقعات (۵) تذکیر موت وآخرت۔

الفوز الکبیر اور جلالین ایک استاذ سے متعلق ہونی چاہیے، اس کے بغیر فائدہ کم ہوگا، جب الفوز الکبیر ختم ہو جائے، اور جلالین شروع ہو تو استاذ صاحب نشاندہی کریں کہ یہ فلاں قسم کی آیت ہے اور یہ فلاں قسم کی، پھر اس کے مطابق تشریح کریں، مثلاً احکام کی آیت میں بتائیں کہ اس میں یہ حکم بیان ہوا ہے، اس کا اتنا جزء قرآن میں ہے، اتنا حدیث اور اجماع میں وغیرہ۔

جدل کی آیتوں میں بھی بتائے کہ مشرکین، منافقین، یہود ونصاریٰ کی فلاں خرابی اس جگہ ہے، اور فلاں خرابی یہاں، ان کے استدلال کا اسلوب قرآن نے کیا اختیار کیا ہے؟

الفوز الکبیر میں اسباب نزول کی بحث بھی بہت اہم ہے، اس کو تھوڑا تھوڑا نہایت

ہی امعان و گہرائی سے پڑھانا ضروری ہے۔

بہتر یہ ہے کہ ہر فصل کے بعد طلبہ کا آموختہ سنا جائے اور ان سے سوالات کیے جائیں؛ تا کہ اندازہ ہو جائے کہ انھوں نے اچھی طرح سمجھا ہے یا نہیں۔

الفوز الکبیر کے بعد تخصص فی التفسیر میں ''مناہل العرفان'' پڑھائی جاتی ہے، یہ علامہ محمد عبدالعظیم زرقانیؒ کے محاضرات کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے جامع ازہر میں طلبہ کے سامنے پیش کیے ہیں، یہ درسی کتاب کی طرح نہیں ہے، طول بیانی بہت زیادہ ہے، کبھی کبھی پڑھتے پڑھتے طبیعت اُکتا جاتی ہے؛ مگر بہت مفید ہے، اس کے تین مباحث دارالعلوم دیو بند میں پڑھائے جاتے ہیں۔

اس کتاب کو اگر اساتذہ سبقاً سبقاً نہ پڑھائیں؛ بلکہ طالب علم خود پڑھے اور ہر مبحث کا خلاصہ لکھے اور پھر ان کو اپنی زبان سے بیان کرے تو اس کا فائدہ دو چند ہو سکتا ہے۔ اصولِ تفسیر پڑھانے والے اساتذہ کو الاتقان، البرہان اور التبیان وغیرہ کو مطالعہ میں رکھنا چاہیے۔

قیمتی نصیحت:

میں نے اس موضوع پر تیاری کرنے سے پہلے حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہ سے دریافت کیا کہ ''تفسیر قرآن کی تدریس'' سے متعلق کچھ بتا دیجیے! انھوں نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر جواب دیا کہ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اساتذہ نے اپنے اساتذہ سے جس طرح پڑھا ہے، اسی طرح پڑھائیں، جس استاذ کو جس کا اسلوب پسند ہو اسی کو اختیار کرے، پھر فرمایا کہ سبق میں مرجوح اقوال بیان نہ کیے جائیں اور راجح کی تعیین کے لیے اکابر کی تفسیر کو معیار بنایا جائے۔ استعداد سازی کے لیے سب سے بہتر تو یہ ہے کہ طالب علم کتاب خود حل کرے، اور استاذ کے سامنے پڑھے، اگر صحیح ہو تو استاذ کہے: ''ہوں'' اور غلط ہو تو کہے ''اُوں ہوں'' اور درس گاہ میں طلبہ اتنے ہوں جہاں تک استاذ کی پہنچ ہو سکے۔

مساجد میں درسِ قرآن:

قرآن مجید کتاب قراءت بھی ہے اور کتابِ ہدایت بھی؛ لیکن آج ہم نے اس کو

صرف کتاب قراءت بنالیا ہے؛ حالاں کہ علمائے امت نے قرآن پاک کا ترجمہ خصوصاً عوام کے لیے کیا ہے، جب زبان فارسی تھی تو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فارسی میں ترجمہ کیا، پھر ان کے صاحب زادوں نے اردو زبان میں ترجمہ کیا، حضرت شیخ الہندؒ نے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمہ کو اپنے زمانہ کی اردو زبان میں مہذب کیا، اس پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تفسیری حاشیہ لکھا، یہ سب عوام کے لیے کیا گیا؛ اس لیے عوام کو قرآن پاک کے یہ ترجمے پڑھنے چاہئیں، مسلمانوں کے مصائب وآلام اور ذلت وپستی کے من جملہ اسباب میں سے ایک قرآنِ پاک سے دوری ہے، حضرت شیخ الہندؒ جب مالٹا سے دیوبند تشریف لائے تو علماء کے درمیان ارشاد فرمایا:

''میں مالٹا کی جیل سے یہ سبق لے کر آیا ہوں کہ اپنی پوری توانائی دو کاموں میں صرف کرنا ہے، ایک تو قرآن کو گاؤں گاؤں، محلے محلے اور گھر گھر عام کرنا ہے کہ کم از کم اس کی لفظی تعلیم سے کوئی مرد وعورت، بچہ بوڑھا خالی نہ رہے، اور بڑی مسجدوں میں ''درسِ قرآن'' جاری کیے جائیں، جن میں آسان تفسیر قرآن عوام کو پڑھائی جائے، دوسرے آپس کی لڑائی جھگڑوں کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''[8]

آج ضرورت ہے کہ ''درسِ قرآن'' کے ذریعہ عام مسلمانوں کو قرآنی مضامین سے واقف کرایا جائے، خاص طور سے جو آیتیں تذکیری پہلو رکھتی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاددہانی اور آفاق وانفس میں غور وتدبر والی آیتیں، انبیائے کرامؑ کے واقعات، نافرمانوں کو سزا دیے جانے کے واقعات، عام نصیحت کی آیتیں، سبق آموز عبرت وموعظت سے عام مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے، دنیا کے فنا ہوجانے اور آخرت کے ہمیشہ باقی رہنے، قبر، حشر، جنت اور جہنم کی آیات کے معانی سے ان کو آگاہ کیا جائے، موت اور اس کے بعد جزا وسزا کا استحضار کرایا جائے۔

اگر مساجد میں ''درسِ قرآن'' کی مجلسیں ہونے لگیں تو عوام علماء سے قریب ہوں گے، زندگی شریعت کے مطابق گزارنے کا حوصلہ پیدا ہوگا، قرآن پر امت متفق ہوگی، اس کی نورانیت سے معاشرہ روشن ومنور ہوگا۔

قرآن کے الفاظ:

قرآنِ پاک میں الفاظ اکثر وہی ہیں جو ہم اردو میں بولتے ہیں، مثلاً سورۂ فاتحہ میں: حمد، رب، عالم، رحمٰن، رحیم، مالک، عبادت، ہدایت اور صراطِ مستقیم جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، صیغے اور انداز کا فرق ہے، اگر ہم عوام کو ہر ہر لفظ کا ترجمہ بتا کر روزانہ یا ہفتہ میں ایک دو آیت پڑھا دیا کریں تو دھیرے دھیرے لوگ الفاظِ قرآنی سے قریب ہو جائیں گے، کہا جاتا ہے کہ قرآنِ پاک میں الفاظ دو ہزار کے قریب استعمال ہوئے ہیں، ان میں تقریباً پندرہ سو الفاظ ہم روزمرہ بول چال میں استعمال کرتے ہیں؛ اس لیے بقیہ الفاظ کو سیکھنا بھی کچھ بعید نہیں، کرنے سے کام آسان ہوتا ہے۔

درسِ قرآن کا انداز:

''درسِ قرآن'' کا اسلوب نہایت آسان اور سہل رکھا جائے، جس سے عام لوگ مانوس ہوں، الفاظ بھی بالکل عوامی استعمال کریں، موٹے موٹے عقائد، بدعات و رسوم سے اجتناب، معاشرہ کی اصلاح، اعمالِ صالحہ کی ترغیب، اچھے اخلاق کی تلقین اس انداز سے کی جائے جو قبولِ عام حاصل کر سکے۔

آج کل لوگوں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے؛ اس لیے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت نہ لیا جائے، مشورہ سے ایسا وقت متعین کیا جائے جس میں سب کو سہولت ہو۔

جو اردو جانتے ہوں ان کو اردو ترجمہ وتفسیر مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا جائے، مثلاً حضرت تھانویؒ کا ترجمہ، معارف القرآن، ترجمہ شیخ الہندؒ، مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ کی ہدایت القرآن، مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کی توضیح القرآن وغیرہ اور جو ہندی اور انگریزی جانتے ہوں، ان کو ایسے ترجمے مہیا کیے جائیں، اور تاکید کی جائے کہ قرآن میں اپنی رائے نہ چلائیں، ہاں جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں، انھیں صحیح فکر کے حامل علماء سے پوچھیں، اس طرح عام مسلمان قرآن سے قریب ہوں گے، اور ان کی زندگی کے لیے قرآنِ پاک کتابِ ہدایت ثابت ہوگی۔

حواشی

۱- (ترمذی، باب فضائل قرآن، حدیث: ۲۹۱۸)
۲- الاتقان فی علوم القرآن (ص: ۴۴۴)
۳- الخیر الکثیر ، ص: ۲۷۵
۴- الخیر الکثیر ، ص: ۲۰
۵- الخیر الکثیر ، ص: ۱۹
۶- الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ صاحبؒ نمبر، ص: ۳۴۱
۷- الخیر الکثیر ، ص: ۲۴
۸- الخیر الکثیر ، ص: ۱۸

اتمام حجت کا قرآنی اسلوب

محمد جرجیس کریمی

نزول قرآن کا ایک مقصد اتمام حجت ہے یعنی لوگوں کے سامنے اس بات کو مختلف دلائل سے واضح کردینا کہ اس کائنات کا خالق و مالک اور رب و معبود تنہا اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کائنات میں تنہا اسی کا حکم جاری وساری ہے۔ لہٰذا انسان کو بھی اسی کا حکم ماننا چاہیے جو شخص اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں ڈال دے گا۔ جہنم چوں کہ ایک سخت عذاب کی جگہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کو یہ گوارا نہیں ہوا کہ انسان کو لاعلمی یا غفلت میں رکھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وتمیز دینے کے ساتھ انبیاء ورسل کا سلسلہ جاری کیا۔ انہوں نے لوگوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا تاکہ قیامت کے دن انسان اللہ تعالیٰ کے خلاف حجت قائم نہ کرسکے کہ اے اللہ! مجھے تو اس چیز کی خبر ہی نہ تھی۔ ارشاد ہے۔

رُسُلاً مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلاَّ يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّهُ عَزِيزاً حَكِيماً O (النساء: ۱۶۵)

یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے۔ تاکہ ان کو مبعوث کردینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔ اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا اور حکیم ودانا ہے۔

قیامت کے دن جب کچھ لوگ جہنم میں ڈالے جائیں گے تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ کیا دنیا میں تمہارے پاس رسول یا رسول کی تعلیمات نہیں آئی تھیں جن سے تم لوگ اس برے انجام سے بچ جاتے اور جہنم کی آگ میں نہ ڈالے جاتے۔ قرآن مجید میں اس مضمون کی متعدد آیات وارد ہیں جیسے درج ذیل آیت ملاحظہ ہو۔

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَراً حَتَّى إِذَا جَاؤُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا بَلَى وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ o قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ o (الزمر: ۷۱-۷۲)

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے۔ کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا وہ جواب دیں گے ہاں آئے تھے مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔ کہا جائے گا داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں۔ یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے یہ متکبروں کے لیے۔

اللہ تعالیٰ چاہتا تو قوت قہریہ کے ذریعہ انسانوں کو ہر حکم کی تابع داری پر مجبور کر دیتا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا اور ان کو عمل کی آزادی عطا کی۔ لیکن ان کو شتر بے مہار بھی بنا کر نہیں چھوڑ دیا بلکہ افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا تا کہ انسان اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کے سامنے سر اطاعت خم کر دے۔ ارشاد ہے۔

إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ o (الشعرا: ۴)

ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں۔

اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنی قوت قہریہ و جبریہ کے ذریعے لوگوں کو اپنے احکام ماننے پر مجبور کر دیتا لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت نہیں ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ دین کے ماننے میں جبر و اکراہ جائز نہیں ہے کیوں کہ اللہ نے رشد و ہدایت کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہے۔

لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ: ۲۵۶)

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال سے پوری طرح واقف ہے، ان کے دلوں کی باتوں

کو جانتا ہے حتی کے چور نگاہوں سے بھی واقف ہے، اللہ کامل قوت وطاقت والا بھی ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ چاہے تو لمحوں میں کائنات بدل کر رکھ دے۔ دوسری طرف انسان ایک خطا کار مخلوق ہے۔ اس سے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ انہیں پکڑ پکڑ کر سزائیں دیتا رہتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک مہلت عمر عطا کی ہے اور اس میں عمل کی آزادیاں دی ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ وَلَكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى (فاطر: ۴۵)

اگر وہ لوگوں کو ان کے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑتا مگر وہ انہیں ایک مقرر وقت تک کے لیے مہلت دے رہا ہے۔

برائیوں میں سب سے بڑی برائی کفر وشرک ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں معافی نہیں ہے جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَى إِثْماً عَظِيماًo (النساء: ۴۸)

یعنی اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرے گا اس کے علاوہ جو بھی گناہ ہو اگر اللہ چاہے تو وہ معاف کرسکتا ہے۔

اس سخت وعید کے باوجود معبودان باطل کو برا بھلا کہنے اور ان کے سب وشتم سے قرآن مجید نے روکا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلاَ تَسُبُّواْ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّواْ اللَّهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُواْ يَعْمَلُونَo (الانعام: ۱۰۸)

(اے مسلمانو!) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بناء پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوشنما بنادیا ہے پھر انہیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے اس وقت وہ انہیں بتادے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ وسیع رحمت ومغفرت والا ہے قرآن مجید میں جابجا اللہ تعالیٰ کی اس صفت

کا حوالہ آیا ہے۔ اگر بندے اللہ کی طرف رجوع کریں تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کر دیتا ہے وہ حد سے زیادہ معاف کرنے والا ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعاً إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ○ (الزمر: ۵۳)

اے نبیؐ کہہ دو کہ میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفور رحیم ہے۔

ان تمہیدی باتوں کے بعد آیئے دیکھیں کہ قرآن میں اتمام حجت کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔

سلسلۂ نبوت ورسالت قائم کیا:

اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کو مبعوث کیا اور ان کو ایک مہلت عمر دی اس مہلت عمر میں انہوں نے افہام وتفہیم کے تمام طریقے اختیار کیے۔ بعض انبیاء کو طویل عمر ملی مثلاً حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ کرتے رہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ دو چار دن کی تبلیغ کے بعد ہی اس قوم کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں ان کی طویل تبلیغ رسالت کا تذکرہ خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحاً إِلَى قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَاماً فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ○ (العنکبوت: ۱۴)

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا۔ آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آ گھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کو سمجھانے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے۔ ارشاد ہے۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلاً وَنَهَاراً ○ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَاراً ○ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارا ○ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَاراً ○ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَاراً ○ (سورہ نوح: ۵-۹)

اس نے عرض کیا ''اے میرے رب میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تا کہ تو انہیں معاف کردے، انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑے رہے اور بڑا تکبر کیا۔ میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔

دعوت و تبلیغ کے یہ طریقے کم وبیش تمام انبیاء و رسل نے اختیار کیے، ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ نے بھی مختلف طریقوں سے فریضہ رسالت ادا کیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اور ثابت ہوتی ہے کہ اتمام حجت محض ایک دو بار مدعو سے بات کر لینے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے بار بار دل سوزی کے ساتھ بات سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کو تبلیغ رسالت کا واضح حکم دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (المائدہ: ٦٧)

اے پیغمبرؐ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔

نعمتوں کی یاددہانی:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان میں کچھ ظاہری نعمتیں ہیں اور کچھ باطنی نعمتیں ہیں۔ ان نعمتوں سے انسان مستفید ہو رہا ہے۔ انسانی فطرت میں یہ بات ہے کہ وہ اپنے منعم اور محسن کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے زیر احسان رہتا ہے، اس کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کی تابع داری کرنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید میں اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بھی حوالہ دیا گیا ہے اور انسان کو شر اور بغاوت سے روکا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ٥ (النحل: ١٨)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہیں گن سکتے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

أَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (لقمان: ٢٠)

اللہ نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو تمہارے اوپر انڈیل دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی ناشکری کے رویے کا شکوہ بھی کیا ہے کہ وہ میری نعمتوں کو پانے کے باوجود ان کا انکار کر دیتے ہیں۔

يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنكِرُونَهَا وَأَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُونَO(النحل: ۸۳)

میری نعمتوں کو وہ پہچانتے ہیں پھر ان کا انکار کر دیتے ہیں اور اکثر لوگ ناشکرے (کافر) ہیں۔

قرآن مجید کے بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد کہا گیا ہے کہ اے انسانوں اور جنوں کی جماعت تم اللہ کی کن کن نعمتوں کا انکار کرو گے۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِo (الرحمان: ۱۳)

تم دونوں اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

اس سورہ میں یہ آیت اکتیس (۳۱) بار وارد ہوئی ہے۔اس تکرار کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف اور اس کی نافرمانی یا اس کے انکار سے رک جائے۔ تا کہ قیامت کے دن وہ جہنم میں نہ ڈالا جائے۔

عقل سے کام لینے کی دعوت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وتمیز سے نوازا ہے۔سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔اس لیے وہ انسان کو انفس وآفاق میں بکھری ہوئی نشانیوں پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور اسے سمجھاتا ہے کہ اپنی عقل سے کام لو گے تو خدا کا انکار کرنا یا اس کی نافرمانی کرنا آسان نہیں ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنی نشانیاں بیان کی ہیں اور ان پر غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ارشاد ربانی ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم السجدہ: ۵۳)

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ قرآن واقعی برحق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس خمسہ ظاہری وباطنی عطا کیے ہیں اور ان سے کام لینے

کی تلقین کی ہے جو ان سے کام نہیں لے گا اللہ اس کی گرفت کرے گا۔ ارشاد ہے۔

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولاً (الاسراء: ۳۶)

یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہوگی۔

جہنم میں جب جہنمی ڈالے جائیں گے تو وہ اس کا اعتراف کریں گے کہ اگر ہم دنیا میں عقل وخرد سے کام لیتے تو آج جہنم کی آگ میں نہ جل رہے ہوتے۔ ارشاد ہے۔

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِo (الملک: ۱۰)

وہ کہیں گے ''کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے سوجھ بوجھ سے کام نہ لینے والے کی تہدید ان الفاظ میں کی ہے۔

وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلاًo (الاسراء: ۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔

مختلف تمثیلات بیان کی گئیں:

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے مختلف طرح کی مثالیں بھی بیان کی ہیں تاکہ انسان ان مثالوں کی روشنی میں حقیقت پر غور کرے اور بات اس کی سمجھ میں آجائے۔ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلاًo (الکھف: ۵۴)

اور (دیکھو) ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے لیے ہر طرح کی مثالیں لوٹا لوٹا کر بیان کردیں مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی زندگی کی ناپائیداری کی مثال پودوں کے اگنے اور پھر ان کے مرجھا جانے سے بیان کی ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ

بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيماً تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِراً o (الکہف: ۴۵)

اے نبیؐ انہیں حیات دنیا کی حقیقت اسی مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسایا تو زمین کی پود خوب گھنی ہوگئی اور کل وہی نباتات بھس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو خدا بنانے یا اس کو حامی و مددگار سمجھنے کی مثال مکڑی کے جالے کی ہے جو انتہائی بے وقعت اور کمزور ہے۔ارشاد خداوندی ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاء كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتاً وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ o (العنکبوت: ۴۱)

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنالیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے کاش یہ لوگ علم رکھتے۔

معبودان باطل کی عاجزی کی مثال مکھی کو دفاع نہ کر سکنے سے بیان کی گئی ہے اور مشرکین کو سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَاباً وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئاً لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ o (الحج: ۷۳)

لوگو ایک مثال دی جاتی ہے غور سے سنو جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔مدد چاہنے والے بھی کمزور ہیں اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔

خواہشات نفس کی مکمل پیروی اختیار کر لینے والے کو کتے سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہر وقت اپنی زبان لٹکائے رہے۔ارشاد ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَث ذَّلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ

كَذَّبُوا بِآيَتِنَا (الاعراف: ۱۷۶)

اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشات نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اس کی مثال اس کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہ مثال ایسی قوم کی ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔

قرآن مجید میں ایسی چالیس سے زائد مثالیں موجود ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مختلف باتوں کو سمجھایا ہے اور کہا ہے کہ ان کے ذریعے نصیحت وہی حاصل کرے گا جو سوجھ بوجھ والا ہوگا ارشاد ہے۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ٥ (العنکبوت: ۴۳)

یہ مثالیں ہیں جن کو ہم نے لوگوں کے سمجھنے کے لیے بیان کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو علم والے ہی سمجھ سکتے ہیں (یعنی ان سے علم والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں)۔

تاریخی واقعات کے ذریعہ اتمام حجت:

اللہ تعالیٰ نے مختلف مثالیں بیان کرنے کے ساتھ تاریخی واقعات کا بھی حوالہ دیا ہے اور ان کو، لوگوں کے لیے اتمام حجت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ تاریخی واقعات میں دو طرح کے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ایک نیک، ایمان والے اور صالحین کا تذکرہ کیا گیا ہے دوسرا برے، اللہ کے نافرمان اور مفسدین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں کے اعمال کی وضاحت کی گئی اور پھر ان کے نتائج اور ان کے انجام کو بتایا گیا ہے تاکہ اچھے اعمال کی ہم پیروی کریں اور برے اعمال سے پرہیز کریں۔ ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (یوسف: ۱۱۱)

اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل وخرد رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔

انبیاء ورسل اور صالحین کے قصے اس لیے بیان کیے گئے ہیں تاکہ اہل ایمان کا دل مطمئن ہو اور وہ ثابت قدم رہیں۔ اور اللہ کی نصرت وتائید پر ان کا بھروسہ قائم رہے ارشاد ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ0(هود: ۱۲۰)

اور اے نبیؐ یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم نے تم سے بیان کیے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔

پچھلی قوموں کے واقعات بیان کرنے کا ایک مقصد منکرین حق اور مفسدین ارض کے سامنے اتمام حجت بھی ہے تاکہ وہ ان اقوام کے رویوں اور ان کے انجام سے سبق حاصل کریں اور کفر و شرک اور تکذیب کی روش ترک کر دیں اور راست روی کا طریقہ اختیار کریں۔ارشاد ہے۔

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَo(العنكبوت: ۴۰)

آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

فطرت کی طرف توجہ مبذول کرائی:

اللہ تعالیٰ نے انسان پر اتمام حجت کے لیے ایک حوالہ فطرت کا بھی دیا ہے۔ فطرت سے مراد خلقت، طبعی حالت، پیدائشی خصوصیات اور وہ عادات ہیں جن پر انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔جیسے انسان کی فطرت میں ایک خدا کی پرستش شامل ہے اس کا اظہار مصیبت کے وقت واضح طور پر ہوتا ہے۔ارشاد ہے۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَo(العنكبوت: ۶۵)

جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں۔پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکا یک یہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

فطرت کا یہ مظاہرہ صرف توحید کے اقرار میں نہیں ہوتا بلکہ پورے دین کو فطرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ارشاد ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ٥(الروم: ۳۰)

اے نبیؐ یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا۔اللہ کی بنائی ہوئی خلقت بدلی نہیں جا سکتی۔یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

فطرت کے حوالے سے ازل میں لیے گئے اس عہد کا ذکر بھی مناسب ہے جب انسانوں نے اللہ کو اپنا رب مانا تھا۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کا حوالہ اس پہلو سے دیا ہے تا کہ انسان قیامت کے دن اللہ کے خلاف حجت نہ قائم کر سکے۔ارشاد ہے۔

وَإِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلَى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلَى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِيْنَ (الاعراف: ۱۷۲)

اے نبی لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کو نسل تو نکالا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا ''ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ہم اس پر گواہی دیتے ہیں یہ ہم نے اس لیے کہا کہ کہیں قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے''۔

اس آیت کے ذیل میں مفسرین کی ایک جماعت نے فطرت مراد لیا ہے یعنی انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کو خدا ماننا شامل ہے۔

لذت و تکلیف کے ذریعہ اتمام حجت:

انسان فطری طور پر بعض چیزوں سے لذت محسوس کرتا ہے اور بعض چیزوں سے تکلیف محسوس کرتا ہے۔لذت کے حصول کی اس کے اندر تمنا پائی جاتی ہے اور تکلیف سے بچنے کی وہ کوشش کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعمال کے مطابق لذت یا تکلیف دینے کا وعدہ کیا ہے۔ارشاد ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ٥ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ٥ يُطَافُ عَلَيْهِم بِصِحَافٍ مِّن ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ٥ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ٥ لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِنْهَا تَأْكُلُونَ ٥ (الزخرف: ۶۹-۷۳)

اس روز ان لوگوں سے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع وفرمان بن کر رہے تھے کہا جائے گا کہ ''اے میرے بندو آج تمہارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہوگا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں۔ تمہیں خوش کر دیا جائے گا۔ ان کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے اور من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہوگی ان سے کہا جائے گا تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے تم اس چیز کے وارث اپنے اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو جو تم دنیا میں کرتے رہے ہو تمہارے لیے یہاں بکثرت فواکہ موجود ہیں جنہیں تم کھاؤ گے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيماً فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ٥ (محمد: ۱۵)

پرہیزگار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی نتھرے ہوئے پانی کی۔ نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہوگا۔ نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہوں گی۔ نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف وشفاف شہد کی اس میں ان کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف بخشش (کیا وہ شخص جس کے حصے میں یہ جنت آنے والی ہے) ان لوگوں کی طرح ہوسکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں کاٹ دے گا۔

قرآن مجید کی دوسری آیات میں جہنمیوں کو ملنے والی دردناک سزاؤں کی تفصیل

بیان کی گئی ہے ارشاد ہے۔

أَذٰلِکَ خَیْرٌ نُّزُلاً أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ o إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِیْنَ o إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْ أَصْلِ الْجَحِیْمِ o طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُؤُوسُ الشَّيَاطِيْنِ o فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِؤُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ o ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْباً مِّنْ حَمِیْمٍ o ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيْمِ o (الصٰفّٰت: ۶۲-۶۸)

بولو یہ ضیافت (جنت کی نعمتوں کا تذکرہ ہے) اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہہ سے نکلتا ہے اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر، جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا پانی ملے گا اور اس کے بعد ان کی واپسی اسی دوزخ کی طرف ہوگی۔

اس طرح کی آیات جن میں جنت کی نعمتوں اور جہنم کی تکالیف کا تذکرہ کیا گیا ہے قرآن مجید میں کثرت سے وارد ہیں۔ ان کا مقصد ذہن انسانی کو لذت اور تکلیف کے حوالے سے بیدار کرنا ہے تاکہ وہ اس سے متعلق اپنے رویے کو درست رکھے۔

تنبیہی عذاب کے ذریعہ اتمام حجت:

اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اس دنیا میں بھی عذاب نازل کر دیتا ہے تاکہ لوگ متنبہ ہوں اور غفلت کا پردہ ہٹ جائے۔ اور لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ دنیا کے مختلف حادثات، مصیبتیں، قحط، زلزلہ اور سونامی کو اس کے ذیل میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے عذاب میں دو طرح کی تنبیہ کی جاتی ہے۔ جو عذاب یا مصیبت کا شکار ہوا اور پھر بچ جائے آئندہ کے لیے اس کو اصلاح کا موقع ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو ابھی عذاب کے شکار نہیں ہوئے ایسے اعمال سے بچیں جن کی وجہ سے عذاب آیا۔ ارشاد ہے۔

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَى دُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ o (السجدہ: ۲۱)

اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزا

انہیں چکھاتے رہیں گے شاید کہ یہ باز آ جائیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَى أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَخَذْنَاهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ o (الانعام: ۴۲)

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب وآلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔

دنیا کی بے ثباتی سے اتمام حجت:

اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی کی حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے تاکہ اس کی ناپائیداری اور بے ثباتی پر انسان غور کرے اور چندروزہ زندگی کے لیے آخرت کی زندگی کو تباہ نہ کرے۔ارشاد ہے۔

وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ o (العنکبوت: ۶۴)

اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا اصلی زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے۔کاش یہ لوگ جانتے ہوتے۔

ایک دوسری جگہ دنیاوی زندگی کی حقیقت کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ارشاد ہے۔

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ o (الحدید: ۲۰)

خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے پھر وہ کھیتی پک جاتی ہے اور تم

دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی پھر وہ بھس بن کر رہ جاتی ہے اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت ہے اور اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکہ کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں۔

شکوک وشبہات کا ازالہ:

انسانی ذہن کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ حقائق کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ذہن کی اس خامی کا بھی علاج کیا ہے اور مختلف چیزوں کے بارے میں ممکنہ شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے مثال کے طور پر قرآن مجید کی حقانیت کے بارے میں شکوک وشبہات کے ازالہ کے تعلق سے ارشاد ہے۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ. فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ٥

(البقرہ: ۲۳-۲۴)

اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے یہ ہماری ہے یا نہیں؟ تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنالاؤ اپنے سارے ہم نواؤں کو بلالو۔ ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو۔ اگر تم سچے ہو تو یہ کام کرکے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہیں کیا اور یقیناً کر بھی نہیں سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

قیامت کے دن انسان کے دوبارہ زندہ اٹھائے جانے کے سلسلے میں بھی انسانی ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں ان کا ازالہ اس طرح کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّى وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ

شَيْئًا وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ o (الحج: ۵)

لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔

اتمام حجت کے ان طریقوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وضاحت کی ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو جہنم ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے وہ عقل و دماغ سے کام نہیں لیتے اور تمام نشانیاں اور آیات ان کے سامنے کھلی ہوتی ہیں تب بھی وہ اندھے بہرے بن کر زندگی گذارتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (الاعراف: ۱۷۹)

اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھو گئے ہیں۔

قرآن مجید کا اسلوب استدلال

سعید احمد ابن عبداللہ عمری

قرآن مجید، انسانیت کے نام وہ آخری ہدایت نامہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ورسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے نازل فرمایا یہ وہ کتاب ہے جس پر ایمان لانے اور جس کی رہنمائی اختیار کرنے پر ہی انسان کی نجات وفلاح ممکن ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کتاب نے انسانی زندگی پر جتنا ہمہ گیر، ہمہ جہتی اثر ڈالا اس کی کوئی مثال ونظیر نہیں بلکہ اس کتاب کی آمد سے قبل اگر انسانیت کھلی گمراہی میں مبتلا تھی ''وان کانوا من قبل فی ضلال مبین'' (الجمعہ) تو اس کتاب کی آمد سے وہ ہدایت پر اس طرح گامزن ہوگئی ''اولئک علی ھدی من ربھم'' (البقرۃ) کہ انہوں نے ایک صدی کی مدت میں آباد دنیا تک، اس کتاب کے پیام کو پہنچا دیا اور اسے حلقہ بگوش اسلام بنا دیا۔

عباسی دور میں عجمی علوم خصوصا یونانی علوم کا ترجمہ ہونے لگا جس میں ایک حصہ اگر طبیعیات پر مشتمل تھا تو دوسرا حصہ الہیات (مابعد الطبیعیات) پر مشتمل تھا۔ اس دوسرے حصہ میں خصوصا انسانی عقل کی نارسائی ظاہر تھی وحی الہی کی رہنمائی ودستگیری کے بغیر اس میدان میں انسانی عقل کا نقص وخطا سے مبرأ ہونا ناممکن تھا۔ وہ تنہا اس باب میں کچھ قیاسات، مفروضات اور اوہام وظنون کے سوا کچھ نہیں پاسکتی۔ مگر اسی نام نہاد، عقل وعلم وفلسفہ کی جب وحی الہی سے مقابلہ آرائی شروع ہوئی تو قرآنی ہدایات وتعلیمات کو موضوع بحث بنا کر شکوک وشبہات نیز لاطائل اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ ابتدائی مرحلہ میں علمائے اسلام نے اس فلسفہ کی خامیوں اور خطاؤں کی نشاندہی کی مگر بعد کے ادوار میں جب حامیان اسلام نے فلسفہ کے دلائل اور اسی کے اسلوب میں قرآنی تعلیمات وارشادات کو پیش کرنے کی کوشش کی تو یہیں سے قرآن کے حقیقی مزاج، طرز اور اسلوب

سے لوگوں کی نا آشنائی بڑھنے لگی رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آ گیا کہ عمومی لحاظ سے قرآن مجید کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ اس کی تعلیمات کا اسلوب خطابی ہے نہ کہ برہانی۔ گویا قرآنی عقائد ونظریات، احکام وآداب، انسانی عقل سے زیادہ اس کے جذبات کو اپیل کرتی ہیں۔

زیر نظر مضمون میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ قرآن مجید نے انسانی عقل کو ناکارہ نہیں کیا بلکہ عقل کو اس نے انسان کے مکلّف ہونے کی اساس قرار دیا اس کے مضامین کو اس نے عقلی استدلال پر استوار کیا۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے اس لیے اس مضمون میں صرف چند بنیادی معروضات پر اکتفا کیا گیا۔

قرآن مجید کا موضوع:

قرآن مجید کے مکی اور مدنی ادوار میں منقسم ہونے کے لحاظ سے مقدم الذکر حصے کا موضوع عقیدہ یعنی فکر ونظر کی درستگی ہے اور مؤخر الذکر حصے کا موضوع شریعت یعنی عمل وتعلق کی راستی ہے۔ پہلے موضوع کو اگر ایمانیات سے تعبیر کیا جاتا ہے تو دوسرے کو عمل صالح سے بیان کیا جاتا ہے۔

ایمانیات کے دائرے میں وہ غیبی حقائق ہیں جو کائنات سے متعلق جملہ امور سے بحث کرتے ہیں کہ اس کائنات کو کس نے وجود بخشا۔ کون اس کے نظم وانصرام کا ذمہ دار ہے۔ اس کائنات کی تخلیق کی غرض وغایت کیا ہے۔ کیا یہ کائنات ہمیشہ یوں ہی باقی رہے گی۔ اس کائنات میں انسان کی کیا حیثیت ہے۔ اگر انسان کو یہاں فکر وعمل کی آزادی حاصل ہے تو کس قدر، نیز اس کے لیے کون سا رویہ درست اور کامیابی کا ضامن ہے۔ کیا وہ موت سے دوچار ہونے کے بعد دوبارہ زندگی پائے گا۔ یہاں خیر وشر کی معرفت کے کیا پیمانے ہیں؟ کیا وہ اس کائنات کے فاطر اور رب کے روبرو جوابدہ ہے۔ اس کی پسند اور ناپسند کیا ہے۔ اس کی کیا صفات ہیں وہ انسان سے کن ضوابط وقوانین پر معاملہ کرتا ہے اور کرے گا۔

عمل صالح کے دائرہ میں وہ احکام وآداب آتے ہیں جو انسان کی زندگی سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں خواہ وہ نجی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا معاشرتی، معاشی

ہو یا اخلاقی، روحانی ہو یا مادی، کیوں کہ انسان ایک ہمہ جہتی وجود ہے۔ اس کا اپنا نفس ہے، اس کا کنبہ وخاندان ہے اس کی قوم وبرادری ہے، اس کا وطن وملک ہے اور اس کے لیے یہ دنیا اور اس کی نعمتیں ہیں۔ ان سارے تعلقات کی بابت اس کے حقوق وفرائض کیا ہیں؟ سب سے بڑھ کر اس کا اپنے خالق، مالک ورازق رب اور معبود سے کیا تعلق ہے؟ اس کے حقوق وفرائض کیا ہیں؟

مرکزی اور اساسی طور پر یہی دو موضوع ہیں جو قرآن مجید میں وحی الٰہی کے واسطے سے انسان کے سامنے آتے ہیں۔ ان میں پہلے کی حیثیت اگر اصل کی ہے تو دوسرے کی حیثیت فرع کی۔ کیوں کہ جب تک فکر ونظر کی اساس استوار نہیں ہوتی اس وقت تک عمل وتعلق کی عمارت اس پر تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے انبیائے کرامؑ نے سب سے پہلے ایمان بالغیب کی دعوت دی پھر عمل صالح کی تربیت۔

قرآن مجید کا مخاطب:

قرآن مجید کا مخاطب انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا۔ اس کے سر پر خلافت فی الارض کا تاج رکھا۔ اس کے جسد کو خاکی بنایا مگر اس کے اندر روح ملکوتی کے واسطے سے عقل وادراک کی غیر معمولی صلاحیت وقوت پیدا کر کے اس کے دائرہ عمل واختیار کو دیگر مخلوقات کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع کر دیا۔ پس انسان کا اصل تشخص اس کے جوہر عقل اور ادراک کی وجہ سے ہے جس کے احاطے میں جزئیات کے ساتھ کلیات اور مظاہر کے ساتھ حقائق بھی آتے ہیں انہی کلیات اور حقائق کے ادراک سے انسانی علوم اور افکار کا انبار برآمد ہوتا ہے بلکہ یہی وہ صلاحیت ہے جس کی وجہ سے وہ مخلوق سے خالق، مصنوع سے صانع کے وجود کا ہی نہیں بلکہ اس کی صفات وخصوصیات کا اندازہ کر سکتا ہے، بلکہ وہ اس کائنات کے نظام کا مطالعہ ومشاہدہ کر کے، اس کے مالک کی مقرر کردہ سنن وقوانین سے جزا وسزا تک پہنچ سکتا ہے۔ نفس انسانی کے دیگر پہلو اس کے تابع ہیں۔ انسان کی گمراہی اور اس کا بگاڑ دراصل اس کے فکر ونظر کا بگاڑ ہے۔ اگر اس کی فکر میں کجی آجائے تو سارا فلسفۂ زندگی غلط، علم کی پوری عمارت کھوکھلی بلکہ زندگی کا ہر گوشہ فساد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

اگر چہ عقل، انسان کے لیے، اللہ کا بہت بڑا عطیہ ووسیلہ ہے۔ لیکن یہ عقل اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایسی خامیاں بھی رکھتی ہے۔ کہ تنہا اس کی رہنمائی پر اکتفا اور اعتماد نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ایک طرف وہ صفت کمال سے متصف نہیں ہے تو دوسری طرف خطا ولغزش سے بھی مبرا نہیں ہے کیوں کہ وہ حواس خمسہ کی راہ سے حاصل ہونے والی معلومات (جزئیات) کو ترتیب دے کر کلیات بناتی اور ان سے نتائج کا استخراج کرتی ہے۔ اور حواس خمسہ کی محدودیت شک وشبہ سے بالاتر ہے خصوصا مابعد الطبیعاتی مسائل میں تو وہ بہت عاجز وناتواں ہے۔ لہذا اس کے دریافت شدہ حقائق کے اندر غلطیوں کا پایا جانا قابل تعجب نہیں۔ اسی طرح عقل انسانی مختلف رجحانات، محرکات اور داعیات کے ساتھ کبھی ہوائے نفس سے، تو کبھی قومی وملکی تعصب سے مغلوب ہوکر جانبداری برتتے ہوئے غلط فیصلے بھی کرسکتی ہے۔

چنانچہ انسان کے لیے صحیح فکر وعمل جاننے کا قابل اطمینان ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ اس لیے روز اول سے ہی خالق کائنات نے انسان کے لیے نبوت ورسالت کے سلسلہ کا وعدہ فرمایا اور انسان کی کامیابی اور ناکامی کو اس کے ساتھ وابستہ کردیا۔ ”فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ“. (البقرۃ:۳۹)

ترجمہ: پس اگر تمہارے پاس میری جانب سے ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان کے لیے خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور انہیں جھٹلایا وہ لوگ آگ میں پڑنے والے ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ”فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ“. (طہ:۱۲۴) ترجمہ: ”پس اگر تمہارے پاس میری جانب سے ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی وہ نہ راہ حق سے بھٹکے گا اور نہ ہی بدبختی سے دوچار ہوگا۔ الغرض ہر دور میں انبیاء کرام نے آسمانی کتابوں کی روشنی میں اپنی امتوں کو ایک طرف اللہ پر ایمان کی دعوت دی تو دوسری طرف ان کے سامنے اپنی اطاعت واتباع کا مطالبہ بھی رکھا۔

قرآن مجید کا اسلوبِ استدلال:

قرآن مجید کی یہ بنیادی دعوت، دعوت ایمان بالغیب کہلاتی ہے۔ یہ ایمان بالغیب، اندھی عقیدتمندی کا نام نہیں یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ جن حقائق کے تسلیم کرنے کی بات کرتا ہے وہ بے دلیل، مجرد تحکم پر مبنی ہیں۔ وہ انسان کو خدا کی معرفت ورضا کی منزل تک، اس کی عقل پر پٹی باندھ کر نہیں لے جاتا۔ نہ ہی وہ ان حقائق کو انسان کے لیے مشاہدہ کرانے کا دعوی کرتا ہے۔ بلکہ اس کی دعوت کا محور یہ ہوتا ہے کہ انسان عقل واستدلال سے کام لیتے ہوئے، محسوسات کے دائرے سے بلند ہو کر حقائق غیبیہ کی صداقت کا جائزہ لے۔

اسی طرح وحی الٰہی، اہل ایمان کی تربیت بھی اس اساس پر کرتی ہے کہ وہ حقوق وفرائض کے سلسلے میں جذبات سے مغلوب ہونے کے بجائے عقل ودانشمندی کی بنیاد پر حق وناحق کی نشاندہی کا کام کرے۔ چنانچہ اس نے شریعت کے قوانین وآداب بتاتے ہوئے اکثر اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ان کی معقولیت عقلمندوں پر واضح ہے، ان احکام کی پابندی عقل کا اقتضاء ہے اور اگر انسان جذبات ودیگر محرکات سے مغلوب نہ ہو تو ان کی افادیت وصحت سے کسی عقلمند کو انکار نہیں ہو سکتا۔

نیز انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایسی فطری رہنمائی عطا کی جو دیگر مخلوقات سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ اس کی فطرت کو خیر وشر، صحیح وغلط، نفع وضرر کی صرف معرفت ہی نہیں بخشی بلکہ اس میں بھلائی سے محبت اور برائی سے نفرت کا جذبہ بھی ودیعت کیا۔ "وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ" ترجمہ: "اور ہم نے اسے دو راہیں دکھائیں" (البلد:۱۰) "وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا" (الشّمس:۷،۸) ترجمہ: اور قسم ہے نفس کی اور اس کے تسویہ اور اس میں بدکاری اور پرہیزگاری کے الہام کرنے کی۔

مگر یہ فطرت ماحول کی تقلید اور اس کے جمود کے زیر اثر جب غفلت وتعصب کا شکار ہو جاتی ہے تو اس کی ضمیر کی یہ معرفت وچاہت ماند پڑ جاتی ہے بلکہ غلط سمتوں کی طرف رہنمائی دینے لگتی ہے۔ لیکن عقل کی روشنی اس کے دبیز پردوں کو جب چاک کرتی ہے تو اس کی فطرت کے سارے اسرار وتضمنات کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

مزید برآں انسان کو خلافت فی الارض کے منصب پر فائز کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ

نے انسان کے لیے اس کائنات کو صرف مسخر ہی نہیں کیا ہے کہ وہ اپنے اندر اس کی جسمانی و مادی تقاضوں اور ضرورتوں کا بہترین جواب رکھتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی شکل وصورت عطا کی کہ وہ اس کے روحانی، اخلاقی اور عقلی آسودگی کا بہترین مواد بھی رکھتی ہے۔اس کا ہر پتہ، اس کا ہر نقش، اس کی ہر حرکت، اس کا ہر سکون اس کے لیے ایک کھلی کتاب ہے۔

مگر انسان پر جب مادیت وحیوانیت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اپنی مادی بھوک و پیاس کو مٹانے کے لیے اس کائنات کے ہر ورق کو پڑھتا ہے، ہر پتھر کو الٹتا ہے ہر چیز کا بے محابا استعمال کرتا ہے بلکہ وہ اس کائنات کی بہرہ مندی سے دنیا کا عاشق ہوکر آخرت کا انکار تک کر بیٹھتا ہے۔لیکن عقل کی رہنمائی اسے اوپر اٹھاتی ہے اس کے ملکوتی، روحانی و اخلاقی تقاضے یاد دلاتی ہے تو اس کائنات کی تخلیق کی حکمت، غرض وغایت، افادیت اپنی حیثیت مسئولیت اور جوابدہی کا اسے احساس ہونے لگتا ہے۔ نیز اس کائنات کے بے لچک طبعی نوامیس کی طرح اخلاقی وروحانی قوانین پر بھی اسے یقین ہوتا چلا جاتا ہے۔

قرآنی استدلال کی اساس:

قرآن مجید نے بنی نوع انسانی کی کامرانی کے لیے جو بھی افکار وعقائد پیش کئے جو بھی اصول وضوابط وضع کئے اور جو بھی احکام وآداب سامنے رکھے، انہیں عقلی استدلال سے مبرہن اور محکم کیا۔اس عقلی استدلال کے لیے ایک طرف اس نے انسان کی فطرت سلیم کو بنیاد بنائی تو دوسری طرف کائنات رنگ وبو کو اس نے مأخذ قرار دیا۔ اس کی ہر بات اساسی طور پر انہیں دو سرچشموں سے مصدق ہوتی ہے۔"سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ "(فصلت: ۵۳) ترجمہ: ''ہم انہیں اپنی نشانیاں کائنات اور ان کے نفوس میں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہوجائے کہ وہی برحق ہے۔کیا تمہارا پروردگار کافی نہیں یعنی یہ بات کہ وہ ہر چیز پر گواہ ونگراں ہے''۔

معاملہ خواہ اثبات توحید کا ہو یا تردید کفر وشرک کا، انبیاء کی طاعت واتباع کی بات ہو یا محاسبہ ومجازات کا مسئلہ ہو، ہر جگہ اس نے کائنات سے اس کی حکمت ومقصدیت

سے، اس کے بناؤ وبگاڑ سے استدلال کیا۔اسی لیے اس نے انسان کو بار بار کائنات کی سیر کرنے، مشاہدہ کرنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دی۔ "قُلِ انظُرُواْ مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَمَا تُغْنِي الآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَن قَوْمٍ لاَّ يُؤْمِنُونَ" (یونس:۱۰۱) ترجمہ: "آپ کہہ دیجئے تم غور کرو آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے حالاں کہ نشانیاں اور ڈراوے اس قوم کو فائدہ نہیں دیتے جو ایمان لانا نہیں چاہتی۔" وَكَأَيِّن مِّن آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ" (یوسف:۱۰۵) ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں کس قدر نشانیاں ہیں جن پر یہ گزرتے ہیں اس حال میں کہ وہ ان سے اعراض کیے ہوئے ہیں۔اسی طرح اس نے انسانی فطرت کو صدا دی۔اس کی مذہبیت، خدا پرستی، خیر وشر کی معرفت، اُسوہ کی تلاش سے توحید، نبوت ورسالت اور جزا وسزا پر استدلال کیا، "وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ "(الذاریات) اور تمہارے نفوس میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں سمجھائی نہیں دیتا"۔

نیز قرآن مجید نے کائنات اور فطرت کے علاوہ ثانوی طور پر دو اور مآخذ ومصادر سے اپنی تعلیمات کی حقانیت پر استدلال کیا۔ان میں پہلا مصدر پچھلے انبیاء کرام اور صحف سماویہ کی تعلیمات تو دوسرا مآخذ قوم ومخاطب کے مسلمات پر مشتمل ہے۔ارشاد ربانی ہے: "إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى. صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى "(الأعلیٰ: ۱۸-۱۹) ترجمہ: بے شک یہ تعلیم پچھلے صحیفوں یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں موجود ہے۔ "قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ والأَبْصَارَ وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيَّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَن يُدَبِّرُ الأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللّهُ فَقُلْ أَفَلاَ تَتَّقُونَ. فَذَلِكُمُ اللّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلاَّ الضَّلاَلُ فَأَنَّى تُصْرَفُونَ" (یونس: ۳۱،۳۲) ترجمہ: "آپ پوچھئے، کون تمہیں آسمان وزمین سے رزق دیتا ہے کون سماعت اور آنکھوں پر اختیار رکھتا ہے کون ہے جو مردے سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو برآمد کرتا ہے اور کون ہے جو معاملہ کی تدبیر وانتظام فرماتا ہے وہ کہیں گے اللہ، تو کہہ دیجئے تو کیا تم نافرمانی اور شرک سے نہیں بچو گے۔پس وہی ہے اللہ، تمہارا حقیقی پروردگار تو حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے پس کیسے تم پھیر دئے جاتے ہو۔

''قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ. سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ. قُلْ مَن رَّبُّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ. سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ. قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ. سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّى تُسْحَرُونَ (المؤمنون: ۸۴-۸۹)

ترجمہ:'' آپ پوچھیے زمین اور اس میں موجود مخلوق کس کی ملک ہیں اگر تم جانتے ہو، وہ کہیں گے اللہ ہی کی، آپ کہہ دیجئے تو کیا تم دھیان نہیں دیتے آپ پوچھیے ساتوں آسمان کا مالک اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ کہیں گے اللہ ہی کے لیے، آپ کہہ دیجئے تو کیا تم شرک سے نہیں بچو گے۔ آپ پوچھیے کس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے؟ اس حال میں کہ وہی پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف پناہ نہیں دی جا سکتی۔ اگر تم جانتے ہو، وہ کہیں گے اللہ ہی کے لیے، آپ کہہ دیجئے پس کس طرح تم بہکائے جاتے ہو۔

عقلی استدلال کی اہمیت وحیثیت:

قرآن مجید کے طرزِ استدلال کی اہمیت کا اندازہ ذیل کے امور سے کیا جاسکتا ہے کہ

۱- اس نے بتایا کہ اسی عقل انسانی اور وحی ربانی کی آواز کو نہ سننے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان آخرت میں دائمی ناکامی اور تباہی سے دوچار ہوگا۔ چنانچہ اس نے اس حقیقت کی ترجمانی اس طرح کی کہ جہنمی دوزخ میں جانے سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف کریں گے۔''وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ'' (الملک: ۱۰) ترجمہ: اور وہ کہیں گے کاش ہم سنتے ہوتے یا عقل سے کام لیتے تو جہنم والوں میں نہ ہوتے۔

۲- نبوت ورسالت کی رہنمائی کے مقابلے میں جب انسان اپنے گمراہ اباءواجداد کی پیروی کو ترجیح دیتا ہے تو اس نے ان کے طریقے کی خامی کی نشاندہی دو پہلوؤں سے کی کہ وہ اگر عقل وخرد کے خلاف چلیں اور ہدایت ربانی سے دور رہیں تو کیسے پیروی کے حقدار ہوسکتے ہیں۔'' وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا

بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لا يَعْقِلُونَ شَيْئاً وَلاَ يَهْتَدُونَ" (البقرہ: ۱۷۰) ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا کہ تم پیروی کرو اس چیز کی جسے اللہ نے نازل فرمایا تو کہتے بلکہ ہم اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم اپنے آباء واجداد کو پایا ہے۔کیا یہ ان کی پیروی کریں گے،اگر چہ ان کے آباء واجداد کچھ بھی عقل سے کام نہ لیتے ہوں اور نہ راہِ ہدایت پر چلتے ہوں۔

۳- بندگی رب کی دعوت دینے کے لیے قرآن مجید میں اسی عقل کو اساس بنانے کی رہنمائی کی گئی۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے تسلی دی کہ اگر انسان عقل کے تقاضوں کو نہ سمجھے اور نہ مانے تو پھر وہ آپؐ کی دعوت کو قبول نہیں کرسکتا۔آپؐ اس کے سلسلے میں کبیدہ خاطر نہ ہوں۔انسان اگر اپنے اصل امتیاز ہی کو ضائع کردے تو نبی کی دعوت کی صداقت وہ کہاں سے پائے گا۔ارشاد ربانی ہے: "أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُواْ لا يَعْقِلُون" (یونس: ۴۲) ترجمہ: تو کیا آپ بھی بہروں کو سنائیں گے اگر چہ وہ عقل نہ رکھتے ہوں۔ "أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ" (الفرقان: ۴۴) ترجمہ: کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ ان میں اکثر سنتے ہیں یا عقل رکھتے ہیں۔

۴- اس نے بتایا کہ عقل انسانی کے ذرائع (حواس) کو معطل کرنے والا انسان صرف عقل ہی سے محروم نہیں ہوتا بلکہ وہ چوپایوں سے بدتر اور خدا کے نزدیک بدترین مخلوق (جاندار) بن جاتا ہے۔"إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لاَ يَعْقِلُونَ" (الأنفال:۲۲) ترجمہ:یقیناً اللہ کے ہاں،بدترین جاندار بہرے اور گونگے ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔

۵- اس نے بتایا کہ عقل وخرد سے کام نہ لینے والا انسان ایمان کی نعمت سے شادکام کہاں سے ہوگا بلکہ یہ محرومی تو اسے کفروشرک کی گندگی میں آلودہ کرے گی۔ "وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلاَّ بِإِذْنِ اللّهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لاَ يَعْقِلُونَ" (یونس:۱۰۰) ترجمہ:اور کسی بھی شخص کے لیے اس کی گنجائش نہیں کہ وہ اللہ کے اذن (مشیت) کے بغیر ایمان لے آئے اور وہ (اللہ) گندگی

(کفر و شرک) کو مسلط کرتا ہے ان لوگوں پر جو عقل نہیں رکھتے۔

۶- نیز اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس آخری صحیفہ ہدایت کے نزول کا ایک بنیادی مقصد انسانی عقل کی رہنمائی و دستگیری ہے تا کہ وہ اس کی سرپرستی میں اپنی کوتاہی اور غلطی سے دامن کش ہو کر انسان کو صحیح منزل تک بہم پہنچائے۔ لہذا اس نے اس میں غور و فکر کرنے اور تدبر کرنے کا صریح حکم دیا ہے۔

"اِنَّا اَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن" (یوسف: ۲) ترجمہ "یقیناً ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے امید کرتے ہوئے کہ تم سمجھ سکو گے"۔ "إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ" (الزخرف:۳) ترجمہ: "یقیناً ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے تا کہ تم سمجھ سکو"۔

"كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ" (ص: ۲۹) یہ کتاب جسے ہم نے آپؐ کی طرف نازل کیا ہے، بابرکت ہے تا کہ یہ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں اور عقلمند نصیحت حاصل کریں۔

"قَدْ جَاءَ كُم بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ" (الانعام:۱۰۴) تحقیق کہ رب کی جانب سے دل کی آنکھیں کھولنے والے دلائل آچکے ہیں۔ پس جو کوئی انہیں بصیرت سے دیکھے تو اس کو اس کا فائدہ ہوگا اور جو کوئی اندھا ہو جائے تو اس پر اس کا وبال، اس حال میں کہ میں تم پر نگران نہیں ہوں۔

الغرض قرآنی استدلال کے اسلوب کے سلسلے میں یہ چند معروضات ہیں جن سے قرآنی اور دینی تعلیمات کے سلسلے میں پھیلی ہوئی غلط فہمی دور ہو سکتی ہے کہ وہ محض تحکم پر مبنی ہوتی ہیں، انسان کی عقل سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب صرف جذباتی بنیاد رکھتا ہے۔ عقل کی کسوٹی پر اس کی باتیں کھری نہیں اترتی۔

عقل کی نشو ونما کے لئے رجوع إلی القرآن کی اہمیت
(امام فراہی کی کتاب حجج القرآن سے خصوصی استفادہ)

محی الدین غازی

عقل اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، فرد کا ارتقاء ہو یا قوموں کا عروج، عقل کی کارفرمائی ہر دو جگہ ہوتی ہے، عقل کی رہنمائی میں صحیح مزاج بھی بنتا ہے اور صحتمند ماحول بھی، انکشافات بھی ہوتے ہیں اور ایجادات بھی، انسان خود کو بھی دریافت کرتا ہے اور خدا کو بھی۔ یہ انسان کو جہاں بانی بھی سکھاتی ہے اور جہاں آرائی بھی، یہی تزکیہ کا بھی راز ہے اور عمران کا بھی، اسی سے زندگی بھی سنورتی ہے اور زمین بھی۔

امت مسلمہ کے ہر محاذ پر زوال کی ایک بڑی وجہ اور اقوام عالم کے سامنے اپنے موقف کی طاقتور ترجمانی نہ کر پانے کا ایک بڑا سبب عقل کے استعمال کے سلسلے میں جھجھک، تردد، بدگمانی اور بسا اوقات اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک طرح کا معاندانہ رویہ ہے، جس کی وجہ سے امت کے اندر وہ بہت سارے غلط خیالات نظریات رویے اور ضابطے رواج پا گئے جنہیں دیکھ کر عقل انگشت بدنداں ہوتی ہے، اور جو عقل کو حکم بنانے کی صورت میں کبھی بھی قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے، تفکیری عمل سے دوری کا نتیجہ یہ بھی ظاہر ہوا کہ امت مسلمہ جس دین اور پیغام کی علم بردار ہے اس کی کماحقہ پرزور ترجمانی کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔

ابتدائی عہد زریں کے بعد مسلمانوں میں مطلوب سطح پر دینی ترقی نہیں ہو سکی کہ اس کے لئے اجتہاد اور تدبر مطلوب تھا، اور دنیوی ترقی وسربلندی بھی نہیں مل سکی کہ یہاں بھی ہر دریافت اور ہر ایجاد کے لئے عقل کی پشت پناہی لازم تھی۔ عقل جو خالص عطیہ الٰہی ہے اور جو رہنمائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، اس سے بسا اوقات ایسی دوری اختیار کی

گئی گویا کہ وہ عطیہ الٰہی نہیں بلکہ شیطان کا عیار ایجنٹ ہے جس سے حتی الامکان الحذر اور دوری اختیار کی جائے، کہ جس نے عقل سے رشتہ استوار کیا وہ گمراہی کا شکار ہوا۔ ایک طرف اہل مذہب عقل کو اس کا حقیقی مقام دینے کے سلسلے میں جھجک کا شکار ہوئے تو دوسری طرف دین بیزار لوگوں میں یہ احساس برتری بھی پروان چڑھنے لگا کہ اہل مذہب کو عقلیت اور معقولیت کے حوالے سے پسپا کیا جا سکتا ہے۔

اس صورت حال میں رجوع الی القرآن کی ضرورت بہت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ امت کو ذہنی پسماندگی سے نکالنے اور تفکیری میدان میں بھرپور پیش قدمی کے لئے آمادہ و تیار کرنے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں عقل کے مقام ومرتبہ کے استعمال کی تاکید اور عقل کی نشو ونما کے انتظام کی طرف متوجہ کیا جائے۔ عقل کے مقام ومرتبہ، عقل کے سلسلے میں امام فراہی لکھتے ہیں: عقل ''وہ نور الٰہی ہے جس کے ذریعہ اللہ انسان کو چوپایوں پر برتری عطا کرتا ہے''، عقل وہ میزان ہے جو حق اور باطل میں فرق بتائے۔''

''نور إلهي الذي يرفع الله به الإنسان على البهائم''(۱). و هو الميزان الفاروق بين الحق و الباطل.''(۲).

قرآن مجید کے نزول کا منشا تو یہ تھا کہ لوگ ظن وہوی اور تقلید اعمی سے آزاد ہو کر اور غور وفکر کے راستوں پر قابض جابروں کے خلاف اعلان بغاوت کر کے عقل کا بھرپور استعمال کریں اور حالیہ اور پیش آمدہ دونوں زندگیوں کی ترقی کی راہیں عقل کی بصیرت سے تلاش کریں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ عقل کی غلط نمائندگی کرنے والوں کے بیمار رویہ نے لوگوں کو عقل سے ہی بدظن کر دیا، اور یہ عام انسانیت اور بطور خاص انسانیت کی رہنمائی کی امین امت مسلمہ کے حق میں بہتر نہیں ہوا۔

علامہ فراہی لکھتے ہیں: ''بہت سارے لوگ جن کی توجہ دینداری اور قرآن وسنت سے لگاؤ پر ہوتی ہے، سمجھتے ہیں کہ عقل کا راستہ الٰہی تعلیم کے راستے کی ضد ہے۔ ان کا گمان ہے کہ ایمان تو انبیاء کی خبر پر مبنی ہوتا ہے، اور انبیاء کی پہچان بس معجزات ہیں۔ انہوں نے ایمان اور شریعت کے بارے میں جو کچھ تعلیم دی وہ ہم نے ان کے بتانے کی بنیاد پر قبول کر لی۔ اگر عقل کو علوم دین کی راہ بننا ہوتا تو پھر ہم کو وحی کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر ایسا

نہیں ہوتا تو اللہ نے ایمان بالغیب کی ستائش نہ کی ہوتی ۔ یہ گمان اس قدر غالب ہوا کہ وہ یہ بھی ماننے لگے کہ شریعت کے سارے احکام صرف اس پر مبنی ہیں کہ اللہ نے ان کا حکم دیا ہے اور اسی لئے ہم پر لازم ہے کہ ان میں حکمت کا پہلو تلاش کئے بنا انہیں اختیار کرلیں ۔ چونکہ انہوں نے یہ رائے اختیار کرلی اس لئے دین کے تمام امور میں وہ عقل وفکر کے استعمال سے دور کردیئے گئے ۔قرآن کے دلائل پر غوروفکر تو اس سے آگے کی بات ہے۔

ان کی عقل کے سلسلے میں یہ رائے اس لئے بنی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے عقل سے خود کو منسوب کرنے والے فلاسفہ اور متکلمین کی قلابازیوں اور درماندگی کو دیکھا، چنانچہ وہ عقل کی راہ سے ہی بدگمان ہوگئے ۔لیکن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ ان کی گمراہی کی وجہ عقل نہیں تھی، گمراہی کی وجہ یہ تھی کہ فلسفہ بازی کا ان پر غلبہ ہوگیا اور انہوں نے فطرت کا وہ راستہ چھوڑ دیا جو انہیں اللہ نے اپنی کتاب اور اپنے رسولوں کی تعلیمات کے ذریعہ دکھایا تھا۔ اس لئے اب ہمارے خیال میں ضروری ہے کہ وہ راستہ بتایا جائے ۔تاکہ قرآن جو محکم دلائل اور روشن حکمتیں لایا ہے، اور جو اس نے غوروفکر کرنے پر ابھارا اور اہل عقل وفکر کو سراہا ہے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔“

”إن اکثر الذین معظم همهم التدین و الاشتغال بالكتاب و السنة يظنون أن طريق العقل مباين للتعليم الالهي. فيز عمون بأن الإيمان مبني على إخبار من الأنبياء عليهم الصلاة و إنما عرفناهم بالمعجزات، فكل ما علمونا من الإيمان و الشرائع تقبلناه بمحض إخبارهم. فإنه لو كان للعقل سبيل إلى علوم الدين لكنا في غناء عن الوحي، ولو لا ذلك لما مدح الله الإيمان بالغيب. ومن غلبة هذا الظن زعموا أن الشرائع كلها مبنية على أمر الله تعالىٰ بها، فيلز منا أخذها من غير طلب الحكمة فيها. و بما صاروا على هذا الرأي صرفوا عن استعمال العقل و الفكر في أمور الدين كلها، فكيف بالتفكر في دلائل القرآن.

والباعث الأصلي على هذا الرأي ما وجدوا عيانا من الخبط والشطط في المنتسبين إلى العقل من الفلاسفة و المتكلمين فأساؤا لظن

بالمعقول. ولكن قد تبين لي أن ضلالهم لم يكن من جانب العقل بل من تسلط التفلسف و تركهم طريق الفطرة التي هدى الله سبحانه إليها بكتابه و تعليمات رسله. فرأينا الحاجة إلى ذكر هذا الطريق ليركنو إلى ما جاء به القرآن من الحجج البالغة و الحكم البازغة، و من الحث على استعمال النظر و الفكر و من مدح أرباب العقل و الحجر.(۳).

قرآن مجید میں عقل کا مقام:

قرآن مجید نے عقل کو اس کا حقیقی مقام عطا کیا، جو درحقیقت ایک مقام بلند ہے، یہ امر بہت اہم ہے کہ پورے قرآن مجید میں کہیں بھی عقل کے استعمال کے سلسلے میں کسی احتیاط وحذر کی تلقین یا کسی طرح کے حدود و قیود کا بیان نہیں ملتا، قرآن مجید کا ہر دعویٰ اور ہر دلیل اس وثوق کے ساتھ ہے کہ گویا عقل کا یہی تقاضا ہے، کسی بھی زعم یا مفروضہ کا ابطال بھی اسی حوالے سے ہے کہ عقل سے اس کا ابطال ہوتا ہے۔ قرآن کے بیانات سے واضح ہوجاتا ہے کہ عقل اور وحی الٰہی میں مکمل توافق اور ہم آہنگی ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے فرد کی تعمیر اور ایسے ذہن کی تشکیل مقصود ہے جو عقل کو مطمئن کرنے والے دلائل پر انحصار کرتا ہے، جس کے ایمان کا ہر جزء دلائل سے آراستہ ہوتا ہے، اور جو ہر دعویٰ کی پشت پر موجود دلیل کی قوت کو ناپنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید معجزات سے متحیر ہوکر ایمان لانے کے بجائے دلائل سے مطمئن ہوکر ایمان لانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

امام فراہی لکھتے ہیں: ''آسمانی کتابوں میں قرآن وہ کتاب ہے جو سب سے بڑھ کر عقل کو مخاطب کرتی ہے، عقلی دلائل کی طرف عقل کو متوجہ کرتی ہے، عاقلوں کی تعریف اور غافلوں کی مذمت کرتی ہے، یہ ایسی محکم اور واضح قرآنی حقیقت ہے جس کے سلسلے میں کسی کو شک بھی نہیں ہوسکتا۔''

''إن القرآن أكثر الكتب المنزلة خطابا للعقل و تنبيها له على الدلائل العقلية و مدحا للعقلاء و ذما للغافلين. وهذه من محكمات القرآن و بيناته لا يشك فيها أحد.''(۴).

پورے قرآن مجید میں کہیں بھی عقل کی مذمت میں یا عقل کو غور وفکر کی بنیاد بنانے والوں کی مذمت میں کوئی صراحت تو کیا اشارہ بھی نہیں ملتا۔قرآن مجید میں کہیں بھی گمراہی کے اسباب کے ذیل میں عقل کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے،اس کے برعکس عقل سے پہلوتہی کی شدید طور سے مذمت کی گئی ہے۔

امام فراہی لکھتے ہیں:''عقل کے بارے میں تو اللہ فرماتا ہے،(اور وہ رجس کو ان لوگوں پر ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے)،یہاں اللہ نے صاف بتادیا کہ عقل کو جو چھوڑ دیتے ہیں ان پر رجس چپکا دیا جاتا ہے۔غرض جو عقل کا استعمال نہیں کرتا،وہ حق اور باطل اور خبیث اور پاک میں فرق نہیں کرسکتا،اس لئے اس کا ہر طرح کے شر میں پڑ جانا یقینی ہے۔''

''وأما العقل، فقال تعالى: (و يجعل الرجس على الذين لا يعقلون) (سورة يونس: ١٠٠) فصرح بلزوم الرجس بنبذ العقل، فمن لم يستعمل العقل لم يتميز بين الحق و الباطل و الطيب و الخبيث فلا بد أن يقع في كل شر۔''(۵)۔

قرآن مجید میں عقل کو کس قدر سراہا گیا ہے،اس کے بارے میں عقاد لکھتے ہیں:

''قرآن کریم عقل کا ذکر صرف وہاں کرتا ہے جہاں عقل کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔اور جہاں اس کے مطابق عمل کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے اور پھر یہ تذکرہ آیتوں کے سیاق میں ضمنی یا اتفاقی طور سے نہیں ہوتا،بلکہ ہر جگہ لفظ اور دلالت کی تاکید کے ساتھ ہوتا ہے۔امر اور نہی کے ہر موقعہ پر اس کی تکرار ہوتی ہے،جہاں مومن کو اپنی عقل کو حکم بنانے پر ابھارا جاتا ہے،یا منکر کو عقل کے بارے میں لاپرواہ ہونے اور اس پر پابندی قبول کرلینے پر ملامت کی جاتی ہے۔مزید برآں جدید علوم کے قبیلہ سے تعلق رکھنے والے علم نفس کے ماہرین عقل کے جتنے اطلاقات بتاتے ہیں ان میں سے کسی ایک کے بجائے عقل کے سارے ہی مختلف کاموں اور مختلف خصوصیات سے متصف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔''

''القرآن الكريم لايذكر العقل إلا في مقام التعظيم و التنبيه إلى وجوب العمل به و الرجوع إليه، و لا تأتي الاشارة اليه عارضةو لا مقتضبة فى سياق الآية ،بل هى تأتي في كل موضع من مواضعها مؤكدة جازمة

بـالـلـفظ و الدلالة، و تتكرر في كل معرض من معارض الأمر و النهى التى يـحـث فيها المؤمن على تحكيم عقله أو يلام فيها المنكر على إهمال عقله و قبـول الـحـجر عليه، و لا يأتي تكرار الإشارة إلى العقل بمعنى واحد من مـعـانيـه التـى يشـرحهـا الـنـفسانيون من أصحاب العلوم الحديثة، بل هى تشمل و ظائف الإنسان العقلية على اختلاف أعمالها و خصائصها.''(٦).

امام ابن تیمیہ کا بھی ماننا ہے کہ عقل اور شریعت میں تعارض نہیں ہوسکتا ہے، تاہم وہ احتیاط سے کام لیتے ہوئے عقل کے ساتھ صریح کی قید لگانا ضروری سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''عقل صریح سے جو بات معلوم ہو وہ شریعت سے متعارض ہو جائے اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ حق یہ ہے کہ عقل صریح سے ثابت بات نقل صحیح سے ثابت بات سے ہرگز ہرگز نہیں ٹکرا سکتی ہے۔ میں نے اس پر غور کیا ان بحثوں میں جو لوگوں کے درمیان ہوا کرتی ہیں، میں نے پایا کہ صحیح اور صریح نصوص کی۔ خلاف وہ فاسد شکوک ہوا کرتے ہیں جن کا باطل ہونا عقل سے ہی معلوم ہو جاتا ہے، بلکہ عقل سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بات جو ان شکوک کے خلاف ہے اور شریعت کے مطابق ہے وہی درست ہے۔ اس پر میں نے بڑے اصولی مسائل میں غور کیا ہے جیسے توحید، صفات، تقدیر، نبوت اور آخرت کے مسائل۔ اسی طرح میں نے پایا کہ عقل صریح سے جو معلوم ہوتا ہے اس سے کوئی منقول دلیل کبھی نہیں ٹکراتی ہے، بلکہ وہ منقول دلیل جسے اس کا مخالف سمجھا جاتا ہے، وہ کوئی موضوع حدیث ہوتی ہے یا کوئی ضعیف دلالت ہوتی ہے، وہ اتنی کمزور ہوتی ہے کہ اگر عقل صریح سے نہیں ٹکرائے تو بھی دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے، چہ جائے کہ عقل صریح سے اس کا تعارض ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ رسول ایسی چیزوں کی خبر دیتے ہیں جو عقل کے نزدیک محال تو نہیں ہوتی ہیں پر حیران کن ضرور ہوتی ہیں۔ یعنی وہ ایسی چیزوں کی خبر نہیں دیتے ہیں جن کا نہیں ہونا عقل سے معلوم ہوتا ہو، بلکہ ایسی چیزوں کی خبر دیتے ہیں جن کا معلوم کرنا عقل کے بس سے باہر ہوتا ہے۔''

''مـا عـلـم بـصـريـح الـعقل لا يتصور أن يعارضه الشرع ألبتة بل الـمـنقول الصحيح لا يعارضه معقول صريح قط قط. و قد تأ ملت ذلك

في عامة ما تنازع الناس فيه فوجدت ما خالف النصوص الصحيحة الصريحة شبهات فاسدة يعلم بالعقل بطلانها بل يعلم بالعقل ثبوت نقيضها الموافق للشرع. وهذا تاملته في مسائل الأصول الكبار كمسائل التوحيد و الصفات و مسائل القدر و النبوات و المعاد و غير ذالك و وجدت ما يعلم بصريح العقل لم يخالفه سمع قط بل السمع الذي يقال إنه يخالفه إما حديث موضوع أو دلالة ضعيفة فلا يصلح أن يكون دليلا لو تجرد عن معارضة العقل الصريح فكيف إذا خالفه صريح المعقول. و نحن نعلم أن الرسل لا يخبرون بمحالات العقول بل بمحارات العقول فلا يخبرون بما يعلم العقل انتفاءه بل يخبرون بما يعجز العقل عن معرفته۔"(۷)۔

ہمارے دینی لٹریچر میں عقل اور وحی کے درمیان تعارف پر لمبی بحثیں ملتی ہیں، جبکہ عقل اور وحی کے درمیان تعارض کا تصور قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے، تعارض اگر ہوتا ہے تو وہ اس طرح کہ عقل اور وحی ایک صف میں ہوتے ہیں اور ظن اور ہوی مقابل صف میں ہوتے ہیں۔قرآن مجید تو عقل صریح کے بجائے مطلق عقل کی ستائش کرتا ہے۔

عقل اور وحی کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور کامل توافق کے سلسلے میں امام فراہی کی کتاب حجج القرآن کے ذیل کے اقتباسات بصیرت افروز اور اعتماد افزا ہیں:

"انبیاء کی تعلیم وہ ہوتی ہے کہ عقل کے سامنے لائی جائے تو عقل قبول کرلے جیسے کسی کا جگری دوست اسے دور دراز علاقہ سے کوئی پھل بھیجے تو وہ اسے چکھے اور پھر اس سے خوب لطف اٹھانے لگے، گویا کہ وہ پہلے سے اسی کا مشتاق تھا۔"

"تعليم (الأنبياء) كان مما يراه العقل فيقبله. كمن يهدي إليه أخوه الورد ثمرة من أرض بعيدة فيطعمه و يلتذ به كأنه كان مشتاقا إليها من قبل."(۸).

"انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ عقل کے ذریعہ رہنمائی حاصل کرتا ہے، اسی کے پاس اطمینان پاتا ہے، اور اپنے مخالف پر اسی کے ذریعہ حجت قائم کرتا ہے، وہیں سے اس کے پاس سارے علوم آتے ہیں، خواہ بدیہی طور سے یا غور وفکر اور استنباط کے راستے۔اور وحی تو اس لئے آتی ہے کہ عقل کو بیدار کرے، اس کو صحیح رخ دے، اس کے مقام کو بلند کرے

اور اس کی تائید کرے۔ اسی لئے وحی نے تدبر وتفکر پر بہت ابھارا اور اہل فکر ونظر کی ستائش کی۔ دیکھو ہمارے امام ابراہیم علیہ السلام کو کس طرح وہ تو کفار کے سامنے عقل صریح کے دلائل پیش کر رہے تھے اور کفار محض ظن اور تقلید کا دامن تھامے تھے۔ (اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوش مندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ ''یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا'' ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ اس نے کہا'' تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے؟ انہوں نے کہا'' کیا تو ہمارے سامنے صحیح بات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟) یعنی تیرے پاس دلیل ہے یا تو مسخرہ پن کر رہا ہے۔ تو وہ واضح دلیل لے آئے جیسا کہ اللہ ان کے بارے میں بتاتا ہے: (اس نے جواب دیا: نہیں، بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں) یعنی میں بصیرت پر ہوں اور صریح حق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اور اسی لئے اس کی تمہارے سامنے گواہی دے رہا ہوں۔''

''إن الإنسان بفطرته يهتدي بالعقل، و إليه يطمئن و به يحتج على من خالفه، و منه يأتيه العلوم كلها إما بالبداهة أو بالنظر و الا ستنباط. و أما الوحي فإنما جاء لتنبيه العقول و تسديده و تنويه أمره و تأييده و لذلك حث كثيراً على التدبر و الفكر، و مدح أرباب الفهم و النظر. ألا ترى إمامنا ابراهيم عليه السلام كيف احتج على الكفار بصريح العقل وهم تمسكوا بمحض الظن و التقليد. قال تعالى: (وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِه عَالِمِيْنَ .إِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ وَقَوْمِهِ مَا هَذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِىْ أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ – قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَ نَا لَهَا عَابِدِيْنَ . قَالَ لَقَدْ كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ .قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنتَ مِنَ اللَّاعِبِيْنَ) أى هل معك حجة أم تسخر منا، فجاء بالدليل الواضح كما حكى الله عنه: (قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِىْ فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلَى ذَلِكُم مِّنَ الشَّاهِدِيْنَ).

(سورة الأنبياء: 51-56). أي أنا على بصيرة و أرى الحق الصريح عيانا فأشهد به عليكم". (۹).

"عقلی استدلال ہی وہ کسوٹی ہے جس سے سارے مذاہب کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے، اگر وہ نہ ہوتو حق اور باطل کے درمیان فرق محض من مانی اور زبردستی کی بنیاد پر رہ جائے گا"۔

"هي المعيار الذي يحكم به على الأديان كلها، فلو لا هي لكان الفرق بين الحق و الباطل بمحض التحكم و المصادرة". (۱۰).

"نبوت اور وحی پر ایمان اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے جسے عقل قبول کرتی ہے اور جس پر دل مطمئن ہو جاتا ہے، اسی لئے وحی کی آمد دلائل کے ساتھ ہوتی ہے"۔

"الإيمان بالنبوة و الوحي ليس إلا الإيمان بما يقبله العقل و يطمئن به القلب، و لذلك جاء الوحي بالدلائل". (۱۱).

غرض یہ کہ وحی کا استدلال صرف عقل وفہم کے راستے سے ہوتا ہے، اور اسی لئے قرآن میں تدبر وتفکر کو بہت سراہا گیا ہے، تدبر سے مراد ہے کہ فکر کا صحیح عقلی طریقہ پر استعمال ہو، کیونکہ ہر طاقت کا غلط استعمال بھی ہوتا ہے۔"

"الحاصل أن محاجة الوحي لا تكون إلا بطريق العقل و الفهم، و لذلك كثر في القرآن مدح التدبر و التفكر، و المراد من التدبر استعمال الفكر على وجه صحيح عقلي، فإن لكل قوة سوء استعمال. (۱۲).

"عقل اور دین فطرت غایت درجہ ہم آہنگ ہوتے ہیں"۔

"فإن العقل و دين الفطرة على غاية الموافقة". (۱۳).

"جان لو کہ ہماری عقل کی راہ ہے، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جسے عقل خالص قبول کرلے اور فطرت کی رہنمائی کو اس پر اطمینان ہو۔ وحی اور رسولوں کی آمد تو عقل کے بالکل موافق ہوئی، جیسے کہ نگاہ کے لئے روشنی۔ اس کی صراحت کتب مقدسہ میں بہت ہے، اور قرآن تو اس بارے میں سب سے زیادہ صریح ہے"۔

"اعلم أن سبيل العقل فلا نؤمن إلا بما يتقبله محض العقل و يطمئن

به بالهدى الفطري. و إنما جاء الوحي والرسل موافقا له كالنور للبصر. وصرح به الكتب المقدسة كثيرا و القرآن أكثرها تصريحا.(۱۴).

علامہ فراہی کے نزدیک عقل نگاہ ہے اور وحی روشنی ہے۔

عقل کی نشو ونما کا انتظام:

قرآن مجید عقل کی رہنمائی کرتا ہے، تلاش حق کا اس کا راستہ مختصر اور آسان کرتا ہے، یہ بھی ذہن نشین کرتا ہے کہ اس کی تعلیمات عقل سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، مزید برآں اس مضمون میں جس حقیقت کو پیش کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ قرآن مجید نے عقل کی تربیت اور نشو ونما کا بہترین انتظام اپنے اندر سمویا ہوا ہے، کہ جو شخص قرآن مجید کی طرف پورے تجرد اور اخلاص کے ساتھ رجوع کرے، اس کی عقل کی بہتر نشو ونما کے لئے موزوں ترین ماحول اور اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ یہ موضوع بہت دلچسپ اور بے حد اہم ہے، امام فراہی نے حجج القرآن میں گاہے گاہے اس پر گفتگو کی ہے، گو کہ وہ بہت مختصر ہے لیکن بڑی بصیرت افروز اور چشم کشا ہے اور اس سفر کو جاری رکھنے کے لئے اس میں بڑا سامان ہے۔

پہلا انتظام: عقل کی نشو ونما کو عقل کے استعمال سے جوڑ دیا:

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تمام تر قوتوں اور زمین کے تمام تر خزانوں کو محنت وعمل سے جوڑا ہے، ضروری سامان واسباب بنا محنت وکوشش کے فراہم کردئے جاتے ہیں، اور پھر انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ پوشیدہ قوتوں اور خزانوں کو دریافت کرکے انہیں کس قدر روبہ عمل لاسکتا ہے، جس قدر ان کو عمل میں لایا جاتا ہے، ان قوتوں کی بھی نشو ونما ہوتی ہے اور ان قوتوں کے استعمال کے نتائج بھی سامنے آتے ہیں۔

قرآن مجید میں عقل کی نشو ونما کا یہی راستہ دکھایا گیا ہے، بجائے اس کے کہ قرآن پر ایمان لانے والوں کو عقل ودانش محض ان کے ایمان کی وجہ سے دے دی جاتی، یا معلومات کے سارے اسباق ان کو القاء کردیئے جاتے، ان کو عقل کا استعمال کرنے کی ہدایت دی گئی اور بار بار دی گئی، کہ جو عقل کا جس قدر زیادہ استعمال کرے گا وہ اسی قدر دانائی اور بصیرت کے مدارج طے کرے گا۔

علامہ فراہی کے الفاظ میں: ''قرآن نے توحید اور احکام شریعت کی صورت میں ہدایت کے اولین امور کو تو وضاحت سے بیان کر دیا، لیکن عقل کی تربیت اور نشو ونما کو عقل کے کاموں سے جوڑ دیا، کہ اس کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔''

''جاء القرآن بأ وليات الهداية من التوحيد و الشرائع على غاية الوضوح، ولكن علق تربية العقول بأعمالها، ولا سبيل إليه إلا بذلك.''(۱۵).

دوسرا انتظام: قرآن مجید نے اپنے آپ کو غور وفکر کی جولان گاہ بنایا:

عقل کو جس قدر کام میں لایا جائے اس کی نشو ونما اسی قدر بہتر ہوگی، قرآن مجید نے عقل کو عمل کی تلقین کی اور عمل کے لئے میدان کار فراہم کیا، عقل کا بہترین میدان کار خود قرآن مجید ہے، قرآن مجید نہ تو صرف اوامر ونواہی کی کتاب ہے، اور نہ صرف ترغیب و ترہیب کی، بلکہ سب سے پہلے وہ دلیلوں اور نشانیوں کی کتاب ہے، یہ دلیلیں اور نشانیاں ہر وقت غور وفکر کا تقاضا کرتی ہیں۔ قرآن مجید از خود عقل کے لئے میدان کار ہے، اور وہ عقل کے لئے وسیع ترین دنیائے عمل کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ قرآن مجید کی دلیلوں پر غور کرتے ہوئے انسان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس کا طائر فکر کب قرآن کی آیتوں سے نکل کر وسیع کائنات کی نشانیوں کے درمیان پہونچ گیا۔

امام فراہی کے الفاظ میں: ''قرآن نے خود کو جائے تدبر وتفکر بنایا، اور عقل کو اس کام پر ابھارا، جو چیزیں عقل کی جولان گاہ ہوسکتی ہیں ان کی طرف بہت زیادہ متوجہ کیا، جیسے فرمایا: (آیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں)۔ یہ بھی فرمایا: (اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں) اور پھر خوب خوب نشانیاں بیان کیں اور یہ سب غور وفکر پر ابھارنے والی تھیں۔''

'فجعل القرآن موضع التدبر و الفكر و حث عليه العقول فأكثر من التنبيه على ما يكون موضعا و مادة لأعمال العقل. فمن ذلك أمثال قوله تعالى: (أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا) (سورة

محمد/۲۴) وقوله تعالى (إِنَّ فِيُ ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِيُ النُّهَى) (سورة طه/ ۵۴). فأكثر من ذكر الآيات، وما هي إلا ما يحث الفكر و النظر.(۱۶).

قرآن مجید کے دلائل دراصل عقلی دلائل ہیں، اوران کا مخاطب انسانی عقل ہوتی ہے، قرآن مجید اپنے قاری کو ہر قدم پر عقلی دلائل سے مطمئن کرتا جاتا ہے، عقلی دلائل پر غور و فکر کرتے کرتے اس کا ذہنی سانچہ اسی طرز کا ہو جاتا ہے، وہ پھر ہر دعوے کو قبول کرنے سے پہلے اپنی عقل کا اطمینان مانگتا ہے، کسی کا احترام یا کسی کا جبر اسے کسی رائے کو بغیر اطمینان کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں کرتا۔ وہ ہر بات کی دلیل مانگتا ہے، گمان اس کی منزل نہیں بنتا، عوام الناس میں کسی نظریہ کا قبول عام، بزرگوں کی تقلید یا حکمرانوں کا جبر اس پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتا کہ وہ دلیل و برہان سے متنفر یا بے نیاز ہو جائے۔

دلیل و برہان کی روشنی میں رایوں کو قبول کرنے کا رویہ انسان کی شخصیت میں ارتقاء کا سبب بنتا ہے، ایک تابع محض کے بجائے وہ ایک آزاد اور با اختیار شخصیت بن جاتا ہے، جس کی اپنی رائے اور اپنا فیصلہ ہوتا ہے، وہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنی دنیا و آخرت کے سلسلے میں فیصلے کرتا ہے اور ان فیصلوں کے انجام کی ذمہ داری قبول کرتا ہے، کیونکہ یہ فیصلے اس کے اوپر تھوپے نہیں جاتے بلکہ اس کے اپنے ہوتے ہیں۔ کسی انسان کو یہ اختیار نہیں ملنا چاہئے کہ وہ دوسرے انسان کی دنیا و آخرت کے بارے میں فیصلے کرے۔

بڑا فرق ہوتا ہے اس شخص میں جو دوسروں کی سننے اور دوسروں کے پیچھے چلنے کا عادی بن گیا ہو، اور اس میں جس کے سامنے اس کی اپنی زندگی کے اہم ترین امور کے سلسلے میں اللہ کی طرف سے دلائل پیش کئے جاتے ہوں جن سے مطمئن ہونے کے بعد ہی اس سے کسی فیصلے کا مطالبہ ہو۔ اللہ کی جانب سے انسان کی یہ بہت زبردست تکریم ہے، جسے قبول کرنے اور اس کا حق ادا کرنے کی صورت میں انسان کا رتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت میں زبردست ارتقاء ہوتا ہے۔

دلائل پر مبنی رویہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں جبر اور زبردستی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ جبکہ جو لوگ دلائل کے بغیر بات پیش کرتے ہیں انہیں جبر اور زبردستی، لالچ یا دوسرے غیر اخلاقی حیلوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کہ اس کے بغیر ان کا مقصد

پورا نہیں ہوسکتا ہے۔

امام فراہی کے الفاظ میں ''حق کے راستے کی رہنمائی غور وفکر کے دروازے سے ملتی ہے، جب انسان فکر ونظر کے استعمال کا ارادہ کر لیتا ہے اور محنت وکوشش کرتا ہے، تو اللہ ہدایت دیتا ہے۔ اس میں نبی اور مرشد کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو اسے صرف دلائل سناتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی طرف سے بھی کوئی جبر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو اسے ہدایت دیتا ہے جو ہدایت کا طالب اور اس کے لئے کوشاں ہو۔ اور اسی لئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے: (بلاشبہ اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں) اسی طرح فرمایا: (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط بات کے مقابلے میں واضح ہو چکی ہے)''۔

الهداية إلى الحق إنما يأتي من باب العقل و الفكر. فإذا أراد الإنسان استعمال النظر و الفكر و اجتهد أعطاه الله الهداية. وليس ههنا إلجاء من النبي و المرشد، فإنما هو يتلو عليه الدلائل، و كذلك لا إكراه من الله تعالىٰ، فإنما هو يعطي الهداية لمن اجتهد لها وطلبها. ولذلك قال تعالى: (إِنَّ اللّهَ لاَ يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئاً وَلَـكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ) (سورة يونس: ۴۴) و كذلك قال تعالى: (لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ) الآية. (سورة البقرة: ۲۵۶).(۱۷).

تیسرا انتظام: غور وفکر کی ترغیب:

تفکیری عمل انسان کا وجہ امتیاز ہے، تو تن آسانی انسان کی سرشت میں ہے، غور وفکر کے سلسلے میں تو وہ خاص طور سے بہت زیادہ تن آساں واقع ہوا ہے، اسی لئے قرآن کریم غور وفکر پر بہت زیادہ اور بار بار ابھارتا ہے، عقل سے کام لینے والوں کو سراہتا ہے، اور عقل پر تالے لگانے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ قرآن مجید کا قاری اس کا بخوبی مشاہدہ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ کثرت سے ہے مختلف مقامات پر اور مختلف انداز سے ہے۔

عقاد کے الفاظ میں ''ہمیں یہ بات بار بار تازہ کرنا چاہئے، کہ قرآن مجید میں عقل کی ستائش یونہی نہیں آئی ہے، اور اس کی بار بار تکرار بلاوجہ نہیں ہے۔ بلکہ عقل کی یہ سراہنا

ایک متوقع امر تھا، دین کا مغز اور اس کا جوہر اسی کا تقاضا کرتا ہے، جو اس دین کی حقیقت سے واقف ہوگا اور اس انسان کی حقیقت سے واقف ہوگا جو اس دین کا مخاطب ہے اسے اسی کی توقع ہوگی۔"

"والذی ینبغی أن نثوب إلیه مرة بعد مرة أن التنویه بالعقل علی اختلاف خصائصه لم یأت فی القرآن عرضا، ولا تردد فیه کثیرا من قبیل التکرار المعاد. بل کان هذا التنویه بالعقل نتیجة منتظرة یستلزمها لباب الدین و جوهره و یترقبها من هذا الدین کل من عرف کنهه و عرف کنه الإنسان فی تقدیره."(۱۸).

حسی معجزات کے بجائے دلائل اور نشانیوں پر زور:

اسی سیاق میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید حسی اور ظاہری معجزات کے بجائے جہاں غور وفکر کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی ہے، کائنات اور انفس کی نشانیوں اور دلائل پر غور وفکر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں، وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے"۔(۱۹)

"اسلام نے نبوت کی تصدیق کے باب میں ظاہری اور مادی معجزات کو وہ اہمیت نہیں دی ہے، جو خصوصیت کے ساتھ عیسائی مذہب اور اس کے مقدس صحیفہ میں نظر آتی ہے، بلکہ وہ انسانوں کو زیادہ تر غور وفکر، فہم وتدبر، سوچ اور سمجھ کی دعوت دیتا ہے اور نبوت کی اندرونی خصوصیات اور روحانی دلائل کو ایمان وتصدیق کی بنیاد قرار دیتا ہے۔"(۲۰)

عقاد لکھتے ہیں: "اسلام ان معجزات کا دین ہے کہ عقل جدھر دیکھے اسے نظر آ جائیں، ان معجزات کا دین نہیں ہے جو عقل کی نگاہ پر پردہ بن جائیں، اور زبردستی لاجواب کر کے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کریں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ معجزے دو طرح کے ہوتے ہیں اور یہ جاننا اس لئے ضروری ہے تاکہ ہم وہ معجزہ طلب کریں جسے طلب کرنا درست ہو اور

اس معجزہ کی طلب سے پرہیز کریں جو کسی عاقل کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ وہ معجزہ جس کا روئے خطاب عقل کی طرف ہوتا ہے وہ تو ہر طرف موجود ہے جو اس کا طالب ہوگا وہ جدھر نظر ڈالے گا اسے پالے گا۔ لیکن یہ وہ معجزہ نہیں ہے جو غور وفکر سے مطمئن نہیں ہونے والے کو منوانے کے لئے ہوتا ہے، دراصل جو اپنے غور وفکر سے مطمئن نہیں ہو پاتا اسے معجزہ بھی کبھی گمراہی سے نہیں نکالتا ہے۔ اسلام ایک متوازن دین ہے وہ فہم کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے، اور تمام امور میں ایک توازن رکھتا ہے۔ وہ تو ہر پہلو سے معجزات کا دین ہے۔ لیکن وہ اس معجزہ کا دین نہیں ہے جو عقل کو لا جواب تو کر دے لیکن مطمئن نہیں کرے، کیونکہ وہ عقل کا دین ہے اور اس دین میں غور وفکر کرنا ایک فریضہ ہے۔''

والإسلام دين المعجزات التي يراها العقل حيثما نظر، وليس بدين المعجزات التي تكف العقل عن الرؤية و تضطره بالإفحام القاهر إلى التسليم. و علينا أن ندرك ان المعجزة معجز تان كي نطلب المعجزة التي ينبغي أن تطلب، و نتو رع عن طلب المعجزة التي لاتجدي أحدا من العقلاء. فالمعجزة التي تتجه إلى العقل موجودة يلتقي بها من يريدها حيثما التفت إليها، ولكنها غير المعجزة التي تقنع من لا يقتنع بتفكيره، ومن لم يقتنع بتفكيره فلن تهديه المعجزة من ضلال...... والإسلام دين متناسق مستجيب للفهم و للموازنة بين الأمور، فهو دين المعجزات في كل شئ، ولكنه ليس بدين المعجزة التي تفحم العقل و لا تقنعه، لأنه دين العقل...... والتفكير فريضة فيه.(۲۱)

چوتھا انتظام: غور وفکر اور استدلال کے بہترین اصولوں کی جانب رہنمائی:

امام فراہی نے یہ بات بھرپور اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہی ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف عقلی دلائل بہت کثیر تعداد میں ہیں، بلکہ غور وفکر اور استدلال کے اصول بھی ہیں جو فکر واستدلال کے معروف اصولوں سے مختلف ہیں۔

''میں قرآن میں غور وفکر اور استدلال کے وہ اصول پاتا تھا، جو یونانیوں کی منطق

کے اصولوں کے مقابلے میں عقل سے قریب تر ہیں اور دل میں زیادہ جاگزیں ہو جانے والے ہیں، اور وہ دلائل پاتا تھا جو فلاسفہ اور متکلمین کے دلائل سے زیادہ صحیح اور پختہ ہیں، اور تعجب کرتا تھا ان پر جو انہیں دیکھ نہیں پاتے۔"

"وكنت أجد في القرآن اصولا للاستدلال و النظر أقرب إلى العقل و أرسخ في القلب من أصول منطق اليونانيين، و دلائل أصح و أثبت من أدلة الفلاسفة و المتكلمين، و أتعجب ممن يتغافل عنها."(۲۲)

گو کہ حجج القرآن کے عنوان سے ان اصولوں کی تدوین کا عظیم منصوبہ تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ لیکن کچھ زریں اصولوں تک رسائی کا سامان ضرور ہو سکا۔ قرآن مجید پر گہرا غور وفکر کرنے والوں کے لئے یہ ایک بڑا میدان ہے۔

جن اصولوں کی جانب امام فراہی نے رہنمائی کی ہے ان میں سب سے نمایاں اصول یہ ہے کہ دلیل کی بنا اس یقین پر رکھی جائے جو انسان کی فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے اور جس کے ثبوت کے لئے یہی کافی ہوتا ہے کہ وہ فطرت میں موجود ہے۔

امام فراہی لکھتے ہیں: قرآن مجید نے دلیل کی بنیاد اس ضروری فطری یقین پر رکھی ہے جس کا انکار عقل کر نہیں سکتی ہے، یہی یقین عقل کے تمام علوم اعمال فکر اور استدلال کا سرچشمہ ہے۔ یہ نفس انسانی کی فطرت کی گہرائی میں رکھا گیا ہے، اور اسی طرح پوشیدہ ہوتا ہے جیسے چھلکوں کے پیچھے مغز اور پردوں کے پیچھے روح ہوتی ہے، لیکن نہریں اسی سے نکلتی ہے.

ـــ"القرآن جعل بناء الحجة على اليقين الضرورى الفطرى الذى لايسع العقل أن يعصيه ،وهو ينبوع جميع علومه و أعماله ونظره واستدلاله ،وهو مودع فى غور فطرةالنفس مكنون كاللب وراء القشور والروح وراء الستور .ولكن يجرى منه الجداول "(۲۳).

"ایک الٰہ پر ایمان جو رحیم ہے خلق علم قدرت تصرف رحمت اور حکمت سے ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ محض آثار سے استدلال کے راستے بے حد مشکل ہے۔ لیکن وہ بہت محکم اور واضح ہوتا ہے اگر نفس انسانی کی فطرت میں غور کیا جائے، اس پہلو سے کہ اس کی فطرت میں وہ علم ہے جو ایک رحیم قادر اور حکیم الٰہ واحد پر یقین کرنے پر مرتکز ہے"

"فالایمان بالله واحد رحيم أحاط بكل شئ خلقا وعلما وقدرة وتصرفا ورحمة وحكمة في غاية الصعوبة من جهة الاستدلال بمحض الآثار، ولكنه في غاية الاحكام والوضوح من جهة النظر في فطرة النفس مما جبلت عليه من العلم المركوز على الايقان بالله واحد رحيم قادر حكيم"(۲۴).

"ہمارا اللہ پر ایمان محض استدلال کے راستے سے نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ یہی ایمان ہر علم اور دلیل کی صحت کی بنیاد ہے"

"فايماننا بالله ليس بمحض الاستدلال، بل لكونه بناء لصحة كل دليل وعلم"(۲۵).

پانچواں انتظام: لطیف عقلی دلائل کا کثرت سے ذکر:

قرآن مجید دلیل و برہان کی کتاب ہے، اس میں دلائل بہت زیادہ ہیں، یہ عقل اور دل دونوں کو ساتھ مخاطب کرتے ہیں، دلائل کی بنا اس یقین پر ہوتی ہے جو نفس انسانی میں پوشیدہ موجود ہے، تاہم یہ دلائل اس تفصیل اور وضاحت سے نہیں ہوتے جس کا مشاہدہ ہم دوسرے کلاموں میں کرتے ہیں، یہ اس ترتیب اور ہیئت میں بھی نہیں ہوتے جس کے ہم عادی ہیں، بلکہ یہ بہت ہی لطیف پیرائے میں ہوتے ہیں، خواب غفلت میں پڑے ہوئے یا غور وفکر کے معاملے میں تن آسانی میں گرفتار ان کا ادراک نہیں کر سکتے، ان کا ادراک کرنے کے لئے عقل کو فعال بنانا ضروری ہوتا ہے، یہ معمہ بھی نہیں ہوتے کہ عقل کو حیرانی اور بے بسی کا شکار کر دیں، بلکہ یہ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ان پر جس قدر غور کرے محکم دلائل اور روشن حکمتوں کی قطار نظر آتی جائے۔ اس طرح ہر دلیل کی قوت چونکہ غور وفکر کے بعد سمجھ میں آتی ہے اس لئے وہ متاع مستعار کے بجائے اپنی دریافت محسوس ہوتی ہے، اور ہر دلیل کے پانے پر ایسی خوشی ہوتی ہے کہ گویا وہ دلیل اس کی اپنی متاع گم شدہ تھی۔

امام فراہی کے الفاظ میں "قرآن کے عظیم تر اہداف میں عقلوں کی نشو ونما اور حکمت کی تعلیم بھی ہے، جیسا کہ بہت سارے مقامات پر اس کی صراحت ہے اور خاص اسی وجہ سے لطیف دلائل کو کثرت سے بیان کیا گیا ہے تا کہ لوگ غور وفکر کرنا اور استنباط کرنا

سیکھیں۔اور اسی لئے قرآن بہت دفعہ صرف دلائل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان کا استنباط کرنے پر ابھارتا ہے، بلکہ کبھی تو وہ صرف ان فطری اصولوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن پر استدلال کی بنا رکھی جاتی ہے.....قرآن کی اس گہرائی اور لطافت بیانی کی وجہ سے اس کے بہت سارے دلائل ان سے مخفی رہے، جو قرآن کو ایک عام خطاب کی نظر سے دیکھتے تھے“۔

”من اعظم غاية القرآن تربية العقول و تعليم الحكمة كما صرح به في مواضع كثيرة ،فلذلك خاصة أكثر من لطائف الأدلة ليتعلموا التفكر والاستنباط .ولذلك كثيراًما يكتفي بالتنبيه على الدلائل والحث على استنباطها ،بل قد ينبه على الأصول الفطرية التي يبنى عليها الاستدلال كما هو مبسوط في موضعه .فلما كان القرآن على هذه الصفة من الغور و اللطافة خفي كثير من دلائله على من يتوهمه خطاباعاميا“(۲۶)۔

”اگر قرآن ہر دلیل کو حد درجہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتا تو دماغوں کی تربیت نہیں ہوتی، بلکہ فہم وفکر انفعال زدہ ہو جاتے، جیسا کہ بعض طالب علموں کو دیکھتے ہو کہ انہیں جو بتایا جاتا ہے وہ یاد کر لیتے ہیں،ان کی ساری تگ وتاز یاد کر لینے تک محدود رہتی ہے۔“

فلو فصل القرآن كل دليل بغاية البسط لم يكن تربية للعقول بل صارت الأفهام منفعله ،كما ترى بعض الطلاب يحفظون ما لقنوا،وقصارى عملهم الحفظ۔(۲۷)

”اللہ نے اپنے رسول کو حکمت کا بہترین معلم بنا کر بھیجا،اور اس طرح کہ تعلیم کو تربیت کا جزء بنا دیا......اس نے محدود علم دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ عقل کی بصیرت کو جلا بخشی اور اسے اس کے اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کے لئے تیار کیا،اور اس کے لئے ضروری تھا کہ عقل کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ فکر ونظر کے اصولوں سے آگاہ ہو۔اور علم کے باب میں حق یقین اور اخلاق کے باب میں طہارت کامل حاصل کرے۔اور یہ سب تعلیم حکمت میں شامل ہے۔“

فبعث الله تعالى رسوله أحسن معلم للحكمة ،وذلك بأنه جعل التعليم جزءا من التربية كما قدمناه .فلم يكتف باعطاء العلم المحدود بل جلى بصيرة العقل وهيأه للرقي الى أعلى منازله. ولا يكون ذلك الا

بأن نبهه ليطلع على أصول الفكر والنظر، وليقتني الحق اليقين علما والطهارة التامة خلقا، وكل ذلك من باب تعليم الحكمة"(۲۸).

''خلاصہ یہ کہ قرآن کے بیشتر دلائل نگاہ کو متوجہ کردینے والی چمک اور فکر کو بیدار کردینے والی گرج کی طرح ہیں''

''وبالجملة فأكثر دلائل القرآن انماهي لوامع تجلب النظر، وقوارع تنبه الفكر. وكان المخاطبون أذكياء فصحاء أهرع الناس الى لطائف المعاني وأشدهم تهذيباً لفضول الكلام. فلو فصل لهم الدلائل المرتبة على طريق المنطق لأبعدهم عن نهج الفطرة في الفكر''(۲۹)۔

''قرآن کا طریقہ استدلال کلام کی بلاغت اور فطرت کی راہ سے قریب تر ہے، قرآن عقل اور دل کو ایک ساتھ مخاطب کرتا ہے، دلائل انی کو دلائل لمی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے، دلائل میں ترغیب وترہیب کی آمیزش کرتا ہے، اس طرح ایک طرف عقل کو نیند سے بیدار کرتا ہے تو دوسری طرف دل کو غفلت سے ہوشیار کرتا ہے''۔

"هو اقرب الى بلاغة القول وطريق الفطرة، فانه يخاطب العقل والقلب معا ويركب الأدلة الإنية مع اللمية ويخلط بالدلائل ترغيبا وترهيبا، فكماينبه العقول من رقدته فكذلك يحث القلوب من غفلته" (۳۰)

عقل کے استعمال کی راہ میں رکاوٹیں اور ان کا علاج:

جس طرح حواس کا استعمال انسان کی فطرت میں ہے، اسی طرح عقل کا استعمال بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اس کے باوجود امر واقعہ یہ ہے کہ انسان عقل کے استعمال میں بہت کوتاہ ثابت ہوا ہے۔ وسیع وعظیم کائنات کے مقابلے میں اس چھوٹی سی دنیا میں تو وہ بزعم خود بڑی بڑی فتوحات کرتا ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر وہ صرف بھٹکتا اور گمراہ ہوتا ہے۔

امام فراہی لکھتے ہیں: لوگ ریاضیات اور ہندسہ اور بہت سارے طبعی علوم میں کامیاب کوشش کرتے ہیں، تاہم الہیات میں وہ گمراہ ہوجاتے ہیں، بھٹکتے ہیں، اور بے بنیاد گمانوں پر تکیہ کرتے ہیں، یہ صورت حال اس پر دلیل ہے کہ نبوت ضروری ہے۔ (اللہ جسے

روشنی نہیں دے اس کے پاس روشنی نہیں رہتی)۔اگر ذہین ترین لوگ کسی ایک امر میں حماقت کا ارتکاب کریں تو یہ ماننا چاہیے کہ اس امر کے سلسلے میں عقلیں خود کفیل نہ ہو کر تابع ہوتی ہوں گی۔ دیکھو نگاہ کی اپنی روشنی نہیں ہوتی، وہ تو اس نور سے دیکھتی ہے کہ جو اس کے پاس آتا ہے تو وہ خوش ہو اٹھتی ہے اور اسے گلے لگاتی ہے۔اور جس نے آنے والے نور سے چشم پوشی کی اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور خود کو تاریکی میں ڈال دیا۔تو یہی عقل کا معاملہ ہے، نور کو قبول کرنا اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے، وہ جب اسے پاتی ہے تو اطمینان محسوس کرتی ہے اور اس کی جستجو میں رہتی ہے، لیکن حق کو قبول کرنے سے جب وہ انکار کرتی ہے تو اس سے اس کا نور چھین لیا جاتا ہے"۔

"نجاح سعيهم في الرياضيات و الهندسة و كثير من الطبيعات. ثم ضلالتهم في الالهيات وتهافتهم واعتمادهم على الظنون الواهية دليل على ضرورة النبوة: (وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُوراً فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ) (سورة النور: ۴۰) فان أذكى الناس اذا تحمقوا في امر فلا بد أن ذلك الامر لا تستقل به العقول وانما تكون فيه تابعة. ألا ترى البصر لا يستقل بنوره بل يستبصر بالنور الذي يأتيه فيفرح به ويقبله. فمن أغمض عينه عن النور الذي يدخل عليه ظلم نفسه وألقاها في الظلمة. فلذلك شأن العقل فطر لقبول النور فيطمئن به اذا وجد ويطلبه، ولكن غروره عن قبول الحق يسلب نوره (۳۱)".

عقل کے سلسلے میں انسان کی کوتاہی کے مختلف درجات اور مختلف اسباب ہیں، قرآن مجید ان اسباب کا تذکرہ کرتا ہے اور ان کا علاج بھی تجویز کرتا ہے۔

ظاہر و محسوس میں انہماک:

عقل کا کام ظاہر و محسوس مظاہر زندگی سے آگے بڑھ کر انفس و آفاق کی عظیم ترین نشانیوں پر غور کرنا ہے، لیکن جو ظاہر و محسوس کو سب کچھ سمجھ کر اسی میں منہمک ہو جاتے ہیں اور اس انہماک سے باہر نکل کر غور و فکر کی مشقت برداشت نہیں کرتے، ان کو وہی ملتا ہے جو وہ چاہتے ہیں۔قرآن مجید بار بار انسان کو جھنجھوڑتا ہے کہ وہ غفلت کی قید سے آزاد ہو کر غور و فکر کا

کام انجام دے۔

امام فراہی لکھتے ہیں: ''اس دنیا کی زندگی کے آگے کیا ہے اس سے غفلت زیادہ تر دماغوں پر طاری رہتی ہے، کیونکہ وہ اس ظاہر ومحسوس زندگی اور اس کے علوم میں منہمک ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، (آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے وہ اعراض کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں)''۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کے دلائل فطرت سے قریب ہوتے ہیں، بلکہ غور وفکر اور اس کے اصولوں پر ترغیب دینے والے ہوتے ہیں، تب بھی تم ایسے لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ غور وفکر نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے غور وفکر اور تدبر پر بہت ابھارا ہے، اللہ کا ارشاد ہے، (کیا وہ قرآن پر تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں) اس طرح کا تذکرہ بہت جگہ ہے۔ غفلت کہتے ہیں غور وفکر نہیں کرنے کو، اس طرح یہ عدمی سبب ہے، لیکن یہ پروان چڑھتی ہے ظاہر وحاضر میں انہماک کی وجہ سے، اور یوں عقل کی قوتوں کو بے کار کر دیتی ہے، اور ادراک کے کمروں کو اس طرح بند کرتی ہے، کہ انفس اور آفاق میں جو جلال وجمال اور حکمت ورحمت کے مظاہر ہیں، ان کے ادراک سے دماغ قاصر ہو جاتے ہیں، اور پھر انہیں صرف ظاہر ومحسوس نظر آتا ہے بالکل چوپایوں کی طرح، اللہ نے ارشاد فرمایا: (ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں ہیں، اور ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں ہیں، اور ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں ہیں، وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گمراہ ہیں، یہی لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں) ان لوگوں کے بارے مزید فرمایا (یہ دنیا کی زندگی کے ظاہر کو تو جانتے ہیں اور یہ آخرت کے سلسلے میں غفلت میں پڑے ہوئے ہیں) اور فرمایا: (اس سے تم اعراض کرو ایسے جو ہمارے ذکر سے منھ موڑے اور صرف دنیا کی زندگی کو مقصود بنائے، ان کے علم کی پہونچ بس اسی قدر ہے) اس طرح کے بیانات بھی بہت جگہ ہیں۔''

''لما كانت الغفلةعما هو فو ق هذه الحيا ة الد نيا غالبة على أكثر العقول لشدة انهماكهم فى مشاغل هذه المحسو سة الحاضرة وعلو مها كما قال تعالى :(وَكَأَيِّن مِّن آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ

عَنْهَا مُعْرِضُونَ)(سورۃیوسف /۱۰۵).فمع أن دلائل القرآن قریب من الفطر بل منبهة علی الفکر و أصول النظر تراهم لا یتفکرون ،ولذالک قد أکثر القرآن من الحث علی التدبر والتفکر مثلاً قوله تعالی :(أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا)(سورۃ محمد /۲۴).وهذا کثیر جداً.

والغفلةهی عدم النظر فهی سبب عدمی ولکنها انما نشأت من الانهماک فی الظاهر الحاضر،وهذا عطل قوی العقل وأغلق غرف الادراک لما هو المشهود فی الأنفس والافاق من مظاهر الجلال والجمال والحکمة والرحمة .فصاروا لا یرون الا الظاهر المحسوس کالبهائم کماقال تعالی:(لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَـٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَـٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ) (سورۃ اعراف /۱۷۹) .وقال تعالی فی هولاء :(يَعْلَمُونَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ)(سورۃالروم /۷).وقال تعالی:(فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّى عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا.ذَلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ) (سورۃ النجم /۲۹ .۳۰).وهذا کثیر جداً"۔

پستی پر قناعت اور خوب تر کی جستجو سے پہلوتہی:

جب انسان پستیوں کا دلدادہ اور حقیر منافع کا غلام ہو جاتا ہے تو اس کی عقل بھی پستیوں سے اوپر اٹھ کر دیکھنا اور دکھانا بند کر دیتی ہے۔پستیوں میں رہنے والے وحی الٰہی کی روشنی سے بھی محروم ہوتے ہیں ۔اوران کی عقل بھی ان کی رہنمائی سے قاصر ہوتی ہے۔ کیونکہ عقل بلندیوں کی دلدادہ ہوتی ہے،پستیوں میں رہنا اسے راس نہیں آتا ہے، بلکہ پستی کے ماحول میں وہ بیمار ہو جاتی ہے۔قرآن مجید عقل کو بیماری سے بچانے کی تلقین کرتا ہے۔

امام فراہی لکھتے ہیں:"عقل کی بیماری بدن کی بیماری سے زیادہ حیران کن نہیں ہے، دیکھتے نہیں کہ حواس بیمار پڑتے ہیں بلکہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور یکسر ختم ہو جاتے ہیں ،اگر یہ بات ہے تو کیا تعجب کہ عقل یا دل کو کوئی بیماری لگ جائے تو وہ بے ہوش ہو جائے

یا بے نور ہو جائے ۔انسان کی فطرت میں جو علم ودیعت کیا گیا ہے ضروری نہیں کہ سارے انسانوں پر واضح اور روشن ہو۔ بلکہ اس کے اونچے مقام کا تقاضا ہے کہ ان لوگوں کا ہاتھ اس تک پہونچے جو پستی میں جا کر حقیر چیزوں میں مصروف ہیں،اور سیکھنے کی انکساری اور فکر کی مشقت کو قبول کرنے سے ان کا تکبر مانع ہے۔ بلاشبہ پستی میں مصروف ہو جانا بلندی کی راہ کی رکاوٹ ہے،اور مشقت کرنے پر راضی نہ ہونے سے عظیم کارناموں کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں سارے لوگوں پر طاری ہو جاتی ہیں،سوائے اہل بصیرت کے اور وہ تو بہت کم ہوتے ہیں۔اسی لئے قرآن نفس کی بیماریوں کی طرف بہت زیادہ نشان دہی کرتا ہے خاص طور سے جن دو کا ہم نے ذکر کیا"۔

فان سقم العقل ليس من سقم البدن.الاترى الحواس تسقم بل تبطل وتتعدم. واذاكان ذلک كذلک فلا بدع ولا عجب أن يعترى العقل أو الفوادمرض فيغشى عليه بل يطفئ نوره فيعميه. فالعلم الذى أودع فى فطرةالانسان لايلزمه أن يكون ظاهرابيناعلى الناس كلهم ،بل لجلالةقدره هو أجدربأن لا يصل اليه أيدى المشتغلين بالدنى فى السافل ،المستكبرين عن خضوع التعلم و مشقةالنظر.فان الاشتغال بالأسفل يعوق عن المعالى ،وكذلک الاستكبار عن المشقةيمنع عن المكارم. وقد غلب هذان على الناس أجمعين الا أولى البصيرة و قليل ماهم. ولذلک قد أكثر القرآن من الدلالةعلى أدواء النفوس لا سيما هذين الذين ذكرنا۔(۳۳)

"دل ودماغ کی صحت مندی صورت استدلال کی صحت اور اشکال کی شرطوں کی رعایت سے زیادہ اہم ہے،جس طرح بینائی کی صحت آلہ بینائی کی صحت سے زیادہ اہم ہے۔منطق صرف دلائل کی صورت اوران کے اجزاء سے بحث کرتی ہے،لیکن ساری اہمیت تو دراصل سوچنے والے نفس کی،اس کی فکر کی اوراس کے علم وایقان کی بنا کی ہے"۔

صحة العقل والفوادأهم من صحة صورة الاستدلال ورعايةشروط الأشكال ،كماأن صحة النظر أهم من صحة المنظار.والمنطق انما يبحث عن صور الأدلة وأجزائها ،ولكن الأهمية

کل الأهمیةللنفس المفکرة وفکرتهاو بناء علمها و ایقانها"(۳۴)

ہوی پرستی اور اتباع ظن:

وحی الٰہی کا تعارض عقل سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ عقل اور وحی دونوں کا ٹکراو ہوی اور ظن سے ہوتا ہے۔اس لئے قرآن مجید جگہ جگہ ہوی اور ظن کی پیروی کے سلسلے میں خبر دار کرتا ہے، کہ جوان کی پیروی کرتا ہے وہ عقل کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

امام فراہی لکھتے ہیں ''مومن ہر معاملے میں عقل کی بات مانتا ہے، جبکہ کافر عقل کی بات صرف وہاں مانتا ہے جہاں وہ بات اس کی ہوی اور ظن کے مطابق ہو۔اللہ کا ارشاد ہے :وہ تو صرف ظن کی اتباع کرتے ہیں اور خواہش نفس کی بات مانتے ہیں، حالانکہ ان کے رب کے پاس سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے''

''اس دنیا تک محدود خواہش نفس انسان کو خیر کی بلندیوں کی طرف بڑھنے کے ارادوں سے باز رکھتی ہے، اس کے باطل گمان اس کے سامنے حجاب بن کر اسے خالص حق پر غور کرنے سے روک دیتے ہیں۔ میں نے حق اور تقوی کا ہوی اور ظن جیسا دشمن نہیں دیکھا، ظن باطل کو سنوار کر حق کی صورت میں پیش کرتا ہے۔تو ہوی شر کو خیر کی شیرینی میں لپیٹ دیتی ہے۔ یہ دونوں علم اور عمل کی راہ کی رکاوٹیں ہیں۔''

ان المومن یتبع العقل فی جمیع أحکامه و الکافر یتبعه فیما یو افق هواه و ظنه کماقال تعالی:(إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَى)(سورة النجم ۲۳).فیعشو عن هدیه.

وقد ضرب الله مثلا لهدیه و نوره و الذین یومنون ببعض ویکفرون ببعض،فقال:(أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ .يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ)(سوره البقره ۱۹:۲۰.۱)

فهوى النفس لهذه الحيا ة الدنيا يثبطها عن القصد الى أعلى الخير، وظنونها الباطلة تحجبها عن النظر فی محض الحق ولم أر کا لظن والهو ى عدواً للحق والتقو ى .فالظن يزين الباطل فی صورة الحق ،والهو ى يغطى الشر بحلاوة الخير .فهما عثرتان في طريقي العلم والعمل. وأخبر الله تعالى فی کتا به الحکيم عمن اتبع الظن وأقبل على الدنيا وأعرض عن أصل الخير ومحض الحق ،فقال عز من قائل :(وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئاً .فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّى عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا .ذَلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَى)(سورةالنجم ۲۸ . ۳۰).أى لا يطلبون العلم الذى يحتا ج اليه من يهمه الحيا ة العليا التى هی خير وأبقى "(۳۵)۔

خاتمہ

قرآن مجید کی آیتیں ایسا مومن تیار کرتی ہیں، جو پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ سارے انسانوں سے اپنے موقف کے درست ہونے پر گفتگو کر سکے، بین المذاہب ڈائیلاگ میں بے خطر شریک ہو اور دلائل کی معرکہ آرائی میں ہمیشہ فاتح وکامران رہے۔اس کے کسی رویہ سے یہ محسوس نہ ہو کہ وہ دلائل کی جنگ سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے، اور اپنی بات کسی لالچ اور ترغیب یا زبردستی اور ترہیب کے راستے منوانا چاہتا ہے، مومن کی اصل قوت اس کے دلائل ہوتے ہیں۔قرآن مجید میں ترغیب وترہیب بھی ہے، لیکن اس کا مقصد عقل کی آواز کو دبانا نہیں بلکہ عقل پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے کو چاک کرنا، اور دلائل سے بے خبر سوتے ہوئے انسان کو جھنجھوڑ کر جگا دینا ہے، کہ غور وفکر کے لئے بیداری شرط اولین ہے۔

قرآن مجید کا مومن کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کرتا جس سے ظاہر ہو کہ اسے معرکہ استدلال میں اپنے موقف کے شکست کھا جانے کا اندیشہ ہے، وہ اپنے موقف کی حفاظت کے لئے مرتد کی سزا ضرورت محسوس کرتا ہے، اور نہ دوسروں کی تبلیغی کوششوں پر پابندی کی

ضرورت۔ وہ مذہب کی تبدیلی اور مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں آزادی کا سب سے آگے بڑھ کر مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ مکمل آزادی کے ماحول میں اسے اپنے موقف کی برتری اور دلائل کی قوت دکھانے کا پورا موقعہ ملتا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ تبلیغ کی اس آزادی اور اس گفتگو کے اس موقعہ سے اس سے زیادہ فائدہ کوئی اور نہیں اٹھا سکتا۔ لالچ اور خوف کے راستے مذہب کی تبلیغ اور تبدیلی پر پابندی کی تجویز کا سب سے بڑا حامی اور موید وہ ہوتا ہے کیونکہ اپنے موقف کے دلائل کی قوت پر سب سے زیادہ اعتماد اور یقین اسی کو ہوتا ہے۔

بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کی طرف صحیح معنی میں رجوع ہوگا تو عقل و دانش میں اضافہ ہوگا، بصیرت و دانائی پروان چڑھے گی اور ہر دو زندگیوں میں ترقی اور کامیابی کی راہیں دریافت کرنا آسان ہو جائے گا۔

امام فراہی کے نزدیک کامیابی کی تین شرطیں ہیں، عقل، علم اور عمل صالح۔

”بلاشبہ نجات ممکن نہیں مگر عقل سے کہ وہ تو رفیق اعلی ہے، علم سے کہ وہ تو عروۃ الوثقی ہے، اور عمل صالح سے کہ وہ تو عظیم تر سعادت کا بہترین راستہ ہے“

”لا شک أن لا نجاۃ الا بالعقل فھو الرفیق الأعلی ،وبالعلم وھو العروۃ الو ثقی ،وبا لعمل الصالح وھو الطریق المثلی الی السعادۃ الکبری “(۳٦)۔

حواشی

۱۔ حجج القرآن ۱۷۵

۲۔ حجج القرآن ۱۸۴

۳۔ حجج القرآن للامام عبدالحمید الفراہی، الناشر: الدائرۃ الحمیدیہ، ۱۹، ۲۰

۴۔ حجج القرآن ۲۲٦

۵۔ حجج القرآن ۱۷۵

٦۔ التفکیر فریضۃ اسلامیۃ لعباس محمود العقاد ص ۱۔

۷- درء تعارض العقل والنقل لشیخ الاسلام ابن تیمیہ، الناشر دار الکتب العلمیۃ۔ (۱/۱۴۷)

۸- حجج القرآن ۲۲۹

۹- حجج القرآن ۱۷۴

۱۰- حجج القرآن ۱۹۷

۱۱- حجج القرآن ۲۸۸

۱۲- حجج القرآن ۲۳۳

۱۳- حجج القرآن ۱۸۳

۱۴- حجج القرآن ۱۸۵

۱۵- حجج القرآن ۱۳۱

۱۶- حجج القرآن ۱۳۱-۱۳۲

۱۷- حجج القرآن ۲۲۱

۱۸- التفکیر فریضۃ الاسلامیۃ ص ۱۲

۱۹- سیرۃ النبی ۳/۱۸۱

۲۰- سیرۃ النبی ۳/۳۴۲

۲۱- التفکیر فریضۃ اسلامیۃ ص ۸۰

۲۲- حجج القرآن ۲۱

۲۳- حجج القرآن ۹۳

۲۴- حجج القرآن ۱۱۴

۲۵- حجج القرآن ۱۲۰

۲۶- حجج القرآن ۲۷

۲۷- حجج القرآن ۱۳۱-۱۳۲

۲۸- حج القرآن ۱۳۱-۱۳۲

۲۹- حج القرآن ۱۹۵

۳۰- حج القرآن ۱۳۸

۳۱- حج القرآن ۱۲۷

۳۲- حج القرآن ۲۵-۲۶

۳۳- حج القرآن ۱۰۱-۱۰۲

۳۴- حج القرآن ۱۰۱-۱۰۲

۳۵- حج القرآن ۱۸۵

۳۶- حج القرآن ۱۷۵

فہرست محتویات

رجوع إلی القرآن - اہمیت اور تقاضے

جلد اول

کلیدی مباحث

تعارف قرآن

رجوع إلی القرآن

تعلیم و تعلم

وسائل فہم قرآن

عصر حاضر میں قرآن کی رہنمائی

مطبوعات ادارہ علوم القرآن

اسمائے کتب	صفحات	قیمت
حقیقت نماز - مولانا امین احسن اصلاحی (تخریج وتحقیق: مولانا سلطان احمد اصلاحی)	۶۰	۱۰
کتابیات فراہی - ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	۸۰	۱۰
مولانا امین احسن اصلاحی نمبر (مجلّہ علوم القرآن کی خصوصی اشاعت) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۶۰۰	۲۰۰
قرآنی علوم بیسویں صدی میں (مجلّہ علوم القرآن کی خصوصی اشاعت) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۵۴۲	۲۰۰
عصر حاضر کے مسائل اور قرآنی تعلیمات (مجلّہ علوم القرآن کی خصوصی اشاعت) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۳۷۶	۲۰۰
خاندانی نظام اور قرآنی تعلیمات (مجموعہ مقالات سیمینار) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی	۳۹۴	۲۵۰
قرآنی افکار وتعلیمات اور موجودہ دور میں ان کی معنویت پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۱۶۰	۱۰۰
اشاریہ ششماہی علوم القرآن پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۵۶	۲۰
معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات (مجموعہ مقالات سیمینار) مرتبہ ڈاکٹر اوصاف احمد، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۲۵۶	۱۶۰
Economic Problems and the Teaching of the Quran By Dr. Abdul Azeem Islahi & Dr. Ausaf Ahmad	۱۶۰	۱۵۰
اردو رسائل کے قرآنی مضامین کا اشاریہ	۲۵۰	۱۵۰
قرآنی مقالات مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۳۳۶	۲۵۰
رجوع الی القرآن - اہمیت اور تقاضے	۵۲۸	۳۰۰

Idarah Ulum Al-Qur'an
P.O. Box-99, Shibli Bagh, Aligarh-202002 (U.P.)

ISBN:978-81-927666-2-1

Rs. 275/-